زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش لاہور

غزل نمبر

(ترمیم و اضافہ کے ساتھ)

فروری ۱۹۶۰ء

مرتبہ
محمد طفیل

طبع ثالث

ادارۂ فروغ اردو، لاہور

ترتیب

اساتذۂ غزل

اساتذۂ غزل (۲)

غزل قدیم

متغزلین جدید (۲)

غزل جدید

مینائے غزل

اختتامیہ

حصّۂ نثر

اُردو غزل اور متغزلین
(صنفِ غزل کے بارے میں نقادانِ فن کا اظہارِ خیال)

(۲)
(تذکرہ نویسوں کی آراء ممتاز شعراء کے بارے میں)

محمد طفیل پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے نقوش پریس اردو بازار لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا

طلوع

شعروں کے انتخاب کا معاملہ ہو یا غزلوں کے انتخاب کا معاملہ، اس کا معیار ہمیشہ ذاتی پسند رہا ہے
یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی کے انتخاب سے شعر بہ شعر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ شعری انتخابات کے سلسلے میں بعض نقادوں
نے ہماری رہنمائی بھی کی اور بعضوں نے ہمیں گمراہ بھی کیا۔ یہ گمراہی اور یہ رہنمائی صرف ذاتی پسند کی بدولت
ہوئی۔ جب مولانا نیاز فتح پوری مومنؔ کو غالبؔ سے بڑا شاعر مانتے ہیں تو ہمیں ان کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے
وہ بہ خلوص تمام ایسا ہی سمجھتے بھی ہوں گے۔ یہ ذکر تو الگ رہا کہ مومنؔ غالبؔ سے بڑا شاعر تھا یا غالبؔ مومنؔ سے، کلیم الدین احمد نے
تو اس صنفِ سخن ہی کو نیم وحشی قرار دے دیا۔۔۔ ہم ایسے تمام جھگڑوں سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں۔ ہمیں
تو نقادوں سے صرف اتنی شکایت ہے کہ ان میں سے بیشتر لکیر کے فقیر بننے میں پوری سعادت مندی کا ثبوت
دیتے رہے ہیں۔ یہی سبب ہوا کہ جو بعض اچھا کہنے والے مر گئے تو بس مر ہی گئے۔ حالانکہ ژرف نگاہ نقاد کے
پاس مسیحائی کی پوری پوری صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ وہ اگر چاہے تو مرے ہوئے اچھے شاعروں کو زندہ کر سکتا ہے
ہم میں سے بعضوں کو اتنا بھی علم نہیں ہے کہ یہ غزل ؎

کبھی یک بیک جو ہوا الٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں میرا غم سے سینہ فگار ہے

ظفرؔ کی نہیں ہے بلکہ ایک اُمّی شاعر حامیؔ کی ہے۔ ہم میرؔ و غالبؔ کو جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ
بعض شاعر ایسے بھی تھے جنھوں نے ایسے ایسے شعر بھی کہے ہیں:۔

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
(آصفؔ)

میں نے آنکھوں سے لے لیا اس کو
پھول جو دستِ باغباں سے گرا
(میر ستمن خلیقؔ)

آیا جو میکشی کو چمن میں وہ بادہ نوش
ہر اک گل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا
(میر امانی اسدؔ)

اس نمبر میں جتنے بڑے بڑے شعرا ہیں ان کی غزلوں پر بیشک جھوم جھوم جائیے۔ لیکن ان شعراء کو ضرور پڑھئے جن کی ایک ایک یا دو دو غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ افسوس کہ اتنے مختصر وقت میں ہمیں ایسے شعرا کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ ورنہ ہم اپنی تمام تر توجہ اس حصّہ پر صرف کر دیتے۔ ضرورت ہے کہ کوئی ان زندہ رہنے والے گمنام شاعروں پر کام کرے۔ جب مجھ ایسا شعر دشمن بھی اس کام کی افادیت سے منکر نہیں ہو سکا تو اُردو شاعری پر کام کرنے والے کیوں خاموش ہیں؟

ہم نے اس نمبر کی ترتیب میں کن کن امور کا خیال رکھا، اور کیسے کیسے صبر آزما مراحل سے گذرے اور کون کون سے تذکروں سے استفادہ کیا، اس کی کہانی کافی لمبی ہے۔ ہم یہاں صرف ایک امر کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے زیادہ سے زیادہ موجودہ دَور کے شعراء کی فنی صلاحیتوں کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس دھن میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ غزل ہی پیچھے رہ گئی۔ بعض شاعروں کو ہم اس نمبر میں شامل بھی کرنا چاہتے تھے، لیکن وقت کی کوتاہی کے باعث ہماری دسترس ان کے کلام تک نہ ہو سکی اس لیے بادلِ نخواستہ انھیں چھوڑنا پڑا ——— نہ جانے ہم اتنی احتیاطوں کے باوجود کہاں تک کامیاب ہوئے؟

اس نمبر میں بعض شعرا کی دس غزلیں بھی ہیں، چھ بھی، دو بھی اور ایک بھی ——— اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ ایک غزل والا شاعر ہر حال میں چھ غزلوں والے شعرا سے کمتر کہنے والا ہے۔ بلکہ بعض مجبوریاں ایسی تھیں جن کی بنا پر ایسا کرنا پڑا ——— ویسے ہماری کوشش یہ ہے کہ متقدمین اور متوسطین میں سے ولیؔ، میرؔ، سوداؔ، دردؔ ایسے درجہ اوّل کے شعرا کے ساتھ دورِ متاخرین کے درجہ اوّل کے شعرا اقبالؔ، حسرتؔ، حفیظؔ اور فراقؔ تک کو ایک ساتھ جگہ ملے تاکہ ان کا شعری مرتبہ پہچاننے کے ساتھ ساتھ اُردو غزل کی ارتقائی منزلوں کا بھی سراغ مل سکے۔ اس طرح ہم نے درجہ دوم اور سوم کے مرتبہ کے شعر کو ایک ساتھ لانا چاہا۔ یہاں یہ اعتراف کر لیا جائے تو بہتر ہو گا کہ پرانے شعرا سے اس حد بندی میں ہم سے ضرور زیادتی ہوئی ہے (یہ ایک مجبوری تھی اس لیے کہ باوجود انتہائی کوشش کے بعض اہم شعرا کے ہمیں دواوین ہی نہیں ملے) لیکن حتی الامکان موجودہ شعرا کے ساتھ پورے دیانتدارانہ خلوص سے کام لیا گیا ہے۔

اس شمارہ کا سرورق عبدالرحمٰن چغتائی کی فنکارانہ صلاحیتوں کی ایک تابندہ مثال ہے جس کے لیے ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

اگر اس نمبر کے سلسلہ میں حبیب اشعر، ملک اسلم، کیپٹن احسن کلیم، محمد عبداللہ قریشی اور ڈاکٹر وحید قریشی نے میری بھرپور اعانت نہ کی ہوتی تو یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہ تھا۔

محمد طفیل

۱۰ / مئی ۱۹۵۳ء

(۲)

کچی عمر کی بات ہے کہ جب مجھے معاملاتِ حسن و عشق کا کچھ بھی پتہ نہ تھا (پتہ تو خیر اب بھی نہیں ہے) میں نے ایک بڑی خوبصورت کاپی خریدی تھی اور اس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا ؎

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بعد کے صفحات میں، وہ تمام اشعار لکھے تھے۔ جو مجھے کسی نہ کسی وجہ سے پسند آ گئے تھے۔ بچپنے کی علت نے "بڑھاپے" میں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور سنہ ۱۹۵۴ء میں، میں نے غزل نمبر کے نام سے نقوش کا ایک نمبر شائع کر دیا۔ جو خلافِ امید اتنا مقبول ہوا کہ میں "حیران" رہ گیا تھا ——— معلوم ہوا۔ ابھی میری طرح کے صاحبانِ دل موجود ہیں ——— جی بہت خوش ہوا۔

سنہ ۱۹۵۶ء میں جب میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اسے اور "معتبر" بنانے کے لیے غزل سے متعلق، اچھا کار آمد قسم کا، نثر کا حصہ بھی شامل کر دیا اور ساتھ ہی جو جو کلام کے شعرا پہلے ایڈیشن میں رہ گئے تھے۔ انہیں بھی ڈھونڈ نکالا۔ پہلے شمارہ کی ضخامت ۴۸۰ صفحات تھی۔ دوسرے ایڈیشن کی نوبت ۶۵۰ صفحات تک پہنچی۔ موجودہ ایڈیشن کی ضخامت ۷۵۲ صفحات ہے (پہلے ایڈیشن میں ۲۱۸ شعرا کا کلام درج تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں ۲۶۶ شعرا کا اور موجودہ ایڈیشن میں ۴۷۰ شعرا کا کلام پیش کیا جا رہا ہے) غرض میں نے جس کام کو پہلے پہل ہنسی مذاق میں کیا تھا۔ اُسے اب پوری توجہ اور سنجیدگی سے نبھانا پڑا۔ میرے ذہنی ترازو کے مطابق، اب تو یہ نمبر ایک کار آمد قسم کا تذکرہ۔ اور بے شمار دوستوں کے دل کی دھڑکن بن جائے گا۔

میں نے اس نمبر کی ترتیب پھر بدل دی ہے۔ جو میرے نزدیک پہلے ایڈیشنوں سے بہر حال بہتر ہے ممکن ہے اب بھی، بعض پرانی روش کے دوستوں کو، یہ ترتیب بھی پسند نہ آئے۔ مگر میں کیا کروں۔ ذہنی فاصلے ہوتے ہوتے ہی کم ہوں گے ——— اور پھر میری دشواریاں، اسے کون جانے!

بچپن میں جو شعر اپنی کاپی کے پہلے صفحے پر لکھا تھا ——— اس کی صداقت آج معلوم ہوئی!

محمد طفیل

۱۵ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

اساتذۂ غزل

ولی دکنی

○

یاد کرنا ہر گھڑی اُس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

عاقبت کیا ہووے گا معلوم نئیں
دل ہوا ہے مبتلا دیدار کا

کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر
حرف حرف اُس مخزنِ اسرار کا

گر ہوا ہے طالبِ آزادگی
بند مت ہو سبحہ و زنار کا

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سری جن پر نثار
مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

○

میں تجھے آیا ہوں ایماں بوجھ کر
باعثِ جمعیتِ جاں بوجھ کر

بلبلِ شیراز کوں کرتا ہوں یاد
حسن کوں تیرے گلستاں بوجھ کر

دل چلا ہے عشق کا ہو جوہری
لب ترے لعلِ بدخشاں بوجھ کر

ہر نگہ کرتی ہے نظارے کی مشق
خط کو تیرے خطِ ریحاں بوجھ کر

اے سجن آیا ہوں ہو بے اختیار
تجھ کوں اپنا راحتِ جاں بوجھ کر

زلف تیری کیوں نہ کھاوے پیچ و تاب
حال مجھ دل کا پریشاں بوجھ کر

رحم کر اُس پر کہ آیا ہے ولی
درد دل کا تجھ کوں درماں بوجھ کر

○

فدائے دلبرِ رنگیں ادا ہوں
شہیدِ شاہدِ گل گوں قبا ہوں

ہر اک مہ رو کے ملنے کا نہیں ذوق
سخن کے آشنا کا آشنا ہوں

کیا ہوں ترکِ نرگس کا تماشا
طلب گارِ نگاہِ با حیا ہوں

نہ کہہ شمشاد کی تعریف مجھ پاس
کہ میں اُس سرو قد کا مبتلا ہوں

کیا میں عرض اس خورشید رو سوں
تو شاہِ حسن میں تیرا گدا ہوں

سدا رکھتا ہوں شوق اس کے سخن کا
ہمیشہ تشنۂ آبِ بقا ہوں

قدم پر اس کے رکھتا ہوں سدا سر
ولی ہم مشربِ رنگِ حنا ہوں

○

میں عاشقی میں تب سوں افسانہ ہو رہا ہوں
تیری نگہ کا جب سوں دیوانہ ہو رہا ہوں

اے آشنا کرم سوں یک بار آ درس دے
تجھ باج سب جہاں سوں بیگانہ ہو رہا ہوں

باتاں لگن کی مت پوچھ اے شمعِ بزمِ خوبی
مدت سوں تجھ جھلک کا پروانہ ہو رہا ہوں

شاید وہ گنجِ خوبی آوے کسی طرف سوں
اس واسطے سراپا ویرانہ ہو رہا ہوں

سودائے زلفِ خوباں رکھتا ہوں دل میں دائم
زنجیرِ عاشقی کا دیوانہ ہو رہا ہوں

برجا ہے گر سنوں نیں ناصح تری نصیحت
میں جامِ عشق پی کر مستانہ ہو رہا ہوں

کس سوں ولی اُپس کا احوال جا کہوں میں
سر تا قدم میں غم سوں غم خانہ ہو رہا ہوں

○

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

دیکھ خوباں کو وقت ملنے کے
کس ادا سوں سلام کرتے ہیں

کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں
دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے
کام اپنا تمام کرتے ہیں

کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کو
صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں

صاحب لفظ اس کو کہہ سکیے
جس سوں خوباں کلام کرتے ہیں

دل لجاتے ہیں اے ولی میرا
سرو قد جب خرام کرتے ہیں

○

کیا مجھ عشق کوں ظالم نے آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

وفاداری نے دلبر کی بجھایا آتش غم کوں
کہ گرمی دفع کرتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل رو سوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

مرے دل کوں کیا بے خود تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جیوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

ہوا تجھ عشق سوں اے آتشیں رو دل مرا پانی
کہ جیوں گلتا ہے آتش سوں گلاب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

ولی مجھ دل میں آتا ہے خیال یار بے پروا
کہ جیوں انکھیں میں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

○

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

نہ چھوڑے محبت دمِ مرگ تک
جسے یارِ جانی سوں یاری لگے

نہ ہووے اُسے جگ میں ہرگز قرار
جسے عشق کی بے قراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشقِ پاک کوں
پیارے تری بات پیاری لگے

ولی کوں کہے تو اگر یک بچن
رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

○

ترا لب دیکھ حیواں یاد آوے
ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے

ترے دو نین جب دیکھوں نظر بھر
مجھے تب نرگستاں یاد آوے

تری زلفاں کی طولانی کوں دیکھے
مجھے لیل زمستاں یاد آوے

ترے خط کا زمرد رنگ دیکھے
بہارِ سنبلستاں یاد آوے

ترے مکھ کے چمن کے دیکھنے کوں
مجھے فردوسِ رضواں یاد آوے

تری زلفاں میں یو مکھ جو کہ دیکھے
اُسے شمعِ شبستاں یاد آوے

جو کئی دیکھے میری انکھیاں کو روتے
اُسے ابرِ بہاراں یاد آوے

جو میرے حال کی گردش کوں دیکھے
اُسے گردابِ گرداں یاد آوے

ولی میرا جنوں جو کئی کہ دیکھے
اُسے کوہ و بیاباں یاد آوے

سرودِ عیش گاویں ہم، اگر وہ عشوہ ساز آوے
بجاویں طبل شادی کے، اگر وہ دل نواز آوے

خمارِ ہجر نے جس کے دیا ہے دردِ سر مجکوں
رکھوں نشہ نمن انکھیاں میں گر وہ مستِ ناز آوے

جنونِ عشق میں مجکوں نہیں زنجیر کی حاجت
اگر میری خبر لینے کوں وہ زلفِ دراز آوے

ادب کے اہتمام آگے نہ پاوے بار واں ہرگز
ترے سلیے کی پابوسی کوں گر رنگِ ایاز آوے

عجب نہیں گر گلاں دوڑیں پکڑ کر صورتِ قمری
ادا سوں جب چمن بھیتر وہ سروِ سرفراز آوے

پرستش اس کی میرے سر پہ ہوئے سرنتی لازم
صنم میرا رقیباں کے اگر ملنے سوں باز آوے

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جوں سینے میں راز آوے

صنم میرا سخن سوں آشنا ہے
مجھے ذکرِ سخن کرنا بجا ہے

چمن میں وصل کے ہر جلوۂ یار
گلِ رنگیں بہارِ مدعا ہے

نہ بخشے کیوں ترا خطِ زندگانی
کہ موجِ چشمۂ آبِ بقا ہے

تغافل نے ترے زخمی کیا مجھ
تری یہ کم نگاہی نیمچا ہے

نہیں واں آب غیر از آبِ خنجر
شہادت گاہِ عاشق کربلا ہے

غنیمت بوجھ ملنے کوں ولی کے
نگاہِ پاک بازاں کیمیا ہے

میر تقی میر

○

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت؟
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی، پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے ترا اشک عقیقِ جگری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

○

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا

بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

سودا

○

مقدور نہیں اس کی تجلّی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرفِ زباں کا

پردے کو تعیّن کے درِ دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسماتِ جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ!
جوں شمعِ حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنسِ گراں کا

ق

سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو
مضمون یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

○

دل! مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا
جوں اشک پھر زمیں سے اٹھایا نہ جائے گا

رخصت ہے باغباں کہ ٹک اک دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

تیغِ جفائے یار سے دل! سر نہ پھیریو
پھر منہ وفا کو ہم سے دکھایا نہ جائے گا

آوے گا وہ چمن میں نہ اے ابر جب تلک
پانی گلوں کے منہ سے چوایا نہ جائے گا

ق

ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خو سے درگزر
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

داماں داغِ تیغ جو دھویا، تو کیا ہوا
ظالم کے دل سے داغ ہٹایا نہ جائے گا

○

نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں، نہ نرگس کی کھلیں کلیاں
چمن میں لے کے خمیازہ کسی نے انکھڑیاں ملیاں

کسی مہتاب نے دیکھا ہے تجھ خورشید تاباں کو
پھرے ہے ڈھونڈتا ہر شب جہانِ آباد کی گلیاں

تبسم یوں نمایاں ہے مسی آلودہ دنداں سے
نہ ہو ابرِ سیہ میں اس طرح بجلی کی اچپلیاں

لب و لہجہ ترا سا ہے کہیں خوبانِ عالم میں
غلط ہے یہ زبانوں پر کہ سب مصری کی ہیں ڈلیاں

دِوانہ ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہیں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

○

گدا، دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے
سو یک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

یہ رنجش میں ہم کو ہے بے اختیاری
تجھے تیری کھا کر قسم دیکھتے ہیں

غرض کفر سے کچھ، نہ دیں سے ہے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

حبابِ لبِ جو ہیں اے باغباں ہم
چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں

مٹا جائے ہے حرف حرف آنسوؤں سے
جو نامہ اسے کر رقم دیکھتے ہیں

اگرچہ نہیں کام سنبل سے ہم کو
کسی زلف کا پیچ و خم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا
اسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

○

باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھولیاں
دل لے کے بولتا ہے جواب تو یہ بولیاں

ہر بات ہے لطیفہ و ہر اک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں

حیرت نے اس کو بند نہ کرنے دیں پھر کبھو
آنکھیں جب آرسی نے ترے مکھ پہ کھولیاں

اندامِ گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک
جوں خوش چھبوں کے تن پہ مسکتی ہیں چولیاں

کس طرح ہووے آنکھوں کی کاوش سے دل کو چین
مژگاں نہ گڑ سکیں تو نگاہیں چبھولیاں

کیا چاہیے تجھے یہ سرِ انگشت پر حنا
جس بے گنہ کے خون میں چاہیں ڈبو لیاں

سودا کے دل سے صاف نہ رہتی تھی زلفِ یار
شانے نے بیچ پڑ کے گرہ اس کی کھولیاں

○

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

مہر ہر ذرہ میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے؟
ورتم بھی ٹک دیکھو تو صاحب نظراں! ہے کہ نہیں

پاسِ ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل!
ورنہ یاں کون سا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں

ق

پوچھا اک روز میں سودا سے کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں

یک بیک ہو کے بر آشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی یہاں ہے کہ نہیں

دیکھا میں قصرِ فریدوں کے در اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

○

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن! کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ، خدا جانیے! ورنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی

اے ابر! قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی

کس ہستیِ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار!
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی

تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

○

جوں غنچہ تو چمن میں بندِ قبا کو کھولے
پھر گُل سے اے پیارے! بلبل کبھو نہ بولے

آوے گا وہ چمن میں تڑکے ہی مے کشی کو
شبنم سے کہہ دے بلبل! پیالے گلوں کے دھولے

باغِ جہاں میں آکر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
اک دل ملا کہ جس میں ہیں سینکڑوں پھپھولے

ایسا ہی جاؤں جاؤں کرتے ہو تو سدھارو
اس دل پہ کل جو ہونی سو آج ہی وہ ہولے

کم بولنا ادا ہے ہر چند پر نہ اتنا
مُند جائے چشمِ عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے

چشمِ پُر آب ہوں میں جوں آئینہ حبابی
رگ رگ کے پڑ گئے ہیں چھاتی میں سب پھپھولے

کون ایسا اب کہے ہے سودا گلی میں اس کی
آ تجھ کو لے چلیں ہم دل کھول کر تو رولے

○

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے
یہ وہ نین ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

اے دل، یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوجِ اشک
لختِ جگر کی نعش کو آگے دھرے ہوئے

انصاف اپنا سونپیے کس کو بہ جُز خدا
منصف جو بولتے ہیں تو تجھ سے ڈرے ہوئے

نزدیک اپنے رہنے سے مت کر ہمیں تو منع
ہیں لاکھ کوس جب ترے دل سے پرے ہوئے

سودا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے
لڑکے پھریں ہیں پتھروں سے دامن بھرے ہوئے

○

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو! کچھ رہا بھی ہے

ترا غرور، مرا عجز، تا بکجا ظالم!
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

جلے ہے شمع سے پروانہ اور میں تجھ سے
کہیں ہے مہر بھی جگ میں، کہیں وفا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد!
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

خواجہ میر درد

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں جو پہنچا تو کہا: خیر! یہ مذکور نہ تھا

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

پرورش غم کی ترے یاں تئیں تو کی دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں کہ ناسور نہ تھا

محتسب! آج تو میخانے میں تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی جو شیشے کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار! برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجومِ یاس! جی گھبرا گیا

تجھ سے کچھ دیکھا نہ ہم نے بجز جفا
پر وہ کیا کچھ ہے کہ جی کو بھا گیا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری
جی میں یہ کس کا تصور آ گیا

میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

پی گئی کتنوں کا لُہو تیری یاد
غم ترا کتنے کلیجے کھا گیا

مٹ گئی تھی اس کے جی سے تو جھجک
درد کچھ بک بک کے تُو جونکا گیا

○

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ
کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا

یگانہ ہے تو آہ! بیگانگی میں
کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں
کبھو تو نے آکر تماشا نہ دیکھا

تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے
ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا

حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے دردؔ درپے ہوں اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا، نہ دیکھا

○

مژگانِ تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی
افتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں

ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آہ! میں تو موجِ نسیمِ وزیدہ ہوں

چاہے ہے یہ مری تپشِ دل کہ بعدِ مرگ
کنجِ مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

اے دردؔ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غم زدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

○

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمائیاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آ کے ہو کریں

تر دامنی پہ شیخ، ہماری نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں،

سر تا قدم زبان ہیں جوں شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہی اعتبار
کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدانِ شہر
اے درد آ کے بیعتِ دستِ سبو کریں

○

سمجھنا فہم گر کچھ ہے طبیعی سے الٰہی کو
شہادت غیب کی خاطر تو حاضر ہے گواہی کو

نہیں ممکن کہ ہم سے ظلمتِ امکان زائل ہو
چھڑاوے آہ کوئی کیونکر زنگی سے سیاہی کو

عجب عالم ہے ادھر سے ہمیں ہستی ستاتی ہے
ادھر سے نیستی آتی ہے دوڑی عذر خواہی کو

نہ رہ جاوے کہیں تو زاہدا محروم رحمت سے
گنہ گاروں میں سمجھا کریو اپنی بے گناہی کو

نہ لازم نیستی اس کو نہ ہستی ہی ضروری ہے
بیاں کیا کیجیے اے درد ممکن کی تباہی کو

○

ہر طرح زمانہ کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گر دل ہوں تو آزردہ، خاطر ہوں تو رنجیدہ

ہم گلشنِ دوراں میں اے خفتگی طالع!
سرسبز تو ہیں، لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ

اے شورِ قیامت! رہ اودھر ہی میں کہتا ہوں
چونکے نہ ابھی یاں سے کوئی دلِ شوریدہ

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں
ایدھر کو نظر کوئی پھینکی بھی تو دُزدیدہ

مجھ پر بھی تو یہ عقدہ تو کھول صبا! بارے
زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ

بدخواہ بھی عالم گو ہووے تو ہو، لیکن
یارب! نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل و دیدہ

کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ
اے دردؔ یہ تیرا تو ہر مصرعِ پیچیدہ

○

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دوئی کا نہ آسکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

قاصد! نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل! خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یارب! یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

گو بحث کر کے بات بٹھائی پہ کیا حصول
دل سے اٹھا غلاف اگر تو اٹھا سکے

اخفائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مستِ شرابِ عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر
اے دردؔ! چاہے لائے بخود پھر، نہ لا سکے

○

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے   جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا!   ایک دم آئے اِدھر اُودھر چلے

دوستو! دیکھا تماشا یاں کا بس!   تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

آہ! بس جی مت جلا تب جانیے   جب کوئی افسوں ترا اس پر چلے

ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست   زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے   شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے   وہ ہی آڑے آ گیا جیدھر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے   ساتھ اپنے اب اسے لے کر چلے

جوں شرر اے ہستیٔ بے بود یاں   بارے! ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ   جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے؟

○

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی
خطرہ جو ہے سو آئینۂ دل پہ زنگ ہے

حیرت زدہ نہیں ہے فقط تو ہی آئینہ
یاں تک بھی جس کی آنکھ کھلی ہے سو دنگ ہے

اس ہستیٔ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشۂ ظہور! یہ تیری ترنگ ہے

گل گیر! منہ پسار نہ تو شمع کی طرف
اس کی زبان ہی اسے کامِ نہنگ ہے

کب ہے دماغِ عشقِ بتانِ فرنگ کا
مجھ کو تو اپنی ہستی ہی قیدِ فرنگ ہے

عالم سے اختیار کی ہر چند صلحِ کل
پر اپنے ساتھ مجھ کو شب و روز جنگ ہے

میں کیا کہوں تجھے نظر آتا نہیں ہے کیا
اس گلشنِ جہان کا جو کچھ کہ ڈھنگ ہے

غنچہ شگفتہ ہوئے ہی ہوئے کہ اس میں دردؔ
دیکھا چمن میں جا کے کچھ اور رنگ ہے

مصحفی

○

سرِ شام اس نے منہ سے جو رُخ نقاب اٹھا
نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب اٹھا

میں حساب بوسہ جی میں کہیں اپنے کر رہا تھا
وہ لگا مجھی سے کرنے طلب اور حساب اٹھا

مہ چار دہ کا عالم میں دکھاؤں گا فلک کو
اگر اس نے پردہ منہ سے شب ماہتاب اٹھا

جو خفا ہوا میں جی میں کسی بات پر شب وصل
سحر اُٹھ کے میرے آگے وہی اس نے خواب اُٹھا

بہ سوال بوسہ اُس نے مجھے جھڑک کے دی جو گالی
میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب اُٹھا

میں بچا ہوں جس پہ عاشق یہ شگرف ماجرا ہے
کہ مجھے عوض لگا ہے اُسے اضطراب اٹھا

میں عجب یہ رسم دیکھی کہ بہ روزِ عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اٹھا

نہیں جائے شکوہ اس میں ہمیں مصحفی ہمیشہ
یہ زمانے کا رہا ہے یونہی انقلاب اٹھا

○

آج کچھ سینے میں دل ہے خود بخود بے تاب سا
کر رہا ہے بے قراری پارۂ سیماب سا

جوں گلِ تر کیا ہی اُس سے جھلکے ہے اس کا بدن
وہ جو پیراہن گلے میں اُس کے ہے اک آب سا

میں ہوں اور خلوت ہے اور پیشِ نظر معشوق ہے
ہے تو بیداری و لے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا

کل شبِ تاریک میں جونہی ہوا وہ بے نقاب
جلوہ گر رُوئے زمیں پہ ہو گیا مہتاب سا

کیا کہوں حسن و لطافت جامۂ شبنم سے ہے
نکلا ہی پڑتا ہے وہ گورا بدن مہتاب سا

مصحفی کیوں لختِ دل رونے کا کھاتا ہے قسم
ہے نمایاں کچھ تو آنکھوں میں تری خوناب سا

○

سو سو طرح کا حادثہ تجھ پر گزر چکا
پر اے دل ایک روز کہیں تو نہ مر چکا

اتنا بھی خال و خط کا بنانا ہے کیا یہاں
بس رکھو آئینہ کہاں مکھڑا سنور چکا

اس ہاتھ سے یہ دل نہ تسلی ہوا دریغ
سو مرتبہ میں دل کے اُوپر ہاتھ دھر چکا

اے یار وقتِ چہرہ خراشی و مُو کَنی
کیا کیا نہ تیرے ہاتھ سے مجھ پر گزر چکا

اک سر پر خاک ڈالنی باقی رہی ہے سو
دیکھو گے شام و صبح کہ میں وہ بھی کر چکا

کتنا ہی میں بسار رہوں اُسے لیک مصحفی
نقشہ اگر یہی ہے تو جی سے بسر چکا

○

جی جائے گا رائگاں کسی کا۔
یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا

مکھڑے سے نقاب مت اُٹھاؤ
کیا فائدہ ہو زیاں کسی کا

جُز آہ وہاں کوئی کرے کیا
کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا

آزردہ کریں ہیں اس طرح واہ
دل مفت ہیں او میاں کسی کا

تا فصلِ دگر رہا نہ ہرگز
اس باغ میں آشیاں کسی کا

دیتے نہیں مصحفی پھر اس کو
دل لیویں جو یہ بتاں کسی کا

○

ناگہ چمن میں جب وہ گُل اندام آگیا
گُل کو شکستِ رنگ کا پیغام آگیا

اُٹھا جو صبح خواب سے وہ مستِ پُرخمار
خورشید کف کے بیچ لیے جام آگیا

افسوس ہے کہ ہم تو رہے مستِ خوابِ صبح
اور آفتابِ عمر لبِ بام آگیا

سوچے تھا اہلِ جرم سے کس کو کروں میں قتل
اتنے میں اس کو یاد مرا نام آگیا

ہے جائے رحم حال پہ یاں اُس اسیر کے
جو گرتے ہی ہوا سے تہِ دام آگیا

گو میں تڑپ تڑپ کے دی حسرت میں اپنی جان
بارے تک ایک دل کو تو آرام آگیا

سمجھو خدا کے واسطے پیارے بُرا نہیں
دو دن اگر کسی کے کوئی کام آگیا

گر قطع کب گیا ترے کوچے سے مصحفی
گر صبح کو گیا، وہیں پھر شام آگیا

○

گر اُس منہ سے برقع کبھی کُھل گیا
تو دیکھو گے مہ خاک میں رُل گیا

گیا جان سے ایک عالم میاں
ولیکن نہ تیرا تغافل گیا

رہا ہے کہاں ہم میں آرامِ صبر
وہ طاقت گئی وہ تحمل گیا

ہمیں دے گیا داغ جاتے ہوئے
غرض اس گلستاں سے جو گُل گیا

وہی رنگِ گُل ہے وہی چہچہے
چمن سے کہاں شورِ بلبل گیا

لگی چوٹ دل کو مرے داغ سے
سحر نالہ کرتا جو بلبل گیا

میں کہتا تھا عاشق نہ ہو مصحفی
تو ایسی ہی باتوں میں تو کُھل گیا

○

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

میرے پہلو میں رات جا کر وہ
ماہ تھا یا ہلال تھا کیا تھا

چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

مصحفیؔ شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

○

خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا
چتون کو دکھا خوبی سرمے کو لگا رکھا

سویا تھا لپٹ کر میں اُس ساتھ ولے اس نے
پہلو سے مرے پہلو تا صبح جدا رکھا

کس منہ سے اجل کو اب منہ اپنا دکھا دیں گے
ہم میں تری اُلفت نے کہہ تو ہی کہ کیا رکھا

قاصد جو گیا میرا لے نامہ تو پھر اُس نے
نامے کے کئے پرزے قاصد کو بٹھا رکھا

کس لب کے تبسم نے چھڑکا تھا نمک اُن پر
زخموں کے الم نے شب تا صبح مزا رکھا

کیا جانئے کب کا تھا یہ میرا فلک دشمن
جو اس مہ تاباں کو نت مجھ سے جدا رکھا

اے مصحفیؔ میں کس کی رفتار کا کشتہ تھا
ہر شعر میں میں نے جو انداز نیا رکھا

٭

ہے یہ عشق آفت و بلا تو نہیں
اس کا مارا کوئی جیا تو نہیں

دل کی تڑپوں میں آن نکلے ہے
دیکھیو کشتۂ ادا تو نہیں

پوچھتا کیا ہے حال دل کا مرے
او میاں تجھ سے کچھ چھپا تو نہیں

یعنی عاشق ہو اور ہرجائی
اب تلک ہم نے یہ سنا تو نہیں

بات پر اس کی میں جو کل بولا
کہا کچھ ذکر آپ کا تو نہیں

٭

ہے ماہ کہ آفتاب کیا ہے
دیکھو تو تہ نقاب کیا ہے

میں نے سب تجھے تو نے مجھ کو دیکھا
اب مجھ سے تجھے حجاب کیا ہے

آئے ہو تو کوئی دم تو بیٹھو
اے قبلہ یہ اضطراب کیا ہے

اس بن ہمیں جب جاگتے ہی گزری
جانا نہ یہی کہ خواب کیا ہے

مجکو بھی گنے وہ عاشقوں میں
اس بات کا سو حساب کیا ہے

اس میکدۂ جہاں میں یارو،
مجھ سا بھی کوئی خراب کیا ہے

قسمت میں ہمارے مصحفی ہائے
کیا جانے ثواب عذاب کیا ہے

میر حسن

○

عشق کا راز گر نہ کھُل جاتا
اس قدر تو نہ ہم سے شرماتا

آ کے تب بیٹھتا ہے وہ ہم پاس
آپ میں جب ہمیں نہیں پاتا

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ
میں تماشا وفا کا دکھلاتا

مر گئے ہم تو کہتے کہتے حال
کچھ تو تو بھی زباں سے فرماتا

سب یہ باتیں ہیں چاہ کی ورنہ
اس قدر تو نہ ہم پہ جھنجلاتا

میں نہ سنتا کسی کی بات حسنؔ
دل جو باتیں نہ مجھ کو سُنواتا

○

جاتا تھا اس کے کھوج میں، میں بے خبر چلا
بارے اسی نے ٹوک کے پوچھا، کدھر چلا

جس اشتیاق سے کہ میں آتا ہوں تیرے پاس
کیا ہو، جو آوے تو بھی یوں ہی بے خبر چلا

غیروں میں اس نے منہ تو چھپایا تھا مجھ کو دیکھ
پر میں بھی اس کی چھیڑ سے منہ ڈھانپ کر چلا

کس میں رکھوں گا اب مئے حسرت کو میں بھلا
شیشہ تو دل کا خونِ جگر ہی سے بھر چلا

لکھنے کی یاں نہ تاب، نہ پڑھنے کا واں دماغ
کہہ دیں گے کچھ زبانی، اگر نامہ بر چلا

قطعہ

کچھ رات غیر کی جو کہیں نکلی اس سے بات
سُن سُن کے میں خفا ہو، وہیں روٹھ کر چلا
غصّے میں دیکھ مجھ کو لگا کہنے : اور لو!
اک بات بس کہی نہ کہی، یہ تو مر چلا
اب کوئی آوے یا کہ نہ آوے حسنؔ کو کیا
بے چارہ اپنی جان سے آپ ہی گزر چلا

○

غم خانۂ دل عیش کا گھر ہووے گا یارب
آباد کبھی یہ بھی نگر ہووے گا یارب!

جب دیکھوں ہوں اس کو تو یہ آتا ہے مجھے رشک
کس کس کا یہ منظورِ نظر ہووے گا یارب!

بگڑی تو ہے غیروں سے اور اب ہم سے و لیکن
کیا جانئے! وہ شوخ کدھر ہووے گا یارب

جان و دل و دیں کھوئے اک اس کی نظر پہ
ایسا بھی کوئی اور بشر ہووے گا یارب!

رونے سے مرے سنگ تلک ہو گئے پانی
دل میں کبھی اس کے بھی اثر ہووے گا یارب

داغوں کو ترے غم کے جو رکھے تر و تازہ
یہ میرے سوا کس کا جگر ہووے گا یارب!

روتے ہی گزرتی ہے شب و روز حسنؔ کو
اور اس سے تو کیا حال بتر ہووے گا یارب

○

دل غم سے ترے لگا گئے ہم
کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

ماتم کدۂ جہاں میں جوں شمع
رو رو کے جگر بہا گئے ہم

مانند حباب اس جہاں میں
کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

کھویا گیا اس میں گو دل اپنا
پر یار! تجھے تو پا گئے ہم

تھا ہم میں اور اس میں وہ جو پردہ
سو اس کو حسنؔ اٹھا گئے ہم

○

اس کی جب بزم سے ہم ہو کے تنگ آتے ہیں
اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں

حسن میں جب تئیں گرمی نہ ہو اچی دیوے کون
شمع تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں!

دل کو کس بوقلموں جلوہ نے ہے خون کیا
اشک آنکھوں سے جو یہ رنگ برنگ آتے ہیں

آہ تعظیم کو اٹھتی ہے مرے سینے سے
دل پہ جب اس کی نگاہوں کے خدنگ آتے ہیں

شرط گر پوچھو، تو ہے اس میں بھی قسمت ورنہ
عاشقی کرنے کے ہر ایک کو ڈھنگ آتے ہیں

حیرت افزا ہے عجب کوچۂ دلدار حسنؔ!
جو وہاں جاتے ہیں اس طرح سے دنگ آتے ہیں

○

ہم نہ نکہت ہیں، نہ گل ہیں، جو مہکتے جاویں
آگ کی طرح جدھر جاویں، دہکتے جاویں

اے خوشا مستی! کہ تابوت کے آگے جس کے
آب پاشی کے بدل مے کو چھڑکتے جاویں

جو کوئی آوے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

غیر کو راہ ہو گھر میں ترے سبحان اللہ!
اور ہم دور سے در کو ترے تکتے جاویں

وقت اب وہ ہے کہ اک ایک حسنؔ ہو کے تنگ
صبر و تاب و خرد و ہوش کھسکتے جاویں

○

مجھ کو عاشق کہہ کے اُس کے روبرو مت کیجیو!
دوستاں! گر دوست ہو تو یہ کبھو مت کیجیو!

جس ادا کا کشتہ ہوں میں وہ رہے میرے ہی ساتھ
اس ادا کو جس سے دل لے خوب رُو مت کیجیو!

وقتِ رخصت دل نے اتنا ہی کہا رو کر کہ بس
اب پھر آنے کی مرے تو آرزو مت کیجیو!

میں تو یوں ہی تم سے دیوانہ سا بکتا ہوں کہیں
اس کے آگے دوستاں! یہ گفتگو مت کیجیو!

زلف کے کوچے سے ہو گلشن میں گزرے ہے صبا
آج واں جا کر گلوں کو کوئی بو مت کیجیو!

گل کے جھگڑے میں بھلا ہے کس کے یارو! حق بطرف؟
واجبی جو ہو، سو کہیو! میری رُو مت کیجیو!

واں حسنؔ ہرگز نہیں ہے ڈھیل پھر جانے میں کچھ
آشنائی پر بھروسہ اس کی تو مت کیجیو!

○

ہمدم! نہ پوچھ مجھ سے، غرض اک بلا ہے وہ
جو روبرو ہو اس کے سو جانے کہ کیا ہے وہ

بیگانہ وار بھی نہ ملا ہم سے وہ کبھی
ہم سادہ دل یہ جانتے تھے آشنا ہے وہ

ہجراں تو ہے، پہ یہ نہیں معلوم کچھ ہمیں
ہم آپ سے جدا ہیں کہ ہم سے جدا ہے وہ

پھر پھر کے پوچھتے ہو عبث آرزوئے دل
تم جانتے تو ہو کہ مرا مدعا ہے وہ

میں نے تو بات بھی نہیں کی اس سے ہم نشیں!
اک یہ بھی چوچلا ہے کہ ناحق خفا ہے وہ

معذور رکھ حسنؔ کو جو بے طاقتی کرے
عاشق ہے، دردمند ہے اور مبتلا ہے وہ

○

سیر ہے تجھ سے مری جان! جدھر کو چلیے
تو ہی گر ساتھ نہ ہووے، تو کدھر کو چلیے

خواہ کعبہ ہو کہ بُت خانہ غرض ہم سے سُن
جس طرف دل کی طبیعت ہو، اُدھر کو چلیے

زلف تک رُخ سے نگہ جاوے نہ اک دن کے سوا
شام کو پہنچیے منزل، جو سحر کو چلیے

جب میں چلتا ہوں ترے کوچہ سے کترا کے کبھی
دل مجھے پھیر کے کہتا ہے: ادھر کو چلیے

ان دنوں رات اسی فکر میں کٹتی ہے حسن
صبح کب ہووے کہ پھر یار کے گھر کو چلیے

○

دل بر سے ہم اپنے جب ملیں گے
اس گم شدہ دل سے تب ملیں گے

یہ کس کو خبر ہے، اب کے بچھڑے
کیا جانیے! اس سے کب ملیں گے

دنیا ہے، سنبھل کے دل لگانا
یاں لوگ عجب عجب ملیں گے

ظاہر میں تو ڈھب نہیں ہے کوئی
ہم یار سے کس سبب ملیں گے

آرام حسن تبھی تو ہوگا،
اس لب سے جب اپنے لب ملیں گے

جرأت

○

ہمیں دیکھے سے وہ جیتا تھا اور ہم اس پہ مرتے تھے
یہی راتیں تھیں اور باتیں تھیں وہ دن کیا گزرتے تھے

وہ سوزِ دل سے بھر لاتا تھا اشکِ سرخ آنکھوں میں
اگر ہم جی کی بے چینی سے آہِ سرد بھرتے تھے

بیاں ہم وصل میں کرتے جو دردِ ہجر سے مرنا
تو وہ کہتا خدا شاہد ہے اس کا ہم بھی مرتے تھے

کسی دھڑکے سے روتے تھے جو باہم وصل کی شب کو
وہ ہم کو منع کرتا تھا ہم اس کو منع کرتے تھے

ملی رہتی تھیں نظریں غلبۂ اُلفت سے آپس میں
نہ خوف اوس کو کسی کا تھا نہ ہم لوگوں سے ڈرتے تھے

سو اب صد حیف اوس خورشید رُو کے ہجر میں جرأت
نہیں راتیں ہیں اور باتیں ہیں وہ دن کیا گزرتے تھے

○

سنا ہے وہ خدا نا کردہ ہے بیمار کیا کیجے
عیادت کو بھی جانا ہے ہمیں دشوار کیا کیجے

خیال اوس کی جو بیخوابی کا گزرے ہے تو ہم شب کو
لگا کے چھت سے آنکھیں رہتے ہیں بیدار کیا کیجے

کسی کو بھیج بھی سکتے نہیں احوال پرسی کو
مگر یہ چپکے چپکے کہتے ہیں ہر بار کیا کیجے

کفِ افسوس ملتے ہیں کہ جرأت ہم نہیں اس جا
نہیں تلوے تو سہلاتے گھڑی دو چار کیا کیجے

○

سچ تو یہ ہے بے جگہ ربط ان دنوں پیدا کیا
پیچ ہے ہر دم یہی ہم کو کہ ہم نے کیا کیا

وہ گیا اُٹھ کر جدھر کو میں ادھر حیران سا
اوس کے جانے پر بھی کتنی دیر تک دیکھا کیا

میری اور اوس شوخ کی صاحب سلامت جو ہوئی
صبر و طاقت نے کہا لو ہم نے تو مجرا کیا

دمبدم حسرت سے دیکھوں کیوں نہ سوئے چرخ میں
اس نے اوروں کا کیا اوس کو ہمیں جس کا کیا

دل گئے تھے ایک بار اوس کے جو میرے لب سے لب
عمر بھر ہونٹوں پہ اپنے میں زباں پھیرا کیا

جب تلک کرتے رہے مذکور اوس کا مجھ سے لوگ
جی میں کچھ سوچا کیا میں اور دل دھڑکا کیا

دل ملے پر بھی ملاپ ایسی جگہ ہوتی رہی
ہم ادھر تڑپا کئے اور وہ ادھر تڑپا کیا

سوزشِ دل کیا کہوں میں جب تلک جیتا رہا
ایک انگارا سا پہلو میں مرے دہکا کیا

○

خیالِ وصل میں اوس کے عجب باتیں بناتا ہوں — مگر بیٹھا ہے وہ گویا اور اوس کو میں مناتا ہوں
گلی میں اوس کی جب جاتا ہوں بن ٹھن اک کچا چا — کچھ ایسا ہی سُن آتا ہوں کہ بس اُن سے سُن آتا ہوں
گلے لگتا نہیں گر عیدِ قرباں کو بھی تو میرے — تو لے خنجر ہی کو اپنے گلے سے میں لگاتا ہوں
تماشا ہے کہ ہے مدہوش وہ تو نشۂ مے سے — پھر اس محفل سے میں اٹھتے ہوئے کیوں لڑکھڑاتا ہوں
کہے ہے کس کے رنجیدہ ہوئے ایسے یہ بندے سے — ذرا سمجھو تو صاحب میں تو آپ ہی کا کہاتا ہوں
کہے گر کوئی وہ ناگن نہیں پر دل کو ڈستی ہے — تو اوس کی زلف کی میں یہ پہیلی بوجھ جاتا ہوں
کہوں کیا دردِ ہجراں سے مری کیا شکل ہے جرأت — کسی صورت نہیں آرام کیا ایذا اٹھاتا ہوں
کبھی جو یاد آتا ہے وہ ہنسنا بولنا اُس کا — تو پھر رو رو کے دریا اپنی آنکھوں سے بہاتا ہوں
کبھی اوس کا جو بلوانا وہ مجھ کو یاد آتا ہے — تو بیٹھے بیٹھے کیا جانوں کہ کدھر کو میں جاتا ہوں
کبھی گھبرا کے سر اپنا پٹکتا ہوں میں بالیں سے — کبھی بستر پہ بیتابی کے مارے تلملاتا ہوں
کبھی آواز اوس کی سی جو آ جاتی ہے کانوں میں — تو دل پر ہاتھ رکھ کر دھیان اودھر کو لگاتا ہوں
پھر اوس میں گر تسلی کو کوئی پاس آن بیٹھے ہے — تو مطلع پڑھ کے یہ روتا ہوں اور اوس کو رُلاتا ہوں

قرار اوس شعلہ رُو کے ہجر میں کیا خاک پاتا ہوں
نظر آتی ہے اک آتش جدھر کو آنکھ اُٹھاتا ہوں

○

ذرا ہم اس سے لگ چلنے کے سو سو ڈھب لگاتے ہیں
رسائی جو نہیں پاتے تو کیا کیا تلملاتے ہیں

غضب یہ ہے کہ واں جاتے ہیں تو خالی پھر آتے ہیں
اگر جاتے نہیں تو جی ہی سے ہم اپنے جاتے ہیں

ملی رہتی تھیں جو نظروں سے نظریں سو کہاں اب تو
کبھی ہم اتفاقاً اک جھلک سی دیکھ پاتے ہیں

نظر آتا ہے باہم اب جو وصل و ہجر کا عالم
کبھی روتے ہیں آپ اپنے پر اور گہ مسکراتے ہیں

خدا شاہد ہے دو ہیں جان میں بس جان آتی ہے
کبھی صاحب جو آواز اپنے بندے کو سناتے ہیں

غرض یہ آتشِ دل اور بھی بھڑکے ہے نالے سے
لگی کو گرچہ اشکِ چشم کتنا ہی بجھاتے ہیں

برنگِ موج جب بیتاب ہوتا ہے یہ دل بریں
تو ہم رو رو کے دریا اپنی آنکھوں سے بہاتے ہیں

قلق گزرے ہے یہ دل پر کہ بس میں مرنے لگتا ہوں
دکھانے میں جو صورت آپ کچھ عرصہ لگاتے ہیں

مناسب گرچہ جانا بار بار اُس جا نہیں جرأت
ولے کیا کیجے بیتابی سے ہم لاچار جاتے ہیں

○

ہے غضب اپنی طبیعت اوس پہ ہے آئی ہوئی
جس پہ پڑتی ہے نگہ ہر اک کی للچائی ہوئی

یاد آجاتی ہے تو روتا ہوں کیا منہ ڈھانپ کے غضب
بھولی بھولی صورت اور وہ آنکھ شرمائی ہوئی

چھاؤنی برسات میں چھائی کہاں جلد آؤ جی
جی گھٹاتی ہے ہمارا یہ گھٹا چھائی ہوئی

کون رخصت ہو کے یہ ہم سے گیا یارب جو آہ
صبر نے مجرا کیا رخصت شکیبائی ہوئی

شب تصور میں کسی مہرو کی آنکھوں کے حضور
چار سُو اک نور کی چادر تھی پھیلائی ہوئی

ناتواں دیکھا جو مجھ کو تو یہ ہنس کر بول اُٹھے
بارے اب تو کچھ بہت ان میں توانائی ہوئی

سامنے میرے جو منہ کر کے نہیں تم بیٹھتے
کیا کسی کے سامنے ہے یہ قسم کھائی ہوئی

پر یہ حیرت ہے مجھے اُس پہ نہ تم ٹھہرے رہے
بات جو مدت سے ہے آپس میں ٹھہرائی ہوئی

خیر تو ہے اے دلِ وحشت زدہ یہ کیا ہوا
یوں جو قسمت میں مری یہ دشت پیمائی ہوئی

پا برہنہ، مو پریشاں، آہ بر لب، رنگ زرد
دست بر سینہ ہے اور صورت ہے گھبرائی ہوئی

دوڑ دوڑ آنے سے جرأت کے رکو مت کیا کہے
اس بچارے کی طبیعت تم پہ ہے آئی ہوئی

○

بیٹھ اوس وصل میں ٹک لطف اُٹھانے دے مجھے
اے ترے پاؤں پڑوں ہاتھ لگانے دے مجھے

سرگزشت آتے ہی کیا پوچھے ہے اے جانِ جہاں
سب بتاؤں گا تجھے آپ میں آنے دے مجھے

اب تو دم رکنے لگا ضبطِ محبت سے ہے
ایک دو اشک تو آنکھوں سے بہانے دے مجھے

مجھ سے پوچھے ہے بگڑ کر وہ حقیقت میری
کچھ تو اے بے خبری بات بنانے دے مجھے

ٹکٹکی باندھنے سے بات نہ کھل جائے کہیں
حیرتِ حسن پلک تک تو ہلانے دے مجھے

آہ دل جس کا ملا ہووے نہ دل سے میرے
لب سے پھر اپنے وہ لب کیونکہ ملانے دے مجھے

اور بھی وار لگاتے اوسے کیا لگتا ہے
جو کہ زخموں پہ نہ مرہم بھی لگانے دے مجھے

انگلیاں پاؤں کی اپنی جو وہ دبوائے ہے
کچھ تو اے پاسِ ادب ہاتھ بڑھانے دے مجھے

غیر پاس اوس کے نہ دوں بیٹھنے جی میں ہے دلا
ضبط کر ضبط ورنہ ضبط بٹھانے دے مجھے

نہ رہا وہ بھی مزہ ہائے فلک سے وہ عدو
کہ نہ رنجش کا بھی کچھ لطف اوٹھانے دے مجھے

اپنا منت سے بٹھانا وہ اور اوس کا یہ کہنا
پھر نہیں آنے کا یاں میں نہیں جانے دے مجھے

تو بھی پھر پوچھیو جرأت سبب حیرانی
پہلے آئینہ ذرا اس کو دکھانے دے مجھے

○

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسائے ہیں آپ آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

آپ سے میں تو نہ جاتا یہ کروں کیا کہ کہیں
دل بیتاب لیے جائے ہے دوڑائے ہوئے

گھر میں بے یار ہے مشکل اپنی یہ دل کے ہمراہ
دو گنہ گار رہوں جوں قید میں بٹھلائے ہوئے

آئے تم دست بہ قبضہ ہو تو پھر دیر ہے کیا
سرِ تسلیم کو ہم بیٹھے ہیں نہوڑائے ہوئے

آج بھی اوس کے جو آنے کی نہ ٹھہری تو بس آہ
ہم وہ کر بیٹھیں گے جو دل میں ہیں ٹھہرائے ہوئے

پیرہن چاک ترے در پہ جو کل کرتا تھا
آج لوگ اوس کو لیے جاتے ہیں کفنائے ہوئے

مردنی پھر گئی منہ پر مرے جن کی خاطر
رنگ رو کیا وہ پڑے پھرتے ہیں چمکائے ہوئے

ابرِ تصویر کے مانند ہم اوس محفل میں
رو نہیں سکتے ہیں اشک آنکھوں میں ہیں لائے ہوئے

لوگ گو ہم سے یہ کہتے ہیں کہ چلتے ہو جی واں
اپنے بیگانے سب اوس بزم میں ہیں آئے ہوئے

دل میں ہم سوچ کے اس بات کو رو دیتے ہیں
کیا کہیں ان سے کہ ہیں ہم تو بلوائے ہوئے

کر کے موزوں اور بھی جرأت غزل ایک اور بھی رکھ
دل میں جو تازہ مضامین ہیں ٹھہرائے ہوئے

نہ تنہا دل خرامِ ناز پر ہر آن لوٹے ہے
ترا دامن بھی قدموں پر ترے اے جان لوٹے ہے

گیا ہے چھوڑ کر تو جس کو اے آبادیٔ عالم
وہ مضطر کیا درونِ خانۂ ویران لوٹے ہے

کرے ہے چاندنی کی سیر جب وہ بیٹھ کشتی میں
تو کیا کیا موج پر عکسِ مہِ تابان لوٹے ہے

دیا یہ خانۂ قاتل میں کس بے چین کو جانے
جو در پر مثلِ بسمل سا پڑا دربان لوٹے ہے

گرے ہے جب کہ تیرے مضطرب کے چشم سے آنسو
تو کیا کیا خاک پر جوں گوہرِ غلطان لوٹے ہے

چھپاتا ہے گلِ نرگس سے تو جو اپنے مکھڑے کو
تری اس بات پر کیا کیا ترا حیران لوٹے ہے

سرود اب طرز اوس مطرب بچے کا رقص لاتا ہے
کہ ہر اک جھلکی سے اوس کی سن کے تان لوٹے ہے

خفا مجھ سے نہ ہو گر لوٹ جاؤں تیرے قدموں پر
کروں میں کیا کہ تجھ پر دل مرا اے جان لوٹے ہے

کرے گا کام آخر اب وہ پاجامہ تمامی کا
کہ اک بجلی سی چلنے میں تہِ دامان لوٹے ہے

تصور میں جو دل کے زاغ کا اوس کی ہے لڑنا
تو اک چھاتی پہ اس کی سانپ سا ہر آن لوٹے ہے

اور آتا ہے جو سونا یاد بام و بسترِ گل پر
تو ساری رات انگاروں پہ دے دے جان لوٹے ہے

کہے اشعار بیتابی کے تو نے ایسے اے جرأت
کہ پڑھ کر ہر سخنداں اب ترا دیوان لوٹے ہے

دل میں کیا کیا آئے ہے بات اور کیا کیا جائے ہے
کان میں آواز اوس کی سی جوں ہی آ جائے ہے

بسترِ اندوہ پر جب یاد آتے ہیں وہ عیش
پھر نہ لیٹا جائے ہے مجھ سے نہ بیٹھا جائے ہے

بزم میں آنکھوں تلے پھر جائے ہے جب اوس کی شکل
آنکھ بھر کر پھر کسو سے کس کو دیکھا جائے ہے

چھیڑنے کو مجھ سے یہ آزردہ وہ ہوتا نہیں
وقتِ رنجش تو بھلا کیوں مسکرایا جائے ہے

کیا ہجومِ بد گمانی گھیر لیتا ہے مجھے
جب یہ سنتا ہوں کہیں گھر سے وہ تنہا جائے ہے

بس دلِ عشاق پر بجلی سی پڑ جاتی ہے آہ
جب سمندِ ناز کو اپنے وہ چمکا جائے ہے

دیکھ کر تصویر اوس کی ہو گیا تصویر میں
اب نہ دست و پا ہی ہلتے ہیں نہ بولا جائے ہے

بیٹھے یاں مت بیچ بن تو لو خبر عاشق کی تم
زندگی کا اوس کی واں نقشہ تو بگڑا جائے ہے

لے گیا اک راہ چلتا دین و دل صبر و قرار
اب وہ یاد آتا ہے تو بس جی ہی نکلا جائے ہے

کیا کہوں اے ہم نشیں اپنی تو وہ حالت ہوئی
جوں کسی کا قافلہ رستہ میں لوٹا جائے ہے

اشکِ خونی دیکھ چہرے پر مرے بولا وہ شوخ
دن بدن رنگ اب تو جرأت کا چمکتا جائے ہے

انشاؔ

○

اے عشق! مجھے شاہدِ اصلی کو دکھا لا
قُم! خذ بیدی وفقک اللہ تعالیٰ

ہے تجھ کو جنوں کی قسم اے جذبِ محبت
اس نورِ تجلّی کی جھلک مجھ کو دکھا لا

سوجھے ہے مجھے عالمِ اطلاق کی منزل
الفت نے جو تقلید کے جھگڑے سے نکالا

ہر چند کہ عاصی ہوں، پہ اُمّت ہیں ہوں اس کی
جس کا ہے قدم عرشِ معلّیٰ سے بھی بالا

مولائے جہاں، رہبرِ عشاق، محمدؐ
صد عقدۂ مشکل کا مرے کھولنے والا

○

جگر کی آگ بجھے جس سے، جلد وہ شے لا
لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا

قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں، اُٹھ کہیں گھر چل
خدا کے واسطے! اتنے تو پاؤں مت پھیلا

نکل کے وادیِ وحشت سے دیکھ اے مجنوں!
کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلیٰ!

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا

نزاکت اس کے یہ مکھڑے کی دیکھ اے انشاؔ
نسیمِ صبح جو چھو جائے، رنگ ہو میلا

○

اچھا جو خفا ہم سے ہو تم اے صنم اچھا
لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا

مشغول کیا چاہیے اس دل کو کسی طور
لے لیویں گے ڈھونڈ اور کوئی یار ہم اچھا

گرمی نے کچھ آگ اور ہی سینے میں لگا دی
ہر طور غرض آپ سے ملنا ہے کم اچھا

اغیار سے کرتے ہو مرے سامنے باتیں
مجھ پر یہ لگے کرنے نیا تم ستم اچھا

کہہ کر گئے: آتا ہوں کوئی دم میں میں تم پاس
پھر دے چلے کل کی سی طرح مجھ کو دم اچھا

اس ہستیِ موہوم سے میں تنگ ہوں انشا
واللہ کہ اس سے بمراتب عدم اچھا

○

اے آتشِ فراق! امراب جلیے سوزِ داغ
جھلکے ہے دل میں دور سے جوں دیر کا چراغ

آنکھوں میں تا کہ نشۂ وحدت کا ہو طلوع
ساقی! اُمنڈے مےخانہ سے بھر دے مرا ایاغ

بیٹھا ہے آج مجلسِ زنداں میں شیخ یوں
طوطی کے پاس جیسے کوئی ہم قفس ہو زاغ

پیدا لگاوٹ آہ کسی ساتھ کیجیے
لیکن دل و دماغ کہاں کس کو یہ فراغ

پہنچوں میں کس کی کُنہِ حقیقت کو آج تک
انشا مجھے ملا نہیں اپنا ہی کچھ سراغ

ل مجھ سے اے پری! تجھے انسان کی قسم
دیتا ہوں تجھ کو تختِ سلیمانؑ کی قسم!

کرّوبیاں کی تجھ کو قسم اور عرش کی
جبریلؑ کی قسم! تجھے رضوان کی قسم!

طوبیٰ کی، سلسبیل کی، کوثر کے جام کی
حور و قصور و جنّت و غلمان کی قسم!

روح القدس کی تجھ کو قسم اور مسیحؑ کی
مریم کی تجھ کو عفّتِ داماں کی قسم!

تجھ کو محمدِ عربی کی قسم ہے اور
مولا علیؑ کی، شاہِ خراساں کی قسم!

توریت کی قسم! قسم انجیل کی تجھے
تجھ کو قسم زبور کی، فرقان کی قسم!

ملّت میں جس کی تو ہے اسی کی قسم تجھے
اور اپنے دین و مذہبِ ایمان کی قسم!

دامن کو تیرے ہاتھ سے اس رات مت جھٹک
تجھ کو سحر کے چاک گریبان کی قسم!

مدّت سے تیرے چاہِ ذقن میں غریق ہوں
باللہ! تجھ کو یوسفِ کنعان کی قسم!

قیدی ہوں میں ترا، بہ خداوندیِ خدا
اور اس عزیزِ مصر کے زندان کی قسم!

موسیٰ کی ہے تجھے قسم اور کوہِ طور کی
نور و فروغ و جلوۂ لمعان کی قسم!

سوگند اب مسیحی کی تجھ کو دلائیے
سن تجھ کو اپنے ناز کی اور آن کی قسم!

تجھ کو قسم ہے غنچۂ زنبق کی، تاک کی
اور شورِ خندۂ لبِ غزلخواں کی قسم!

سونے کی گاگرے کی قسم اور رودِ نیل کی
فرعون کی قسم تجھے ہامان کی قسم!

بستر مرا ہے خارِ مغیلانِ بیابانِ قیس
لیلیٰ کی ہے تجھے صفِ مژگان کی قسم!

ایسی بڑی قسم بھی نہ مانے تو ہے تجھے
مجنوں کے قبلہ گاہ، ابوالجان کی قسم!

کونے میں باغ کے جو وہ رہتا ہے اک خبیث
تجھ کو اسی کی شوکتِ ذی شان کی قسم!

دیوِ سفید کی قسم اور کوہِ قاف کی
باغِ ارم کی اور پرستان کی قسم!

لونا چماری کی قسم اور کلوا اہیر کی
کالی بلا کی، غولِ بیابان کی قسم!

قسمیں تو ساری ہو چکیں باقی رہی ہے ایک
چیلا تلے کے جھٹنے کی، شیطان کی قسم!

ہاں پھر تو کہیو! ہائے وہ کس طرح ہو غضب
انشا نہ چھیڑ! تجھ کو مری جان کی قسم!

○

دھوم اتنی ترے دیوانے مچا سکتے ہیں
کہ ابھی عرش کو چاہیں تو ہلا سکتے ہیں

مجھ سے اغیار کوئی آنکھ ملا سکتے ہیں
منہ تو دیکھو وہ مرے سامنے آ سکتے ہیں

حضرتِ دل تو بگاڑ آئے ہیں اس سے لیکن
اب بھی ہم چاہیں تو پھر بات بنا سکتے ہیں

شیخی اتنی نہ کر اے شیخ! کہ رندانِ جہاں
انگلیوں پہ تجھے چاہیں تو نچا سکتے ہیں

تو گروہِ فقرا کو نہ سمجھ بے جبروت
ذاتِ مولا میں یہی لوگ سما سکتے ہیں

چارہ گر اپنے تو معروف بدل ہیں لیکن
کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتے ہیں

○

جوں صبا اڑ جائیں اور تیری بہاریں لوٹ جائیں
تجھ کو جو گھوریں الٰہی! ان کے دیدے پھوٹ جائیں

ان سے کیا کوئی بر آوے، جو ذرا سی بات پر
آگ ہی ہو کر اٹھیں اور اپنے ماتھے کوٹ جائیں

"در بلا بودن بہ از بیم بلا" مشہور ہے
کاش! جو ہونی ہو جلدی ہو، بلا سے چھوٹ جائیں

بزمِ خوباں میں نہ انشا ایک سے آنکھیں لڑا
خاطریں نازک بہت ان کی ہیں، شاید ٹوٹ جائیں

○

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار، بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شے ہے
یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

○

ضعف آتا ہے، دل کو تھام تو لو
بولیو مت، مگر سلام تو لو

کون کہتا ہے بولو، مت بولو
ہاتھ سے میرے ایک جام تو لو

انھیں باتوں پہ لوٹتا ہوں میں
گالی پھر دے کے میرا نام تو لو

یک نگہ پر بکے ہے انشا آج
مفت میں مول اک غلام تو لو

○

یہ چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو
بات میں تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

تم کہو گے جسے کچھ کیوں نہ کہے گا تم کو
چھوڑ دیوے گا بھلا دیکھ تو لو اور سنو

یہی انصاف ہے کچھ سوچو تو دل میں اپنے
تم تو سو کہہ لو مری اک نہ سنو اور سنو

آپ ہی آپ مجھے چھیڑ دو، رکو پھر آپ ہی
آپ ہی بات میں پھر روٹھ اٹھو اور سنو

آفریں تم پہ، یہی چاہیے شاباش تمہیں
دیکھ روتا مجھے یوں ہنسنے لگو اور سنو

بات میری نہیں سنتے، جو اکیلے مل گئے
ایسے ہی ڈھب سے سناؤں کہ سنو اور سنو

نظیر اکبر آبادی

○

ملا آج وہ مجھ کو چنچل چھبیلا
ہوا رنگ سن کر رقیبوں کا نیلا

لیا جس نے مجھ سے عداوت کا پنجہ
سنلقی علیھم عذاباً ثقیلا!

نکل اس کی زلفوں کے کوچے سے اے دل
تو پڑھنا: قم اللیل الا قلیلا

کہتاں میں ہاروں اگر آہ کا دم
وکانت جبالاً کثیباً مھیلا

نظیر اس کے فضل و کرم پر نظر رکھ!
فقل: حسبی اللہ نعم الوکیلا

○

نظر پڑا اک بُت پری وش، نرالی سج دھج، نئی ادا کا
جو عمر دیکھو، تو دس برس کی، پہ قہر آفت، غضب خدا کا
جو شکل دیکھو، تو بھولی بھولی جو باتیں سنئے، تو میٹھی میٹھی
پہ دل وہ پتھر کہ سر اڑا دے، جو نام لیجے کبھی وفا کا
جو گھر سے نکلے تو یہ قیامت کہ چلتے چلتے قدم قدم پر
کسی کو ٹھوکر، کسی کو جھڑکی، کسی کو گالی، نپٹ لڑا کا
یہ راہ چلتے میں چلبلاہٹ کہ دل کہیں ہے، نظر کہیں ہے
کہاں کا اونچا، کہاں کا نیچا، خیال کس کو، قدم کی جا کا
لڑا دے آنکھیں وہ بے حجابی کہ پھر پلک سے پلک نہ مارے
نظر جو نیچی کرے، تو گویا کھلا سراپا چمن حیا کا
یہ جھنجلاہٹ، یہ چلبلاہٹ، خبر نہ سر کی، نہ تن کی شدھ بدھ
جو چیرا بکھرا، بلا سے بکھرا، نہ بند باندھا کبھو قبا کا
گلے لپٹنے میں یہ شتابی کہ مثل بجلی کے اضطرابی
کہیں جو چمکا، چمک چمک کر، کہیں جو لپکا، تو پھر چھپا کا
نہ وہ سنبھالا کسی کے سنبھلے، نہ وہ منایا منے کسی کے
جو قتل عاشق پہ آ کے مچلے، تو غیر کا پھر نہ آشنا کا
نظیر ہٹ جا، پرے سرک جا، بدل لے صورت، چھپا لے منہ کو
جو دیکھ لیوے گا وہ ستم گر، تو یار ہو گا ابھی خفا کا

○

کلالِ گردوں اگر جہاں میں، جو خاک میری کو جام کرتا
تو میں صنم کے لبوں سے مل کر، عجب یہ عیشِ مدام کرتا

جو پاتا لذت یہ ساں مستاں، مئے محبت سے تیری زاہد
تو صومعے سے نکل کے اپنے، وہ میکدے میں قیام کرتا

وہ بزم اپنی ہے مے کشی کی، وہ سیر ہو جاتے مست بیخود
جو شیخ جی واں سے بچ کے آتے، تو میں بھی جھک کے سلام کرتا

جو زلفیں مکھڑے پہ کھول دیتا صنم ہمارا، تو پھر یہ گردوں
نہ دن دکھاتا، نہ شب بتاتا، نہ صبح لاتا، نہ شام کرتا

نظیر آخر کو ہار کر میں گلی میں اس کی گیا تھا بکنے
تماشا ہوتا جو مجھ کو لے کر، وہ شوخ اپنا غلام کرتا

○

کبھو دیکھوں نہ سنبلِ باغ کو میں، مجھے اس خمِ زلفِ دوتا کی قسم
نہ نگہ کروں عارضِ گل کی طرف، مجھے اس رخِ مہر و وفا کی قسم

یوں پھرے ہے چمن کی فضا میں صبا، وہ ہزار طرح سے ہو نافہ کش
مرے دل کو نہ ہو کبھی اس کی ہوا، مجھے کوچۂ صنم کی ہوا کی قسم

جو نہی آیا ادھر کو وہ چشمِ سیہ، وہیں لے گیا دل کو بہ سیرِ نگہ
رہی عقل و خرد کو نہ جی میں جگہ، مجھے اس بتِ ہوش ربا کی قسم

بدن اس کا ہے روکشِ برگِ سمن، مرے بر میں جو آوے وہ رشکِ چمن
کھلے غنچۂ دل مرا گل کے نمن، مجھے اس گلِ بندِ قبا کی قسم

لگی مہندی جو ہاتھوں میں اس کے میاں، تو وہ سرخی کچھ ایسی ہے لالہ فشاں
وہ شفق جو کہ صبح کو ہووے عیاں، سو وہ کھاتی ہے اس کی حنا کی قسم

میں نے دیکھا نظیر جو اس کے تئیں، تو وہ شرم سے ہو گیا سرو قریں
لیا نیچی نگاہوں سے جاں دل و دیں، میں کہوں کیا اب اس کی حیا کی قسم

○

دُور سے آئے تھے ساقی، سُن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس! پیمانے کو ہم

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے، ساقی نہیں
دل میں آتا ہے لگا دیں آگ مے خانے کو ہم

ہم کو پھنسنا تھا قفس میں، کیا گلہ صیاد کا
بس ترستے ہی رہے ہیں آب اور دانے کو ہم

طاقِ ابرو میں صنم کے، کیا خدائی رہ گئی؟
اب تو پوجیں گے اُسی کافر کے بُت خانے کو ہم

باغ میں لگتا نہیں، صحرا سے گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

کیا ہوئی تقصیر ہم سے، تو بتا دے اے نظیرؔ!
تاکہ شادی مرگ سمجھیں ایسے مر جانے کو ہم

○

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشکِ چمن
گل رخ و گل گوں قبا و گل عذار و گل بدن

مہر طلعت، حور پیکر، مشتری رُو، مہ جبیں
سیم بر، سیماب طبع و سیم ساق و سیم تن

نازنیں، ناز آفریں، نازک بدن، نازک کمر
غنچہ لب، رنگیں ادا، شکر دہاں، شیریں سخن

زلف و کاکل، خال و ابرو کے ہیں یہ چاروں غلام
مشکِ تبت، مشکِ چیں، مشکِ خطا، مشکِ ختن

مبتلا ایسوں کے جو ہوتے ہیں سو ہیں اے نظیرؔ
بے قرار و دل فگار و خستہ جان و بے وطن

○

لیتا ہے جان میری تو میں سر بہ دست ہوں
اے یار! میں تو کشتۂ روزِ الست ہوں

یک دم کی زندگی کے لئے مت اُٹھا مجھے
اے بے خبر! میں نقشِ زمیں کا نشست ہوں

تو مست کر، شراب سے اے گُل بدن مجھے
میں آپ اپنے شیشۂ دل کا شکست ہوں

دُور از طریق مجھ کو سمجھنا نہ زاہدا!
گر تو خدا پرست ہے، میں بُت پرست ہوں

○

کیوں نہ ہو بام پہ وہ جلوہ نما تیسرے دن
ماہ بھی چھپ کے نکلتا ہے ولا تیسرے دن

ہاتھ سے اب تو قلم رشکِ مسیحا، رکھ دے
نسخے بدلے ہیں جہاں کے حکما تیسرے دن

غرقِ دریائے محبت کی نہیں ملتی لاش
ورنہ ڈوبا ہُوا نکلے ہے سدا تیسرے دن

دل بیمار رہے عشق میں کیوں کر سرسبز
خاک سے دانے کو ہے نشو و نما تیسرے دن

چھوڑ مت زلف کے مارے کو تو دریا میں ہنوز
سانپ کے کاٹے کو دیتے ہیں بہا تیسرے دن

تین دن چشم کے بیمار کا کر اپنے علاج
ہوتی معلوم ہے تاثیرِ دوا تیسرے دن

لوگ کہتے ہیں کہ ہیں پُھول ترے کُشتے کے
مہندی ہاتھوں میں تو قاتل نہ لگا تیسرے دن

عمر یک ہفتہ نہیں باغ میں اے گل! مت بھول
رنگ بدلے ہے زمانے کی ہوا تیسرے دن

چار حرف اس بتِ پُرخوں کے اُپر بھیج نظیرؔ
آپ سے آپ جو ہو جائے شفا تیسرے دن

○

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو
یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

جدا جو ہم کو کرے اس صنم کے کوچہ سے
الٰہی! راہ میں ایسا کوئی رقیب نہ ہو

علاج کیا کریں حکما، تپِ جدائی کا
سوائے وصل کے اس کا کوئی طبیب نہ ہو

نظیرؔ اپنا تو معشوق خوب صورت ہے
جو حسن اس میں ہے ایسا کوئی عجیب نہ ہو

○

تاب اس کے دیکھنے کی نہ لائے، چلے گئے
کیا کیا بڑے جوان بنے آئے، چلے گئے

دارا رہا، نہ جم، نہ سکندر سا بادشاہ
تختِ زمیں پہ سینکڑوں آئے، چلے گئے

آدم رہا، نہ کوئی پیمبر رہا یہاں
وہ بھی اسی زمیں میں سمائے، چلے گئے

عالم تھا یہ زلیخا کا یوسف کی چاہ میں
رقعے ہزاروں بیاہ کے آئے چلے گئے

میرزا غالب

○

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما
کام گر رک گیا، روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

○

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا، یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

وہ فراق، اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا
شورِ سودائے خطّ و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں، گرہ میں مال کہاں؟

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

○

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہو ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

○

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی!
جس کو ہو دین و دل عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

○

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
نیند آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

○

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش! پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ق

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے، وفا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا، دعا کیا ہے

ہاں! بھلا کر! ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

○

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو اگر برا کہے کوئی
نہ کہو! گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

○

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس — مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں، بخونِ دل — سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

مومن

○

مرے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب
ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا

ہنسے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر
سبک ہے وہ کہ تری طبع پر گراں نہ ہوا

دیت میں روزِ جزا لے رہیں گے قاتل کو
ہمارا جان کے جانے میں بھی زیاں نہ ہوا

وہ آئے بہرِ عیادت تو تھا میں شادیِ مرگ
کسی سے چارۂ بیدادِ آسماں نہ ہوا

لگی نہیں ہے یہ چپ لذتِ ستم سے کہ میں
حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

دمِ حساب رہا روزِ حشر بھی یہی ذکر
ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

ہے شرط ہم پہ عنایت میں گو نہ گو نہ ستم
کبھی محبتِ دشمن کا امتحاں نہ ہوا

وہ حالِ زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی
تمہارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

امیدِ وعدۂ دیدار حشر پر مومن
تو بے مزہ تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا

○

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج، راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رکے تو رکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

رحم کر خصمِ جانِ غیر نہ ہو
سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرضِ مضطر اے مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

○

روٗیا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

مر چُک کہیں کہ اس غمِ ہجراں سے چھوٹ جائے
کہتے تو ہیں بھلے کی، ولیکن بُری طرح

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی
قربان تیرے! پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے
آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجیے! ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

ہوں جاں بلب بتانِ ستم گر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

○

قہر ہے، موت ہے، قضا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بُری بلا ہے عشق!

اثرِ غم ذرا بتا دینا
وہ بہت پوچھتے ہیں: کیا ہے عشق؟

آفتِ جاں ہے کوئی پردہ نشیں
کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

بوالہوس اور لافِ جاں بازی
کھیل ہی کیا سمجھ لیا ہے عشق

سُوجھے کیوں کر فریبِ دل داری
دشمنِ آشنا نما ہے عشق!

کس ملاحت سرشت کو چاہا
تلخ کامی پہ بامزا ہے عشق

ہم کو ترجیح تم پہ ہے یعنی
دل رُبا حسن و جاں رُبا ہے عشق

دیکھیے! کس جگہ ڈبو دے گا
میری کشتی کا ناخدا ہے عشق

وصل میں احتمالِ شادیِ مرگ
چارہ گر! درد بے دوا ہے عشق

اب تو دل! عشق کا مزہ چکھا
ہم نہ کہتے تھے کیوں بُرا ہے عشق

آپ مجھ سے نباہیں گے، سچ ہے
با وفا حسن، بے وفا ہے عشق

قیس و فرہاد و وامق و مومن
مر گئے سب ہی کیا وبا ہے عشق

○

اب اور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع بجھے جلائیں گے ہم

برباد نہ جائے گی کدورت
کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم

دل دے کے اک اور لالہ رو کو
ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم

لب کا ترے دعویٔ مسیحی
مرادر پہ آزمائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو
منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم

گر خواب میں آن کر جگایا
سوتے مُردے جگائیں گے ہم

آتا ہے گلے سے دھیان تیرے
خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم

بت خانہ یہیں ہو گو ترا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

○

کہتے ہو تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

آنکھ اس کی پھر گئی تھی، دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا، انقلاب میں!

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے
اب عذر کیا رہا نگہِ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکامیاب میں

ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں
پیری میں یاس ہے، جو ہوس تھی شباب میں

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش!
وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

تقدیر بھی بری مری، تدبیر بھی بری
بگڑے وہ پرسشِ سببِ اجتناب میں

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں

پیہم سجود، پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو، تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم، تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی
تو کہا کہ جانے مری بلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں، عذرِ جفا کے ساتھ

بہر عیادت آئے وہ، لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا، آوازِ پا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

وہ لالہ رو گیا نہ ہو گلگشتِ باغ کو
کچھ رنگ بوئے گل کے عوض ہے صبا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں؟ یہ تو کچھ باغِ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

آتی ہے بوئے داغ، شبِ تارِ ہجر میں
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو، قبا کے ساتھ

تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش، یہ خبر نہ تھی
ہے اپنی زندگانی اسی بے وفا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی، بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

ناوکِ انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

تابِ نظارہ نہیں، آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا! بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے

چاکِ پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں!
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی، وہ ہی سر و داغِ جنوں
وہی ہم ہوں گے، وہی دشت و بیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

○

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

اس پری وش سے لگاتے ہیں مجھے
لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

یا رب! ان کا بھی جنازہ اٹھے
یار اس کو سے اٹھاتے ہیں مجھے

بے وفائی کا عدو کی ہے گلا
لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے

حیرتِ حسن سے یہ شکل بنی!
کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

پھونک دے آتشِ دل، داغ مرے
اس کی خو یاد دلاتے ہیں مجھے

گر کہے غمزہ کہ قتل کر دوں
تو اشارت سے بتاتے ہیں مجھے

میں تو اس زلف کی بو پر غش ہوں
چارہ گر مشک سنگھاتے ہیں مجھے

شعلہ رو کہتے ہیں اغیار کو وہ
اپنے نزدیک جلاتے ہیں مجھے

جاں گئی، پر نہ گئی جور کشی
بعدِ مردن بھی دباتے ہیں مجھے

وہ جو کہتے ہیں تجھے آگ لگے
مژدۂ وصل سناتے ہیں مجھے

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں
تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

مومن اور دیر، خدا خیر کرے
طورِ بد ڈھب نظر آتے ہیں مجھے

ذوقؔ

○

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا، تو کھوج اپنا نہ پایا

مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم
کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا

احاطے سے فلک کے ہم تو باہر
نکل جاتے، مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا، کسی کے ساتھ دیکھا
کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

کہے کیا ہائے زخمِ دل ہمارا
دہن پایا، لبِ گویا نہ پایا

کبھی تو، اور کبھی بیزار رہا غم
غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوقؔ
کہیں ایسا نہ پائے گا، نہ پایا

○

کسی بے کس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو، اس کو گر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو، جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا، ہمیشہ قول دے دے کر
جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگینِ خسرو پر بھی ضرب اے کوہکن پہنچا
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے پر
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا، یا چشمِ بدبیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

○

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینے میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا روکا اپنے گریہ کو ہم نے کہ لگ گئی!
پھر وہ ہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

کوئی گھڑی اگر وہ ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

کہتا رہا کچھ اُن سے عدو دو گھڑی تلک!
غماز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے
ساری وہ شیخی اُن کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

○

ہاں! ناتمل دمِ ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

گل پریشان ہوا ہنس کے چمن میں آخر!
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے ہے کسی مے خوار کا دل
محتسب دیکھ نہ کر دل شکنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب مگر
تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

خلش خار کا کھٹکا ہے بغل میں موجود
دیکھ اے گل یہ دعویٰ نازک بدنی خوب نہیں

○

رندِ خراب حال کو، زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں
دے گا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ تو

اے زاہدِ دو رنگ نہ پیر آپ کو بنا
مانندِ صبحِ کاذب ابھی ہے ادھیڑ تو

اس صیدِ مضطرب کو تامل سے ذبح کر
داماں و آستیں نہ لہو میں لتھیڑ تو

آوارگی سے کوئے محبت کی ہاتھ اٹھا
اے ذوق یہ اٹھا نہ سکے گا کھکھیڑ تو

○

تیز اس نے جو کی تیغِ ستم اور زیادہ
مشتاقِ شہادت ہوئے ہم اور زیادہ

کچھ کی رقمِ شوق نے تاثیر جو پیدا
اٹھنے لگا قاصد کا قدم اور زیادہ

دشمن کی نہ جا سیدھی نگاہوں پہ کہ جوں تیغ
سیدھی ہے تو اک اس میں ہے دم اور زیادہ

ہے نکہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے تجھ بن
آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ

جو کچھ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر انہیں کم اور زیادہ

○

ترے کوچے کو وہ بیمارِ غم دارالشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

وہی کچھ تلخ کام اس زندگانی کا مزا سمجھے
کہ جو زہرابِ تیغِ یار کو آبِ بقا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

تجھے اے سنگ دل! آرامِ جانِ مبتلا سمجھے
پڑیں پتھر سمجھ پر ایسی، ہم سمجھے تو کیا سمجھے

حساب اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا
حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دل رُبا سمجھے

محبت سے ذرا گر موم ہو اس دل شکن کا دل
دلِ اشکستہ میرا اپنے حق میں مومیا سمجھے

عدو آیا ہے بن کر نامہ بر، لکھا نصیبوں کا!
کریں گے لے کے خط کیا؟ مدعی سے مدعا سمجھے

کشادِ کار ہم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا!
خرد کے تیز ناخن، ناخنِ انگشتِ پا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوقؔ اس کی
کوئی جانے تو کیا جانے، کوئی سمجھے، تو کیا سمجھے

○

خوب رو کا شکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے

کہتے کیا کیا ہیں دیکھ تو اغیار
یار! تیری حمایتوں سے مجھے

واجب القتل اُس نے ٹھہرایا
آیتوں سے، روایتوں سے مجھے

سمجھے ہے واجب الرعایت دوست
دشمنوں کی رعایتوں سے مجھے

کر نہ گریے میں تو کمی اے چشم!
شوق کم ہے کفایتوں سے مجھے

○

الٰہی! کس بے گنہ کو مارا، سمجھ کے قاتل نے کُشتنی ہے
کہ آج کوچے میں شور اس کے بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ہے

زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے سے صاف اظہارِ روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر اُن کا فروغ، اُن کی فروتنی ہے

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا، یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

ہوئے ہیں تر گرچہ یہ ندامت سے اس قدر آستین و دامن
کہ میری تردامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر، وہ مفلسی میں بھی ہے تواں گر
جہاں میں مانندِ کیمیاگر، ہمیشہ محتاج دل غنی ہے

کوئی ہے کافر کوئی مسلماں، جدا ہے ہر اک کی راہِ ایماں
جو اس کے نزدیک رہ بری ہے وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

○

ابرِ تر، آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برقِ مضطر، تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

خط میں لکھوا کر انھیں بھیجا تو مطلع وِرد کا!
دردِ دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی، گر پڑے ہم آپ سے
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واں ہلے ابرو، یہاں گردن پہ پھیری ہم نے تیغ
بات کا ایما بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

سن کے آمد ان کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہم نے پہلے ہی کہا تھا، تو کرے گا ہم کو قتل
تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوق! ہیں جوں مردمک ہم رو سیاہ
لیک آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

بہادر شاہ ظفر

○

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خرد مند بنایا، نہ بنایا ہوتا

خاکساری کے لیے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش اِ خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

تھا جلانا ہی اگر دوریٔ ساقی سے مجھے
تو چراغِ درِ مے خانہ بنایا ہوتا

شعلۂ حسن چمن میں نہ دکھایا اس نے
ورنہ بلبل کو بھی پروانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

○

دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا، وہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہے پردہ میں اب نہ وہ پردہ نشیں، کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ترے رخ کے خیال میں کون سے دن اٹھے مجھ پہ نہ فتنۂ روزِ جزا
تری زلف کے دھیان میں کون سی شب مرے سر پہ ہجومِ بلا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں تو کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

کئی روز میں آج وہ ماہ لقا ہوا میرے جو سامنے جلوہ نما
مجھے صبر و قرار ذرا نہ رہا، اسے پاسِ حجاب و حیا نہ رہا

ترے خنجر و تیغ کی آبِ رواں ہوئی جبکہ سبیلِ ستم زدگاں
گئے کتنے ہی قافلے خشک زباں، کوئی تشنۂ آبِ بقا نہ رہا

مجھے صاف بتائے نگار اگر تو یہ پوچھوں میں رو رو خونِ جگر
ملے پاؤں سے کس کے ہیں دیدۂ تر، کفِ پا پہ جو رنگِ حنا نہ رہا

اسے چاہا تھا میں نے کہ روک رکھوں مری جان بھی جائے تو جانے نہ دوں
کیے لاکھ فریب کروڑ فسوں، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا، نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دو دم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

○

کسی نے اس کو سمجھایا تو ہوتا
کوئی یاں تک اُسے لایا تو ہوتا

مزا رکھتا ہے زخمِ خنجرِ عشق
کبھی اے بوالہوس کھایا تو ہوتا

یہ نخلِ آہ ہوتا بید ہی کاش
نہ ہوتا گو ثمر، سایا تو ہوتا

جو کچھ ہوتا سو ہوتا تو نے تقدیر
وہاں تک مجھ کو پہنچایا تو ہوتا

کیا کس جرم پر تو نے مجھے قتل
ذرا تو دل میں شرمایا تو ہوتا

دل اس کی زلف میں الجھا ہے کب سے
ظفر اک روز سلجھایا تو ہوتا

○

نہ ہرگز دردِ دل سے میں کراہا
غرض پوشیدہ الفت کو نباہا

محبت کے یہ معنی ہیں کہ میں نے
وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا

فقیروں سے نہ پوچھو لذتِ عشق
اہاہاہا! اہاہاہا!! اہاہا!!!

صَرَفْتُ الْعُمُرُ فِی لَهْوٍ وَلَعِبٍ
فَآهاً! ثُمَّ آهاً! ثُمَّ آها

ظفر کو باز رکھ اعمالِ بد سے
خطا بخشا! کرم گارا! الٰہا!

○

یار تھا، گلزار تھا، مے تھی، فضا تھی، میں نہ تھا
لائقِ پابوسِ جاناں، کیا حنا تھی، میں نہ تھا

ہاتھ کیوں باندھے مرے، چھلا اگر چوری گیا
یہ سراپا شوخیٔ دزدِ حنا تھی، میں نہ تھا

بے خودی میں لے لیا بوسہ، خطا کیجے معاف
یہ دلِ بے تاب کی ساری خطا تھی، میں نہ تھا

ہائے ساقی! یہ ہو ساماں اور عاشق واں نہ ہو
یار تھا، سبزہ تھا، بدلی تھی، ہوا تھی، میں نہ تھا

میں سسکتا رہ گیا اور مر گئے فرہاد و قیس
کیا انھیں دونوں کے حصے میں قضا تھی، میں نہ تھا؟

میں نے پوچھا کیا ہوا وہ آپ کا حسن و شباب
ہنس کے بولا وہ صنم، شانِ خدا تھی، میں نہ تھا

اے ظفر یہ دل پہ میرے داغ کیسا رہ گیا
خانۂ باغِ یار میں خلقِ خدا تھی، میں نہ تھا

○

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

مجھے دفن کرنا تو جس گھڑی، تو یہ اس سے کہنا کہ اے پری
وہ جو تیرا عاشقِ زار تھا، تہِ خاک اس کو دبا دیا

دمِ غسل سے مرے پیشتر اسے ہمدموں نے یہ سوچ کر
کہیں جاوے اس کا نہ دل دہل، مری لاش پر سے ہٹا دیا

مری آنکھ جھپکی تھی ایک پل، مرے دل نے چاہا کہ اٹھ کے چل
دلِ بے قرار نے او میاں! وہیں چٹکی لے کے جگا دیا

میں نے دل دیا، میں نے جان دی، مگر آہ تو نے نہ قدر کی
کسی بات کو جو کبھی کہا، اسے چٹکیوں میں اڑا دیا

○

جلایا آپ ہم نے ضبط کر کے آہِ سوزاں کو
جگر کو، سینے کو، پہلو کو، دل کو، جسم کو، جاں کو

ہمیشہ کنجِ تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں
الم کو، یاس کو، حسرت کو، بیتابی کو، حرماں کو

ترے اندام و روی و قد و زلف و خط سے ہے خجلت
سمن کو، ارغواں کو، سرو کو، سنبل کو، ریحاں کو

جگہ کن کن کو دوں دل میں ترے ہاتھوں سے اے قاتل
کٹاری کو، چھری کو، بانک کو، خنجر کو، پیکاں کو

ترے دندان و لب نے کر دیا بے قدر عالم میں
گہر کو، لعل کو، یاقوت کو، ہیرے کو، مرجاں کو

لڑا کر آنکھ اُس سے ہم نے دشمن کر لیا اپنا
نگہ کو، ناز کو، انداز کو، ابرو کو، مژگاں کو

نہیں قلقل، دعا دیتا ہے شیشہ دم بدم ساقی
سبو کو، خم کو، کوزے کو، کدہ کو، مے پرستاں کو

نہ ہو جب تو ہی اے ساقی! بھلا پھر کیا کرے کوئی
ہوا کو، ابر کو، گل کو، چمن کو، صحنِ بستاں کو

بنا لائے ظفر خالق نے کب انسان سے بہتر
ملک کو، دیو کو، جن کو، پری کو، حور و غلماں کو

○

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد مے خانہ

اسی رشکِ پری پر جان دیتا ہوں میں دیوانہ
ادا جس کی ہے بانکی، ترچھی چتون، چال مستانہ

نبھے کیوں کر مرے اور اس پری پیکر کے یارانہ
وہ بے پروا ہیں سودائی، وہ سنگیں دل ہیں دیوانہ

مجھے آنا ہے کیوں کر تری محفل میں جانانہ
مری صورت فقیرانہ، ترا دربار شاہانہ

غزالِ دشت بولے دیکھ کر مجنوں کی میت کو
یہ وحشی مر گیا بس ہو چکا آباد ویرانہ

ہمارے اور تمھارے عشق کا چرچا ہے شہروں میں
کوئی سنتا نہیں اب لیلیٰ و مجنوں کا افسانہ

گزر یارب! گلستاں میں ہوا ہے کس شرابی کا
کہ شاخیں جھومتی ہیں، نالۂ بلبل ہے مستانہ

ظفر وہ زاہدِ بے درد کی ”ہو حق“ سے بہتر ہے
کرے گر رند دُرد دل سے ہائے و ہوئے مستانہ

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل! کبھی ایسی تو نہ تھی

تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عکسِ رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا
تاب تجھ میں مہِ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفرؔ سے ہر بار
خو تری حورِ شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

○

تری جو پازیب سر کا جھومر، زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر
ہوئے ہیں جلوہ نما چمک کر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

وفورِ اشکوں کا ہے ہمارے نکلتے باتوں میں ہیں شرارے
نہ کیوں کہ ہوں عرش پر نچھاور زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

پھپھولے پاؤں میں ہیں نمایاں تو سر پہ داغِ جنوں فراواں
نہ دیکھیں دیوانے تیرے کیوں کر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

ذرا جبینِ عرق فشاں پہ تو اپنی، افشاں دکھا دے چن کر
کہ تا نظر آویں ماہ پیکر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

ادھر تو فوارے چھوٹتے ہیں ادھر ہیں اشجار پر چراغاں
نئی ہے سیر اک چمن کے اندر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

نہ سبزہ و گل نہ جوششِ شبنم نہ چمکے جگنو ہوا پہ ہر دم
نظر شب آتے تھے مجھ کو یکسر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

زمیں نہایت ہی تھی یہ مشکل ظفرؔ ہے استاد پر وہ کامل
غرض دکھا دی وہی بنا کر زمیں پہ گوہر فلک پہ اختر

شیفتہ

○

جفا و جور کا اس سے گلا کیا — جو پوچھے: مہربانی کیا، وفا کیا
وہ بے پروا جوابِ نامہ لکھتے — خدا جانے کہ دشمن نے لکھا کیا
نہ لکھنا تھا غمِ ناکامیٔ عشق — جوابِ نامۂ بے مدّعا کیا
ہمیں تھا آپ قصدِ عرضِ احوال — جو وہ خود پوچھتے ہیں پوچھنا کیا
ق
کہا کل میں نے اے سرمایۂ ناز! — تلوّن سے ہے تم کو مدّعا کیا
کبھی مجھ پر عتابِ بے سبب کیوں — کبھی بے وجہ غیروں سے وفا کیا
کبھی محفل میں وہ بے باکیاں کیوں — کبھی خلوت میں یہ شرم و حیا کیا
کبھی تمکینِ صولت آفریں کیوں — کبھی الطافِ جرأت آزما کیا
کبھی وہ طعنہ ہائے جاں گزا کیوں — کبھی یہ غمزہ ہائے جاں فزا کیا
کبھی شعروں سے میرے نغمہ سازی — کبھی کہنا کہ یہ تم نے کیا کیا
کبھی بے جرم یہ آزردہ ہونا — کہ کیا طاقت جو پوچھوں ہیں خطا کیا
کبھی اس دشمنی پر بہرِ تسکیں — پئے ہم جلوہ ہائے دل رُبا کیا
یہ سب طول اس نے سن کر بے تکلّف — جواب اک مختصر مجھ کو دیا کیا

ابھی اے شیفتہ واقف نہیں تم
کہ باتیں عشق میں ہوتی ہیں کیا کیا

○

اُٹھے نہ چھوڑ کے ہم آستانِ بادہ فروش
طلسمِ ہوش رُبا ہے دکانِ بادہ فروش

کھلا جو پردۂ روئے حقائقِ اشیا
کھلی حقیقتِ رازِ نہانِ بادہ فروش

فسردہ طینتی و کاہلی سے ہم نے کبھی
شباب میں بھی نہ دیکھی دکانِ بادہ فروش

قدح سے دل ہے مراد اور مے سے عشق غرض
میں وہ نہیں کہ نہ سمجھوں زبانِ بادہ فروش

عجب نہیں کہ کسی روز وہ بھی آ نکلیں
کہ ہے گزرگہِ خلق آستانِ بادہ فروش

مئے سرور کے اسرار آپ آ کر دیکھ
نہ پوچھ مجھ سے کہ ہوں راز دانِ بادہ فروش

شراب دیکھ کہ کس رنگ کی پلاتا ہے
بجز اس کے اور نہیں امتحانِ بادہ فروش

تری شمیم نے گلزار کو کیا برباد
تری نگاہ نے کھوئی دکانِ بادہ فروش

عبث ہے شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرنا
ملے گا بادہ کشوں سے نشانِ بادہ فروش

○

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں
کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں

کچھ زہر اُگل رہی ہے بُلبُل
کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں

بدمست جہان ہو رہا ہے
ہے یار کی بُو ہر ایک شے میں

ہے مستیٔ بزمِ جام کا ڈر
اصرار ہے جام پے بہ پے میں

میخانہ نشیں قدم نہ رکھیں
بزمِ جم و بارگاہِ کے میں

کچھ شیفتہ یہ غزل ہے آفت
کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں

○

گرم جوشی ہے، مگر فرق شرارت میں نہیں
چھیڑ کس بات میں، طعنہ کس اشارت میں نہیں

رات ساقی نے کہا: جس کے یہ سب جلوے ہیں
وہ عبارت میں نہیں اور اشارت میں نہیں

ہم کو مقصد سے زیادہ ہے ادب میں کوشش
ورنہ کچھ غیر سوا ہم سے جسارت میں نہیں

رند فارغ بھی ہوئے جامِ سحر گاہی سے
اور زاہد ابھی آہنگِ طہارت میں نہیں

فرحتِ نفس جو وہ ہے تو یہ ہے راحتِ روح
کیا بزرگی میں مزہ ہے جو حقارت میں نہیں

اہلِ دانش کے فوائد کی تو کیا بات، مگر
غور سے دیکھو تو عاشق بھی خسارت میں نہیں

جامِ مے دے کہ وہاں کام پڑا ہے مجھ کو
کہ صبا کو بھی جہاں دخل سفارت میں نہیں

قتل و غارت کو سمجھتے ہو جسے امرِ عظیم
یہ تو داخل بھی وہاں ناز و شرارت میں نہیں

دل کے بدلے میں طلب گار نہیں کچھ تم سے
شیفتہ زمرۂ اصحابِ تجارت میں نہیں

مت چھیڑ کہ یار سے جدا ہوں
اے مرگ! میں آپ مر رہا ہوں

ممکن نہیں بن ملے رہا ہوں
بیگانۂ آشنا نما ہوں

لیلیٰ کہنے سے بگڑ گئے تھے
دیوانہ میں جان کر بنا ہوں

کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملیے
کہتا ہے کہ کیا میں بے وفا ہوں

روشن ہے مری سیاہ بختی
منت کشِ سایۂ ہما ہوں

بیگانہ وشی ستم ہے ان کی
غیروں کو بھی یار جانتا ہوں

اس غیرتِ گل سے ربط معلوم
ہر چند میں ہمدمِ صبا ہوں

ہمدم! نہ سہی محبت اس کو
اس بات پہ کیا اسے نہ چاہوں؟

مکشوف ہوا فروغِ مے سے
ذرہ میں کس آفتاب کا ہوں

میں شیفتہ ہوں عزیزِ دل ہا
شیریں گفتار، خوش ادا ہوں

ہے گو نہ گو نہ شک ابھی عفوِ گناہ میں
جو ہے زباں پر، وہ نہیں ہے نگاہ میں

تمکینِ اضطراب ہے، بیدادِ التفات
کیا شوخیٔ اثر ہے سراسیمہ آہ میں

ہر خار و خس ہے وجد میں، ہر سنگ و خشت مست
کیا مے کشوں نے آ کے کہا خانقاہ میں؟

دشمن سے بھی زیادہ ہے، گو دوست کیوں نہ ہو
رل جائے جو کوئی ترے کوچہ کی راہ میں

صیادِ دل فریب کا اللہ رے لطفِ عام
بے زخم ایک صید نہیں صید گاہ میں

دن رات جلوے دیکھتے ہیں مہر و ماہ کے
یہ روشنی نہ مہر میں دیکھی، نہ ماہ میں

تجھ کو نظر نہ آئے، تو اپنا علاج کر
ہے مرغزار جلوہ نما برگِ کاہ میں

دھوکا مجھی کو صرف نہیں میلِ یار کا
دیکھا بڑے بڑوں کو اسی اشتباہ میں

ہر شیوہ اس کا اپنی جگہ میں تمام ہے
اعجاز بات میں ہے، تو جادو نگاہ میں

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاقت میں کچھ مزہ ہے نہ لذت گناہ میں

○

شوخی نے تیری لطف نہ رکھا حجاب میں
جلوے نے تیرے آگ لگائی نقاب میں

آ نغمہ گر ہو چرخ میں لا آسمان کو
آ رقص کر! زمیں کو ڈال اضطراب میں

سو مہر کا فروغ ہے واں جلوہ گاہ میں
سو باغ کی شمیم ہے واں رختِ خواب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

سالک کی یہ مراد کہ مجھ سا ہو نفس بھی
رہزن کو یہ خیال کہ رہرو ہو خواب میں

اس صوتِ جاں نواز کا ثانی بنا نہیں
کیا ڈھونڈتے ہو بربط و عود و رباب میں

اے وائے! روزِ حشر اگر ہم سے ہو سوال
جو کچھ کیا ہے ہم نے شبِ ماہتاب میں

شرمِ گنہ، نہ بیمِ عقوبت، یہ رنج ہے
بے مے اٹھائی اس نے اذیت عتاب میں

لڑتی نہ جائے آنکھ جو ساقی سے شیفتہ
ہم کو تو خاک لطف نہ آئے شراب میں

○

کیوں کر مجھے خط رقم کریں گے
کیا غیر کا سر قلم کریں گے

ہم پیشہ ہے اضطراب و شوخی
کس واسطے مجھ سے رم کریں گے

اتنی بھی بری ہے بے قراری
اب آپ سے اُنس کم کریں گے

مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا
قاصد! وہ بہت الم کریں گے

آرام کی فکر اب ہوئی ہے
تم سے نہ ہوا، وہ ہم کریں گے

دلّی میں تو شیفتہ ہے استاد
ہم قصد سوئے عجم کریں گے

○

سحر گئے جو وہ گلگشتِ گلستاں کے لیے
صبا تپش میں ہے گل ہائے بے خزاں کے لیے

انھیں ہے ہم سے محبت عمل کی کیا حاجت
اگر کرو تو کرو ان کے پاسباں کے لیے

وہ اپنے باغ میں ہم کو ضرور رکھے گا،
جو بلبلوں کو نہ دے حکم آشیاں کے لیے

کرم کرم نہ سمجھ، گر کسی غرض سے ہو
ستم ستم نہ سمجھ گر ہو امتحاں کے لیے

کب آپ آئے کہ طاقت نہیں اشارے کی
کب آپ آئے کہ جنبش نہیں زباں کے لیے

نہ میکدہ میں ترانہ، نہ خانقہ میں سماع
دعائے خیر ہے اس آفتِ جہاں کے لیے

زیاں ہے عشق میں ہم خود بھی جانتے ہیں مگر
معاملہ ہی کیا ہو اگر زیاں کے لیے؟

ہمارے ساتھ ہیں وہ موشگافیاں کہ نہ پوچھ
یہ نکتہ بس ہے کہ آفت ہے نکتہ داں کے لیے

اثر اگرچہ بنا بہر ناز دل کش دوست
مگر کچھ اپنی بھی آہِ جگر فشاں کے لیے

یہ ضبطِ راز کی تعلیم شیفتہ بے جا
زباں ہم کو ملی ہے اگر بیاں کے لیے

○

بچتے ہیں اس قدر جو اُدھر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوۂ دلِ شورش ادا سے ہم

چلتے ہیں میکدہ کو، کہاں یہ عزیزواں
رخصت تو ہو لیں کبر و نفاق و ریا سے ہم

اے جوشِ رشکِ قربِ عدو، اب تو مت اٹھا
بیٹھے ہیں دیکھ بزم میں کس التجا سے ہم

ہے جامہ پارہ پارہ، دل و سینہ چاک چاک
دیوانہ ہو گئے گلِ جیبِ قبا سے ہم

کیا جانتے تھے صبح وہ محشر قد آئے گا
شامِ شبِ فراق نہ مرتے بلا سے ہم

بیگانہ جب سے یار ہوا ہے رقیب سے
امید قطع کر چکے، ہر آشنا سے ہم

بلبل یہ کہہ رہی ہے بر شاخسار پر
بدمست ہو رہے ہیں چمن کی ہوا سے ہم

کم التفات ہم سے سمجھتے ہیں اہلِ بزم
شرمندہ ہو گئے تری شرم و حیا سے ہم

ہاں شیفتہ پھر اس میں نصیحت ہی کیوں نہ ہو
سنتے ہیں حرفِ تلخ کو سمعِ رضا سے ہم

ناسخ لکھنوی

○

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے آبِ باراں میں
تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے
کہ یک گوشہ ہے صحرائے قیامت اس کے داماں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

○

ساتھ اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر مجھ کو دلِ زار نے سونے نہ دیا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں
سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا

خفتگیِ بخت کی کیا کہیے کہ جز خوابِ عدم
عمر بھر دیدۂ بیدار نے سونے نہ دیا

یہی صیاد گلا کرتا ہے میرا، ہر صبح
نالۂ مرغِ گرفتار نے سونے نہ دیا

سمجھے تھے بعدِ فنا پائیں گے راحت ناسخ
حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

○

کیوں دکھائی اے فلک! بے یار صبح
ہے شفق سے مجھ پہ آتش بار صبح

یاں کسی خورشید رُو کی یاد میں
ہوتی ہے ہر رات سو سو بار صبح

زلف سے رخسار کو ہوتا ہے ربط
کیوں شبِ فرقت سے ہے بیزار صبح

وصل کا ساماں ہے آج اے فلک!
شام سے کر پیشتر تیار صبح

حسن کا عالم بھی کیا عالم ہے واہ
زلفِ جاناں شام ہے، رخسار صبح

وصل میں تھا صبح سے بیزار میں
ہجر کی شب، مجھ سے ہے بیزار صبح

شام کیا ہو تیرے گھر میں باریاب
نور سے ہیں سایۂ دیوار صبح

ہے یہاں کس کو شبِ فرقت میں ہوش
ہو چکی ہو گی ہزاروں بار صبح

○

تو مجھ سے ہو ہم کنار قاصد
کر لوں میں تجھ کو پیار قاصد

بر آئی ترے قدم کی دولت
امید امیدوار قاصد

آنکھوں سے نکالوں، پاؤں پھیلا
گر کوئی چبھا ہو خار قاصد

گر جان بھی دوں تجھے تو کم ہے
ہوں سخت میں شرمسار قاصد

ناسخ یہی تجھ سے پوچھتا ہے
کیسا ہے مزاجِ یار قاصد

○

سب ہمارے لیے زنجیر لیے پھرتے ہیں
ہم سرِ زلفِ گرہ گیر لیے پھرتے ہیں

کون تھا صیدِ وفادار کہ اب تک صیاد
بال و پر اس کے ترے تیر لیے پھرتے ہیں

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

جس سے مرتا ہے بھلا کس کو عداوت ہوگی
آپ کیوں ہاتھ میں شمشیر لیے پھرتے ہیں

○

دل میں پوشیدہ تپِ عشقِ بتاں رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کی مانند نہاں رکھتے ہیں

مثلِ پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس
ہم فقط تم پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

محفلِ یار میں کچھ بات نہ نکلی منہ سے
کہنے کو شمع کی مانند زباں رکھتے ہیں

ہو گیا زرد، پڑی جس کی حسینوں پہ نظر
یہ عجب گل ہیں کہ تاثیرِ خزاں رکھتے ہیں

ہم وہ غواصِ بحرِ جہاں ملکِ سخن اے ناسخ
گو نہیں حکم رواں طبع رواں رکھتے ہیں

○

روز ہے گرمیِ بازار ترے کوچے میں
جمع ہیں تیرے خریدار ترے کوچے میں

دیکھ کر تجھ کو، قدم اُٹھ نہیں سکتا اپنا
بن گئے صورتِ دیوار ترے کوچے میں

دیر ویراں ہے ترے عہد میں، کعبہ ہے خراب
جمع ہیں کافر و دیں دار ترے کوچے میں

روز ہی عشق نے یہ تفرقہ پردازی کی
ہم ہیں زنداں میں، دلِ زار ترے کوچے میں

آرزو ہے جو مروں میں، تو یہاں مدفن ہو
ہے جگہ تھوڑی سی درکار ترے کوچے میں

حالِ دل کہنے کا ناسخ جو نہیں پاتا بار
پھینک جاتا ہے وہ اشعار ترے کوچے میں

○

مجھ کو اب ساقیِ گلفام سے کچھ کام نہیں
مے سے کچھ کام نہیں، جام سے کچھ کام نہیں

دل میں خوش آئی ہیں صحرا کی ببولیں پرخار
اب کسی سروِ گل اندام سے کچھ کام نہیں

اپنے آرام سے ہوں وحشتِ جنوں میں تنہا
کسی محبوبِ دل آرام سے کچھ کام نہیں

خانہ برباد ہوں صحرا میں بگولوں کی طرح
سقف و دیوار و در و بام سے کچھ کام نہیں

طائرِ روحِ رمیدہ کی طرح چھوٹا ہوں
اب تو صیاد ترے دام سے کچھ کام نہیں

اتنی مدت سے ہوں غربت میں وطن بھول گیا
مجھ کو اب نامہ و پیغام سے کچھ کام نہیں

○

اس ابر میں یار سے جدا ہوں
بجلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

امید وصال اب کہاں ہے
اس گل سے برنگِ بُو جدا ہوں

گلبن ہوں اگر تو ہوں میں بے برگ
بلبل ہوں اگر تو بے نوا ہوں

سر رکھ کے کبھی وہ سو گیا تھا
اب تک زانو کو سونگھتا ہوں

آئینۂ دل میں ہے ترا عکس
دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

ہے مہر و وفا سراسر اس میں
ناسخ کیوں کر اسے نہ چاہوں

○

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب
یاں اعتبارِ دوستیِ جسم و جاں نہیں

منعم کے شکر میں بھی بلائیں کبھی کبھی
تنہا برائے لذتِ دنیا زباں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا
باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

آتشؔ لکھنوی

○

سن تو سہی، جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا، غائبانہ کیا؟

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل، سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا، خزانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا، تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد! اسیرِ دامِ رگِ گُل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے دام و دانہ کیا

طبل و علم نہ پاس ہے اپنے، نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا، اڑے گا نشانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتشؔ غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

○

شبِ وصل تھی، چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا

مبارک شبِ قدر سے بھی وہ شب تھی
سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا

وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی
زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا

نکالے تھے دو چاند اُس نے مقابل
وہ شب، صبحِ جنت کا جس پر گماں تھا

عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل
فرحناک تھی روح، دل شادماں تھا

مشاہدِ جمالِ پری کی تھیں آنکھیں
مکانِ وصال اک طلسمی مکاں تھا

حضوری نگاہوں کو دیدار سے تھی،
کھلا تھا وہ پردہ کہ جو درمیاں تھا

حقیقت دکھاتا تھا عشقِ مجازی
نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا

بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا، کہ آتشؔ جواں تھا

○

تیری جو یاد اسے دل خواہ! بھولا
باللہ بھولا، واللہ بھولا!!

فرقت کی شب میں جاں سوز دل نے
اُف اُف کیا جو، آہ آہ بھولا

کچھ رکھ نہ پا کو، جا دل سے غافل
پھیر اس نے کھایا، جو راہ بھولا

زنار ڈالا، تسبیح پھینکی!
عشقِ صنم میں اللہ بھولا!

خود نے گرایا اس کو نظر سے
جو ذرہ تیری درگاہ بھولا

محروم رکھا ساقی نے ہم کو
اپنے گدا کو جم جاہ بھولا

بُت خانہ چھوڑا، باز آئے بت سے
وہ شہر بھولا، وہ شاہ بھولا

شرطِ وفا کی کس بے وفا سے
آتش سا عارف، آگاہ بھولا

○

تیرے کوچہ کا ہے اے خانہ خراب! افسانہ آج
شیخ کعبہ چھوڑتا ہے، برہمن بت خانہ آج

خوب رُو تجھ سا کوئی بازارِ عالم میں نہیں
قیمتِ یوسفؑ نہ تھی، جو ہے ترا بیعانہ آج

آمد آمد اس سراپا نور کی ہے بزم میں
شمع اُڑ جائے، جو ہاتھ آئیں پر پروانہ آج

ہم نشیں! کہتے ہیں: ذکرِ عیش، نصفِ عیش ہے
میں کہوں، تو سن! جمالِ یار کا افسانہ آج

مجھ سے دریا نوش کو ساقی پلاتا ہے شراب
دیکھتا ہوں میں بھی ظرفِ شیشہ و پیمانہ آج

نقشِ آسیب پری ہے صورتِ زیبا تری
ہوش میں آتا ہے تجھ کو دیکھ کر دیوانہ آج

میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت رُکھ کر نماز
کس طرف جا کر کروں میں سجدۂ شکرانہ آج

نزع کی مشکل بھی آساں ہوتی ہے آتش نہ ڈر
شاہِ مرداں سے طلب کر، ہمتِ مردانہ آج

○

غیرتِ مہر، رشکِ ماہ ہو تم
خوبصورت ہو، بادشاہ ہو تم

کیوں کر آنکھیں نہ ہم کو دکھلاؤ
کیسے خوش چشم، خوش نگاہ ہو تم

حسن میں آپ کے ہے شانِ خدا
عشق بازوں کے سجدہ گاہ ہو تم

ہر لباس آپ کو ہے زیبندہ
جامہ زیبوں کے بادشاہ ہو تم

فوق ہے سارے خوش جمالوں پر
وہ ستارے جو ہیں، تو ماہ ہو تم

کیوں محبت بڑھائی تھی تم سے
ہم گنہ گار، بے گناہ ہو تم

جو کہ حقِ وفا بجا لائے
شاہد اللہ ہے، گواہ ہو تم

ہے تمہارا خیال پیشِ نظر
جس طرف جائیں، سدِ راہ ہو تم

دونوں بندے اسی کے ہیں آتش
خواہ ہم اس میں ہوویں خواہ ہو تم

○

خوشا وہ دل کہ ہو جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ، جسے تازہ رکھے بو تیری

مری طرف سے صبا! کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت، پیرہن سے بو تیری

شبِ فراق میں اے روزِ وصل! تا دمِ صبح
چراغ ہاتھ میں ہے اور جستجو تیری

جو ابر گریہ کناں ہے تو برق خندہ زناں
کسی میں خو ہے ہماری، کسی میں خو تیری

کسی طرف سے تو نکلے گا آخر اے شہِ حسن!
فقیر دیکھتے ہیں راہ، کو بہ کو تیری

زمانہ میں کوئی تجھ سا نہیں ہے سیف زبان
رہے گی معرکہ میں آتش آبرو تیری

○

یہ آرزو تھی، تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب، گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسر ہوا، تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ، جو باراں کی آرزو کرتے

○

اے صنم! جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے

تیغ بے آب ہے، نے بازوئے قاتل کمزور
کچھ گراں جانی ہے، کچھ موت نے فرصت دی ہے

کوئی اکسیر، غنیِ دل نہیں رکھتی ایسا
خاکساری نہیں دی ہے، مجھے دولت دی ہے

فرقتِ یار میں رو رو کے بسر کرتا ہوں
زندگانی مجھے کیا دی ہے، مصیبت دی ہے

یادِ محبوب فراموش نہ ہووے اے دل!
حسنِ نیت نے مجھے عشق سی نعمت دی ہے

گوش پیدا کیے سننے کو ترا ذکرِ جمال
دیکھنے کو ترے، آنکھوں میں بصارت دی ہے

لطفِ دل بستگیٔ عاشقِ شیدا کو نہ پوچھ!
دو جہاں سے اس اسیری نے فراغت دی ہے

کمرِ یار کے مضمون کو باندھو آتش!
زلفِ خوباں سی مرے تم کو طبیعت دی ہے

○

دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
کلام آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارغواں کیسے کیسے

بہار آئی ہے، نشہ میں جھومتے ہیں
مریدانِ پیرِ مغاں کیسے کیسے

نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے!

نہ گورِ سکندر، نہ ہے قبرِ دارا
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے!

غم و غصہ و رنج و اندوہ و حرماں
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

تری کلکِ قدرت کے قربان آنکھیں
دکھائے ہیں خوش رُو جواں کیسے کیسے

کرے جس قدر شکرِ نعمت وہ کم ہے
مزے لوٹتی ہے زباں کیسے کیسے

○

ہوائے دورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی، بہار راہ میں ہے

گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار راہ میں ہے

طریقِ عشق میں اے دل! عصائے آہ ہے شرط
کہیں چڑھاؤ، کہیں اتار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے، نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے

نہ جائیں آپ ابھی دوپہر ہے گرمی کی
بہت سی گرد، بہت سا غبار راہ میں ہے

تلاشِ یار میں کیا ڈھونڈیئے کسی کا ساتھ
ہمارا سایہ، ہمیں ناگوار راہ میں ہے

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے، دشمن ہزار راہ میں ہے

پتہ یہ کوچۂ قاتل کا سن رکھ اے قاصد!
بجائے سنگِ نشاں، اک مزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں، تو چل سر کے بل، نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

امیر مینائیؒ

○

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا
درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا

آج اس شوق سے پیکاں مرے دل میں آیا
آگیا یاد کسی شوخ پہ آنا دل کا

ہائے وہ پہلی ملاقات میں میرا رکنا
اور اُس کا وہ لگاوٹ سے بڑھانا دل کا

متصل آہ کی پہلو سے صدا آتی ہے
اب وہ ہے درد کا گھر، تھا جو ٹھکانا دل کا

جی لگے آپ کا ایسا کہ کبھی جی نہ بھرے
دل لگا کر جو سُنیں آپ فسانہ دل کا

تیر پر تیر لگا کر وہ کہا کرتے ہیں
کیوں جی تم کھیل سمجھتے تھے لگانا دل کا

پھیر کر منہ، مجھے تڑپاتے ہیں اور کہتے ہیں
رُخ بدل کر ہم اڑاتے ہیں نشانہ دل کا

ہر نگہ وصل میں اس شوخ کی کہتی ہے امیرؔ
ہو جسے علم اڑائے وہ نشانہ دل کا

○

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں

نگاہِ کرم سے مجھ کو نہ دیکھ اے دوزخ
خبر نہیں تجھے کس کا گناہگار ہوں میں

پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے
گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں

جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے
پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں

حضور! وصل کی حسرت ازل سے ہے مجھ کو
خیال کیجیے کب سے امیدوار ہوں میں

وہ بیقرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری
قرار بھی یہ پکارے کہ بے قرار ہوں میں

بڑے مزے سے گذرتی ہے بیخودی میں امیرؔ
وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

○

رہے تصویرِ حیرانی ہم ان کے روبرو برسوں
لبِ خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں

نہیں مٹتی ہے دل سے مر کے ان کی آرزو برسوں
یہ وہ گُل ہے کہ مرجھائے پہ بھی دیتا ہے بُو برسوں

فنا کے بعد ایسے بےکسوں کو کون پوچھے گا ؟
مگر اے بےکسی رویا کرے گی مجھ کو تو برسوں

نہ کر اے یاس! یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغِ آرزو برسوں

سراپا جُرم ہوں، لیکن وہ رندِ پاک طینت ہوں
کیا زاہد نے میرے آبِ خجلت سے وضو برسوں

تمھاری اک نگاہِ ناز نے تو ذرا اشارے میں
بنایا چشم و دل نے جو طلسمِ آرزو برسوں

کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

○

اس کی حسرت ہے، جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں، جسے پا بھی نہ سکوں

ان کے غصے کے مٹانے کی ہیں سو تدبیریں!
لاگ کی آگ نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں

چٹکیاں لینے سے دل میں وہ کریں کیا انکار
داغ کچھ درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں

میں اگر گھر سے نکلتا ہوں، تو گھر کیوں ہے اداس
کیا دمِ بازپسیں ہے کہ پھر آ بھی نہ سکوں

کوئی پوچھے تو محبت سے، یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دل سے بھلا دے، میں بھلا بھی نہ سکوں

نقشِ ہستی میں ابھی محو کیے دیتا ہوں
خطِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹا بھی نہ سکوں

○

یہ تو میں کیوں کر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں
تو سراپا ناز ہے، میں نازبرداروں میں ہوں

جان پر صدمہ، جگر میں درد، دل کا حالِ زار
گھر کا گھر بیمار کس کس کے پرستاروں میں ہوں

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
چیخ اٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہ گاروں میں ہوں

صبح سے مطلب، نہ گل سے کام، کیا جانوں انھیں
میں تمھارے سینہ چاکوں میں، دل افگاروں میں ہوں

پھیر دو دیکھو! میری میت پر جو آئے، یہ کہا
تم وفاداروں میں ہو، یا میں وفاداروں میں ہوں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ،
اے اسیرانِ قفس! میں نوگرفتاروں میں ہوں

بے گناہوں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ، میں گنہ گاروں میں ہوں

بے گناہوں کا تو دعویٰ ان کے آگے کیا مجال
ڈرتے ڈرتے منہ سے نکلا میں گنہگاروں میں ہوں

آ چکا تھا رحم اس کو سن کے میری بے کسی
درد ظالم بول اٹھا میں اس کے غمخواروں میں ہوں

○

صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلم مجھ کو
منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو

وقتِ فرصت تھا میں عبرت کدۂ ہستی میں
کفِ افسوس ملے، جس نے کیا گم مجھ کو

ایک کو ایک سے بڑھ کر ترے جلوے کا ہے شوق
آنکھ کہتی ہے نگہ پر ہو تقدم مجھ کو

واہ اے بیخودیٔ شوق کیا خوب سلوک
اس کو جب ڈھونڈھ نکالا تو کیا گم مجھ کو

خلوتِ وصل میں کچھ کام نہیں ساقی کے
جامِ مے بھر کے پلاؤں میں تمھیں، تم مجھ کو

میں تو کیا، عکس سے وہ آئینہ رو کہتا ہے
پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیر
اپنی صورت پہ خود آتا ہے ترحم مجھ کو

○

کہہ رہی ہے حشر میں وہ آنکھ شرمائی ہوئی
ہائے کیسی اس بھری محفل میں رسوائی ہوئی

آئینے میں ہر ادا کو دیکھ کر کہتے ہیں وہ
آج دیکھا چاہیے کس کس کی ہے آئی ہوئی

کہہ تو اے گل چیں! اسیرانِ قفس کے واسطے
توڑ لوں دو چار کلیاں میں بھی مرجھائی ہوئی

میں تو رازِ دل چھپاؤں پر چھپا رہنے بھی دے
جان کی دشمن، یہ ظالم آنکھ للچائی ہوئی

کیوں ترے لب پر تبسم مجلسِ ماتم میں ہے
یہ ہنسی بھی کیا مرے پھولوں میں ہے آئی ہوئی

گرد اُڑی عاشق کی تربت سے تو جھنجھلا کر کہا
واہ سر چڑھنے لگی، پاؤں کی ٹھکرائی ہوئی

شعر گلدستے ہیں مجھ افسردہ دل کے کیا امیرؔ
دامنِ گلچیں میں کچھ کلیاں ہیں مرجھائی ہوئی

○

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لیے
ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار
سادگی گہنا ہے اس سن کے لیے

کون ویرانے میں دیکھے گا بہار
پھول جنگل میں کھلے کن کے لیے

ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے

باغباں! کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کم سن کے لیے

سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند
اب کوئی حور آئے گی ان کے لیے

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیرؔ
بھیجتے تحفہ مؤذن کے لیے

○

اچھے عیسیٰ ہو، مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں، تم کہتے ہو حال اچھا ہے

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

دیکھ لے بلبل و پروانہ کی بے تابی کو
ہجر اچھا، نہ حسینوں کا وصال اچھا ہے

آ گیا اس کا تصور، تو پکارا یہ شوق
دل میں جم جائے الٰہی! یہ خیال اچھا ہے

برق اگر گرمیٔ رفتار میں اچھی ہے امیر
گرمیٔ حسن میں وہ برقِ جمال اچھا ہے

○

آنکھ اس کے حضور رو رہی ہے
بیباکی اپنی مجھے ڈبو رہی ہے

دیدار کہاں کہ دور ہے حشر
قسمت ابھی اپنی سو رہی ہے

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم
جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

اللہ رے حسنِ دخترِ رز
زاہد کے حواس کھو رہی ہے

کیا کشتی و ناخدا کا شکوہ
تقدیر ہمیں ڈبو رہی ہے

نرگس کو صبا، نہ چھیڑ اتنا
سونے دے غریب سو رہی ہے

گلشن میں جو ابر ہے دھواں دھار
مے خواروں میں دھوم ہو رہی ہے

اس تیغ کے منہ چڑھے نہ بجلی
کیوں جان سے ہاتھ دھو رہی ہے

کیا شوخ ہے اس کی یادِ مژگاں
دل میں نشتر چبھو رہی ہے

ہم جاگ رہے ہیں ہجر کی شب
تقدیر ہماری سو رہی ہے

احساں ہے امیر چشمِ تر کا
نالے کی سیاہی دھو رہی ہے

داغ دہلوی

○

اللہ رے مرتبہ مرے عجز و نیاز کا
گویا جواب ہے یہ ترے کبر و ناز کا

عالم تمام چشمِ حقیقت نگر بنا!
منہ دیکھتا ہے آئنہ، آئینہ ساز کا

ہر چند راہِ کعبہ و بت خانہ ایک ہے
اے راہ رو بہے کام بیان امتیاز کا

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

رُتبے سے میرے قیصر و سنجر کو رتبہ کیا
میں ہوں غلام، شاہِ عراق و حجاز کا

مجھ کو نہ کیوں کہ اس کی غلامی سے فخر ہو
محمود ایک بردہ ہے جس کے ایاز کا

کونین جس کے ناز سے جکڑا ہے ہیں داغ
میں ہوں نیاز مند، اسی بے نیاز کا

○

اب دل ہے مقام بے کسی کا
یوں گھر نہ تباہ ہو کسی کا

کس کس کو مزہ ہے عاشقی کا
تم نام تو لو، بھلا کسی کا

گلشن میں ترے لبوں نے گویا
رس چوس لیا، کلی کلی کا

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں
کہنا نہیں مانتے، کسی کا!

آغاز کو کون پوچھتا ہے
انجام اچھا ہو، آدمی کا

کہتے ہیں اُسے زبانِ اُردو
جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

○

خاطر سے، یا لحاظ سے، میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے، آپ کا ایمان تو گیا

دل لے کے مفت، کہتے ہیں: کچھ کام کا نہیں
اُلٹی شکایتیں ہوئیں، احسان تو گیا

دیکھا ہے بت کدہ میں، جو اے شیخ! کچھ نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا، جان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، سامان تو گیا

○

پکارتی ہے خموشی مری، فغاں کی طرح
نگاہیں کہتی ہیں سب رازِ دل، زباں کی طرح

بگڑ گئی ہے یہاں بے طرح، جہاں کی طرح
کہاں کی وضع، کہاں کی ادا، کہاں کی طرح

چھڑائے قید سے، اے قید! ہم اسیروں کو
لگا دے آگ قفس میں بھی آشیاں کی طرح

جلا کے داغِ محبت نے دل کو خاک کیا
بہار آئی مرے باغ میں، خزاں کی طرح

جوابِ خضر ہیں وہ مُردہ دل کہ جن کو یہاں
ملی ہے مرگِ ابد، عمرِ جاوداں کی طرح

یہ سدِّ راہ ہوا، کس کا پاس رسوائی
رکے ہوئے ہیں مرے اشک، کارواں کی طرح

ادائے مطلبِ دل ہم سے سیکھ جائے کوئی
انھیں سنا ہی دیا حال، داستاں کی طرح

ہم اپنے ضعف کے صدقے، بٹھا دیا ایسا
ہلے نہ در سے ترے، سنگِ آستاں کی طرح

خدا قبول کرے، داغ! تم جو کوئے عدم
چلے ہو عشقِ بتاں لے کے ارمغاں کی طرح

○

سوز و گدازِ عشق کا لذت چشیدہ ہوں
مانندِ آبلہ، ہمہ تن آب دیدہ ہوں

گر تو نہ ہو، تو پھر کسی کافر کا دل لگے
دوزخ میں آرمیدہ، ارم سے رمیدہ ہوں

نازک مزاجیوں نے مجھے اُلجھ سا کر دیا
اے بے خبر! میں اپنے سے آپ ہی کشیدہ ہوں

افتادگی پہ بھی نہ گئی اُس کی جستجو!
گویا زمیں پہ سایۂ مرغِ پریدہ ہوں

اے داغؔ! جس کے واسطے روزِ جزا بنا
وہ کون ہے؟ وہ میں ہی تو آفت رسیدہ ہوں

○

سازِ یہ کینہ ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

کب کسی در کی جبہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

جو رہِ عشق میں قدم رکھیں
وہ نشیب و فراز کیا جانیں

پوچھیے مے کشوں سے لطفِ شراب
یہ مزہ پاکباز کیا جانیں

حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں
لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں

جو گزرتے ہیں داغؔ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

○

شوخی نے تیری کام کیا اک نگاہ میں
صوفی ہے بت کدہ میں، صنم خانقاہ میں

آنکھیں بچھائیں ہم تو عدو کی بھی راہ میں
پر کیا کریں، اگر تو ہے ہماری نگاہ میں

بڑھتا ہوں آگے، پوچھ کے نس سے مقامِ عشق
جو فتنہ مجھ غریب کو ملتا ہے راہ میں

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا تمہاری نگاہ میں

راتیں مصیبتوں کی جو گزری تھیں آج تک
ماتم کو آئی ہیں مرے روزِ سیاہ میں

اس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر
جو ٹوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

کیسا نظارہ، کس کا اشارہ، کہاں کی بات
سب کچھ ہے اور کچھ نہیں، نیچی نگاہ میں

مشتاق اس صدا کے بہت دردمند تھے
اے داغ! تم تو بیٹھ گئے ایک آہ میں

○

چاک ہو پردۂ وحشت، مجھے منظور نہیں
ورنہ یہ ہاتھ، گریبان سے کچھ دور نہیں

وصل سے یاس ہو، ایسا دل رنجور نہیں
بت اگر دور ہے مجھ سے، تو خدا دور نہیں

چھین لیں دل کو اگر وہ، تو یہ مجبوری ہے
میں کہے جاؤں گا، محتاج ہوں مقدور نہیں

لب تک آئی تھی شکایت کہ محبت نے کہا
دیکھ! پچھتائے گا، خاموش! یہ دستور نہیں

رات دن نامہ و پیغام کہاں تک ہوں گے
صاف کہہ دیجئے، ملنا ہمیں منظور نہیں

کیا کرے داغ کوئی اس کی محبت کا علاج
وہ کلیجا ہی نہیں، جس میں یہ ناسور نہیں

○

اشکِ خوں رنگ لائے جاتا ہے
داغ اپنی جمائے جاتا ہے

کتنا با وضع ہے خیال اُس کا
بے کسی میں بھی آئے جاتا ہے

دیکھنا رشک اس کی محفل کا
ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

وہ جدھر کو گئے، اُٹھا یہ شور
وہ قیامت اُٹھائے جاتا ہے

آتشِ شوق کیا بجھے ناصح!
تو پتنگے لگائے جاتا ہے

○

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے / دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

ہم نکمے ہوئے زمانے کے / کام ایسا سکھا دیا تو نے

لاکھ دینے کا ایک دینا ہے / دلِ بے مدعا دیا تو نے

بے طلب جو ملا، ملا مجھ کو / بے غرض جو دیا، دیا تو نے

عمرِ جاوید، خضرؑ کو بخشی / آبِ حیواں پلا دیا تو نے

نارِ نمرود کو کیا گلزار / دوست کو یوں بچا دیا تو نے

کہیں مشتاق سے حجاب ہوا / کہیں پردہ اُٹھا دیا تو نے

جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی / مجھ کو اس سے سوا دیا تو نے

مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب / نقشہ اپنا جما دیا تو نے

مجھ گنہ گار کو، جو بخش دیا / تو جہنم کو کیا دیا تو نے؟

داغ کو، کون دینے والا تھا
جو دیا، اے خدا! دیا تو نے

مولانا حالی

○

پیش از ظہورِ عشق، کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزباں، کوئی مہماں نہ تھا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے جائے گا جی اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط، مگر بیمِ جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے ہیں، ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالیؔ جادو بیاں نہ تھا

○

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

اس سے ناداں ہی بن کر ملیے!
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا

اس کو چھوڑا تو ہے لیکن اے دل!
مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

محتسب! عذر بہت ہیں، لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالیؔ سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

○

قلق اور دل میں سوا ہو گیا
دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور
مرا شکر اس کا گلا ہو گیا

وہ امید کیا جس کی ہو انتہا
وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا

ہوا رکتے رکتے دمِ آخر فنا
مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

○

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھئے شیخ! مصوّر سے کھچے یا نہ کھچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو! آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

شوق میں اس کے مزا، درد میں اس کے لذت
ناصحو! اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعدِ ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

○

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا، مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے، کچھ آسماں سے ہم

خودرفتگیِ شب کا مزہ بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب! کہاں سے ہم

دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق!
بدلیں گے تجھ کو زندگیِ جاوداں سے ہم

لینے دو چین کوئی دم اے منکر و نکیر!
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم

ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم!

دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھیے کب کارواں سے ہم

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے ہے
پوچھیں گے جا کے حالیِ جادو بیاں سے ہم

○

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اوّلِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یارب! اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط، مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیاں کسل و رنجِ راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو، تو زباں میں اثر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

○

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہو لیں
دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں

نیا ہے لیجیے جب نام اُس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہُوا حالیؔ سے مِل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

○

حق وفا کے جو ہم جتانے لگے
آپ کچھ کہہ کے مسکرانے لگے

تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عدو
عذر ان کی زباں پہ آنے لگے

ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں
وہ اگر ہمت آزمانے لگے

ڈر ہے، میری زباں نہ کھل جائے
اب وہ باتیں بہت بنانے لگے

جان بچتی نظر نہیں آتی !
غیرِ الفت بہت جتانے لگے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم!
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

جی میں ہے، لوں رضائے پیرِ مغاں
قافلے پھر حرم کو جانے لگے

سرِ باطن کو فاش کر، یارب!
اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے

وقتِ رخصت تھا سخت حالیؔ پر
ہم بھی بیٹھے تھے، جب وہ جانے لگے

○

جس کو غصّے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا، اگر کل نہ لیا، یاد رہے

شوق بڑھتا گیا، جُوں جُوں گئے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھُولے سے سوا یاد رہے

ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ، مگر
نہ ہو برتاؤ میں جو رسم، وہ کیا یاد رہے

یاد آؤ گے بہت، لطف سمجھ کر کیجے!
اس بھلائی کا ہے انجام بُرا، یاد رہے

شیخ! یاں شرمِ گنہ، شوق بھلا دیتا ہے
توبہ ان کی ہے، جنھیں اپنی خطا یاد رہے

خضرؑ نے پاؤں اگر دشتِ فنا میں رکھا
بھول جائیں گے رہِ آبِ بقا، یاد رہے

چارہ گر! کار بہ اندازۂ تدبیر نہیں
کیجیو ہمّت، اگر وقتِ دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالیؔ نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا، یاد رہے

○

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم میں طاقت نہیں جدائی کی

منہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے
تم کو عادت ہے خود نمائی کی

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

دل بھی پہلو میں ہو، تو یاں کس سے
رکھیے امید دل ربائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے
ساعت آ پہنچی اس جدائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالیؔ
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

اکبر الٰہ آبادی

○

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے؟

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مے پی اے ہوش ذرا سو جا
مہمانِ نظر اس دم اک برقِ تجلی ہے

واں دل میں کہ صدمے دو یاں جی میں کہ سب سہہ لو
اُن کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے

ہر ذرّہ چمکتا ہے، انوارِ الٰہی سے
ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے

سورج میں لگے دھبّا فطرت کے کرشمے ہیں
بُت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

○

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارہ نہیں ہوتا
آنکھ اُن سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

جلوہ نہ ہو معنی کا تو صورت کا اثر کیا
بلبل گلِ تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

اللہ بچائے مرضِ عشق سے دل کو
سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

تشبیہ ترے چہرے کو کیا دوں گلِ تر سے
ہوتا ہے شگفتہ مگر اتنا نہیں ہوتا

میں نزع میں ہوں آئیں تو احسان ہے اُن کا
لیکن یہ سمجھ لیں کہ تماشا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

○

چمن کی یہ کیسی ہوا ہو گئی
کہ صرصر سے بدتر صبا ہو گئی

عیادت کو آئے شفا ہو گئی
علالت ہماری دوا ہو گئی

وہ اُٹھے تو لاکھوں ہی فتنے اُٹھے
چلے تو قیامت بپا ہو گئی

محبت کی گرمی بھی کیا چیز ہے
طبیعت مری کیا سے کیا ہو گئی

لگاوٹ بہت ہے تری آنکھ میں
اسی سے تو یہ فتنہ زا ہو گئی

بتوں نے بھلایا جو دل سے مجھے
مرے ساتھ یادِ خدا ہو گئی

انھیں نے عطا کی تھی جانِ حزیں
ہوا خوب انھیں پر فدا ہو گئی

○

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہرِ تن میں جب کہ خود اپنا پتہ ملتا نہیں

زندگانی کا مزہ ملتا تھا جن کی بزم میں
ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتہ ملتا نہیں

کشتیِ دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

صرف ظاہر ہو گیا سرمایۂ زیب و صفا
کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی
بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں

○

آہ جو دل سے نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

یاد ان کی ہے بہت عزلت پسند
آہ بھی دل سے نکالی جائے گی

نزع کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جان
حشر کہتا ہے منا لی جائے گی

اس نزاکت پر یہ شمشیر جفا
آپ سے کیونکر سنبھالی جائے گی

بے تکلف چاہیے سوز و گداز
شمع کیوں سانچے میں ڈھالی جائے گی

کیا غم دنیا کا ڈر مجھ رند کو
اور اک بوتل چڑھا لی جائے گی

زندگی کی کل ہے پیچیدہ تو خیر
سانس لے کر چلا لی جائے گی

شیخ کی دعوت میں مے کا کام کیا
احتیاطاً کچھ منگا لی جائے گی

یاد ابرو میں ہے اکبر محو کیوں
کب تری یہ کج خیالی جائے گی

○

ترے سحر نظر سے ہوا یہ جنوں مرے دل کی تو اس میں خطا ہی نہ تھی
ترے کوچے میں آ کے میں بیٹھ رہا بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

ہوئی طبع جو مائل دام بلا، میں تمہاری ہی زلف سیہ میں پھنسا
مرے دامن دل کو جو کھینچ سکے، کوئی اور تو ایسی بلا ہی نہ تھی

کیا صحبت غیر نے قہر و غضب مجھے کوئی امید رہی نہیں اب
دم چند کو مجھ سے ملے بھی جو کل، وہ نظر ہی نہ تھی وہ ادا ہی نہ تھی

نہ نبھی تو پھر اس میں بھلا کس کی خطا، یہ گلا ہے مری ہی طرف سے بجا
مرے عشق کا رنگ تو خوب رہا، مگر آپ میں بوئے وفا ہی نہ تھی

میں وطن سے حزین و ملول پھرا، نہ وہ بزم ملی نہ وہ یار ملے،
گل و لالہ و سرو کا ذکر کجا، وہ چمن ہی نہ تھا وہ ہوا ہی نہ تھی

غم ہجر میں جی سے گیا جو گزر، تو یہ اکبر زار نے خوب کیا
کہ علاج فراق تو تھا یہی، بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

○

ہوائے شب بھی ہے عنبر افشاں عروج بھی ہے مہِ جبیں کا
نثار ہونے کی دو اجازت محل نہیں ہے نہیں نہیں کا

اگر ہو ذوقِ سجود پیدا ستارہ ہو اوجِ پر جبیں کا
نشانِ سجدہ زمیں پر ہو تو فخر ہے وہ رُخِ زمیں کا

صبا بھی اس گُل کے پاس آئی تو میرے دل کو ہوا کھٹکا
کوئی شگوفہ نہ یہ کھلائے پیام لائی نہ ہو کہیں کا

نہ مہر و مہ پر مری نظر ہے نہ لالہ و گُل کی کچھ خبر ہے
فروغِ دل کے لیے ہے کافی تصوّر اس روئے آتشیں کا

○

نظر کو ہو ذوقِ معرفت کا کرے تو شوقِ اضطراب پیدا
سوال پیدا جو ہوں گے دل میں انھیں سے ہوں گے جواب پیدا

کرو نہ کچھ فکرِ جام و ساقی بہار آنے تو دو چمن میں
گلوں سے ٹپکے گا رنگِ مستی ہوا کرے گی شراب پیدا

نہ اس کو لوٹنے کا موقع نہ شوقِ گستاخیوں کا حامی
اداؤں میں کچھ لگا دئیں ہیں، نگاہ سے ہے عتاب پیدا

ہر اک کے لائق ہے اس کی زینت نہ ہے تری شانِ تیری قدرت
کہ آنکھ کو اشک سے ہے بھرتی گہر سے کرتی ہے آب پیدا

یہ منزلِ حرصِ مال و دولت نہ دے گی دنیا میں تم کو راحت
ہوس بڑھائے گی تشنگی کو نظر کرے گی سراب پیدا

○

کبھی جو دعویٰ منصور میں شک آتا ہے
خیالِ یار مجھے آئنہ دکھاتا ہے

وہ بات ہوں کہ جو لاتی ہے جوش میں دل کو
وہ حال ہوں کہ جسے سُن کے وجد آتا ہے

ہمیں تو آٹھ پہر رہتی ہے تمہاری یاد
کبھی تمہیں بھی ہمارا خیال آتا ہے؟

نہ جانے کا تو نہیں جانتے بہانہ کچھ
ہزار حیلہ نہ آنے کا تم کو آتا ہے

وہ میکدہ ہے ہمارا کہ جس میں مستوں سے
ہزار ساغرِ جم روز ٹوٹ جاتا ہے

نہ پوچھئے ستم جوشِ حسرتِ دیدار
یہ جانِ زار کو آنکھوں میں کھینچ لاتا ہے

دُوئی کا دخل نہیں بزمِ وصل میں منظور
وگرنہ آپ میں آنا تو مجھ کو آتا ہے

فنا کا خوف کچھ اہلِ حیات ہی کو نہیں
ہوا سے شمع کا شعلہ بھی کانپ جاتا ہے

خدا کے واسطے یادِ خدا کر اے اکبر
بتوں کے عشق میں جان اپنی کیوں گنواتا ہے

○

اس میں عکس آپ کا اُتاریں گے
دل کو اپنے یونہی سنواریں گے

آپ ناحق پہ اور ہم حق پر
آپ سے ہم کبھی نہ ہاریں گے

عشق کہتا ہے لطف ہوں گے بڑے
ہجر کہتا ہے جان ماریں گے

لیجئے جان، ہے یہی جو خوشی
کیجئے ظلم، دم نہ ماریں گے

دل کی افسردگی نہ جائے گی
ہاں وہ چاہیں گے تو اُبھاریں گے

پند اکبر کو دیں گے کیا ناصح
گل کو کیا باغباں سنواریں گے

شاد عظیم آبادی

○

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنے ہی افسانے میں تھا
مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

مسکرا کر جھانکتی تھی کس ادا سے اک پری
چہرۂ ساقی کا شاید عکس پیمانے میں تھا

ہائے وہ خود رفتگی الجھے ہوئے سب سر کے بال
وہ کسی میں اب کہاں جو تیرے دیوانے میں تھا

دیکھتا تھا جس طرف اپنا ہی جلوہ تھا عیاں
میں نہ تھا وحشی کوئی اس آئینہ خانے میں تھا

بوریا تھا، کچھ شبینہ مے تھی یا ٹوٹے سبو
اور کیا اس کے سوا مستوں کے ویرانے میں تھا

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے سب بے اختیار
اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

شاد کچھ پوچھو نہ مجھ سے میرے دل کے داغ کو
ٹمٹماتا سا چراغ اک اپنے ویرانے میں تھا

○

دل تو بدنام ہے اک عمر سے کیا اس کا گلہ کہتے آتی ہے حیا
یہ تمنا، یہ امیدیں، جنھیں برسوں پالا، کب مری ہوں گی بھلا
وہ تری کج روشی، کج کلہی، کینہ وری، دلبری، عشوہ گری
کون غش کھا کے گرا، کون بچا، کون مرا، پھر کے دیکھا نہ ذرا
بان مارا تری آنکھوں نے، جو کی پھر کے نگاہ، نہ ملی دل کو پناہ
یار! کیا قہر ہے چلتا ہوا جادو تیرا، لاکھ روکا، نہ رکا
رت پھری ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کونپل، ہو گئے پھول بھی پھل
اک یہ اجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا، اور سوکھا ہی کیا
کالی کالی وہ گھٹائیں، وہ پپیہوں کی پکار، دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یوں ہی رونے میں کٹا، کیا کہیں چپ کے سوا
بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں، تاب اٹھنے کی کہاں؟
جامہ زیبی کا بھلا، اے صنم تنگ قبا، کچھ تو دامن کو جھٹکا!
فتنہ خو، آفت جاں، سنگ دل، آشوب جہاں، دشمن امن و اماں
سرو رنگ کلاہاں، خسرو اقلیم جفا، بانی مکر و دغا!
رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی، بے پئے متوالی!
سانولا رنگ، نمک ریز جراحات جفا، اف کہاں دھیان گیا
دیکھنا تیرا انکھیوں سے ہے آڑی برچھی، یار اس کی نہ سہی
کب کو گنتی میں ہے وہ گھاؤ جو اوچھا سا لگا، پھر کے پھر دیکھ ذرا
آنکھیں ڈبی ہوئی، آواز سے بھرائی ہوئی، باتیں گھبرائی ہوئی
اس سے تو اور کسی بھید کا ملتا ہے پتا، شاد قسمیں تو نہ کھا

○

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

اے درد! پتا کچھ تو ہی بتا، اب تک یہ معمہ حل نہ ہوا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں، یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم

میں حیرت و حسرت کا مارا، خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے، آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں، پاس اپنے بلا لیں بہتر ہے!
اب دردِ جدائی سے ان کے اے آہ! بہت بیتاب ہیں ہم

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ! قدر کرو! نایاب نہ ہوں، کم یاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے:
آ جاؤ، جو تم کو آنا ہو، ایسے میں، ابھی شاداب ہیں ہم

○

اسیرِ جسم ہوں، میعادِ قید لا معلوم،
یہ کس گناہ کی پاداش ہے، خدا معلوم!

تری گلی بھی مجھے یوں تو کھینچتی ہے بہت
دراصل ہے مری مٹی کہاں کی، کیا معلوم

تعلقات کا الجھاؤ، ہر طرح ظاہر
گرہ کشائیِ تقدیرِ نارسا معلوم!

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزہ تو یہ ہے نہ منزل، نہ راستا معلوم

دعا کروں نہ کروں، سوچ ہے یہی کہ تجھے
دعا کے قبل مرے دل کا مدعا معلوم

سنی حکایتِ ہستی، تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم

طلب کریں بھی تو کیا شے طلب کریں اے شادؔ
ہمیں کو آپ نہیں اپنا مدعا معلوم

○

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

ہوں اس کوچے کے ہر ذرّہ سے واقف
ادھر سے عمر بھر آیا گیا ہوں

دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم
میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں

سویرا ہے بہت اے شورِ محشر
ابھی بے کار اٹھوایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شادؔ دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

○

کہاں یہ تاب کہ چکھ چکھ کے، یا گرا کے پیوں
ملے بھرا ہوا ساغر تو ڈگڈگا کے پیوں

ہزار تلخ ہے، پیرِ مغاں نے جب دی ہے
خدا نکردہ جو میں منہ بنا بنا کے پیوں

مزہ ہے بادہ کشی کا وہیں تو اے ساقی!
پیوں جواب تو ترے آستاں پہ آ کے پیوں

میں وہ نہیں کہ خود اپنے قدح کی خیر مناؤں؟
پیوں تو بزم میں دس پانچ کو پلا کے پیوں

زمیں پہ جام کو رکھ دے، ذرا ٹھہر ساقی!
میں اس پہ ہو لوں تصدق، تو پھر اٹھا کے پیوں

وہ میکدہ ہے، نہ ساقی ہے، کچھ نہ پوچھو شادؔ
میں کس کے گھر میں پیوں، کس کے گھر سے لا کے پیوں

○

جہاں تک ہو بسر کر زندگی عالی خیالوں میں
بنا دیتا ہے کامل بیٹھنا صاحب کمالوں میں

زباں میں، حلق میں، سینے میں اک مدت سے چھالے ہیں
خدایا نے بھری تھی کس غضب کی آگ نالوں میں

مری آنکھوں سے دیکھو حسنِ صورت کے علاوہ بھی
بہت سی خوبیاں ہیں اور بھی صاحب جمالوں میں

مرے پہلو سے آخر اٹھ گیا غمخوار گھبرا کر
بہت مشکل ہے آکر بیٹھنا آشفتہ حالوں میں

جو آنکھیں ہوں تو چشمِ غور سے اوراقِ گل دیکھو
کسی کے حسن کی شرحیں لکھی ہیں ان رسالوں میں

غم اس الجھاؤ سے چھٹنے کا اے دل تجھ کو ناحق ہے
وہ گیا تیرے لیے کنگھی نہ کرتے اپنے بالوں میں

خوشا وہ صدر میں جن کو جگہ دہ شاہِ خوباں دے
ہمارا ذکر کیا اے شادؔ! ہم ہیں خستہ حالوں میں

○

نگاہباں ہیں کچھ ایسے ادا و نازان کے
کہ بچتے جاتے ہیں لغزش سے پاکبازان کے

تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے
اخیر وقت جب آیا چھپے نہ رازان کے

نظر اٹھانے میں ہوتا ہے بازپرس کا ڈر
جھکائے رکھتے ہیں گردن کو سرفرازان کے

دلوں میں گھر نہیں کرتے جو خود پسندی سے
پھرے ہیں کعبے سے پیچھے نہ پڑھ نمازان کے

مراد یہ ہے کہ آئے نہ راستی پہ کبھی
فلک کو پھانستے ہیں گیسوئے درازان کے

جنھوں نے ناز اٹھائے نہ ناز والوں کے
پسند آئیں گے کیوں کر وہاں نیازان کے

تعلقات ہیں دنیا کے پھنس چکے تھے ہم
بچائے جاتے ہیں گیسوئے فتنہ سازان کے

اجل کے غمزۂ بے جا سمائیں کیا دل میں
تمام عمر اٹھائے ہوئے ہیں نازان کے

نہیں پسند جنھیں شادؔ عاشقانہ کلام
معاف کر دو انھیں دل نہیں گدازان کے

○

ایک ستم اور لاکھ ادائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں، تنگ قبائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہی عالم، ابرِ بہاراں دیدۂ پُرنم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

اپنی ادا سے آپ کھٹکنا، اپنی ہوا سے آپ جھجکنا
چال میں لغزش منہ پہ حیائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہاتھ میں آڑی تیغ پکڑنا، تاکہ لگے بھی زخم تو اوچھا
قصد کہ پھر جی بھر کے ستائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں باغ میں جھولے دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

بھیگے پہر اٹھ اٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدے پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

شادؔ نہ وہ دیدار پرستی اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

○

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مکدر یا مصفا جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہوں
حقیقت میں وہی مے خوار ہے پینا اسی کا ہے

امیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد
جو توڑے یہ طلسم اے دوست گنجینہ اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شادؔ پیری میں
کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینہ اسی کا ہے

ریاض خیرآبادی

○

ہنگامِ نزع، گریہ یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

دل نے مجھے خراب کیا کوئے یار میں
دشمن پہ اعتبار مجھے دوستی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش
سن کر جو پی گئے، یہ مزہ مفلسی کا تھا

وہ کیوں ٹھہرتے نزع میں بالینِ غیر پر
کوئی معاملہ یہ گھڑی دو گھڑی کا تھا

حسرت سے کوئی سوئے فلک دیکھتا تھا آج
لب پر گلہ کسی کا، نہ شکوہ کسی کا تھا

اہلِ حرم بھی آ کے ہوئے تھے شریکِ دور
کچھ اور رنگ آج مری مے کشی کا تھا

لوٹے مزے حیا کے، اٹھائے ادا کے لطف
پہروں سے آج مجھ کو، تصوّر کسی کا تھا

زاہد تمام عمر فرشتہ بنا رہا
اس نے کیا جو کام، یہ کام آدمی کا تھا

جس انجمن میں بیٹھ گیا، رونق آ گئی
کچھ آدمی ریاض عجب دل لگی کا تھا

○

وہ ستاتا ہے، ستاتے جو نہیں تم مجھ کو
دھوکے دیتا ہے بری طرح توہّم مجھ کو

پارسائی کا یقیں غیر کو دلواتے ہیں
اور جو بے ساختہ آ جائے تبسّم مجھ کو

خانقاہیں تو ہزاروں ہیں مگر جی بھی لگے
کہیں تھوڑی سی جگہ دے دو پسِ خم مجھ کو

جس کے ہر قطرے میں تھا وادیِ ایمن پنہاں
بے خودی نے اسی صحرا میں کیا گم مجھ کو

داد خواہوں میں دمِ حشر جو دیکھا ہے ریاض
پیار سے پوچھتے ہیں بھول گئے تم مجھ کو

○

وارفتہ آج کیسی طبیعت چمن میں تھی
صحرا سے کچھ سوا مجھے وحشت چمن میں تھی

بے دورِ جام' باغ میں گزرا تمام وقت
گل ساتھ ساتھ گردشِ قسمت چمن میں تھی

اُجڑا جب آشیاں، تو خزاں کیا، بہار کیا
تنکوں سے آشیاں کے محبت چمن میں تھی

صیاد گھر ترا مجھے جنت سہی، مگر
جنت سے بھی سوا مجھے راحت چمن میں تھی

صحرا کی دیکھ بھال بھی کچھ تھی مرے سپرد
تنکے چنوں چمن کے یہ خدمت چمن میں تھی

اللہ! اس طرح کی جنوں آفریں بہار
جوشِ بہار تھا کہ قیامت چمن میں تھی

سامان سب تھے آج خدا نے بچا لیا
توبہ کے بعد کچھ مری نیت چمن میں تھی

کل ہم گئے تھے، آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے
بے شمع و گل ریاض کی تربت چمن میں تھی

○

پی لی ہم نے شراب پی لی
تھی آگ مثالِ آب پی لی

اچھی پی لی، خراب پی لی
جیسی پائی شراب پی لی

عادت سی ہے نشہ ہے نہ اب کیف
پانی نہ پیا شراب پی لی

چھوڑے کئی دن گزر گئے تھے
آئی شبِ ماہتاب پی لی

منہ چوم لے کوئی اس ادا سے
سرکا کے ذرا نقاب پی لی

منظور تھی شستگی زباں کی
تھوڑی سی شرابِ ناب پی لی

○

او کوسنے والے اب دعا دے
اتنا کہہ دے خدا شفا دے

قطرہ، جمِ بادہ کا مزا دے
شبنم مری پیاس تو بجھا دے

درماں کی طرح تڑپ مزا دے
یارب مجھے دردِ لا دوا دے

صیاد نہ باغ کی ہوا دے
وہ دور سے آشیاں دکھا دے

سب مے کدے ہیں اس سے خالی
دل کو مرے بے خودی خدا دے

یہ دولتِ حسن و دولتِ عشق
بس کی نہیں، جسے خدا دے!

میری شبِ غم کی صبح ہو جائے
تو رخ سے ذرا نقاب اٹھا دے

وہ تارِ نفس کہاں سے لاؤں
ٹوٹے ہوئے دل کی جو صدا دے

گائیں وہ اے ریاضؔ! شرمائیں
تو رو کے یہی غزل سنا دے

○

گل مرقعے ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوق کی، انداز ہیں دیوانوں کے

کعبہ و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی
مے پرستو! یہ کوئی نام ہیں پیمانوں کے

جامِ مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

پر پرواز بنے خود شرر شمع کبھی
شرر شمع بنے پر کبھی پروانوں کے

ذکر کیا اہلِ جنوں کا کہ جب آئی ہے بہار
وہ تو وہ رنگ بدل جاتے ہیں زندانوں کے

آج بت بیٹھے ہیں تقدیر کے مالک بن کر
اب جو لکھا ہے مقدر میں مسلمانوں کے

وسعتِ ذات میں گم وحدت و کثرت ہے ریاضؔ
جو بیاباں ہیں وہ ذرے ہیں بیابانوں کے

○

جی اُٹھے حشر میں پھر جی سے گزرنے والے
یاں بھی پیدا ہوئے پھر آپ پہ مرنے والے

ہے اُداسی شبِ ماتم کی سہانی کیسی
چھاؤں میں تاروں کی نکلے ہیں سنورنے والے

ہم تو سمجھے تھے کہ دشمن پہ اُٹھایا خنجر
تم نے جانا کہ ہمیں تم پہ ہیں مرنے والے

عمر کیا ہے ابھی کم سن ہیں، نہ تنہا لیٹیں
سو رہیں پاس مرے خواب میں ڈرنے والے

نزع میں حشر کے وعدے سے یہ تسکیں بخشی
چین سے سو رہے منہ ڈھانپ کے مرنے والے

صبر کی میرے، مجھے داد ذرا دے دینا
او مرے حشر کے دن فیصلہ کرنے والے

کیا مزہ دیتی ہے بجلی کی چمک مجھ کو ریاضؔ
مجھ سے لپٹے ہیں مرے نام سے ڈرنے والے

○

کوئی جانے، یہی ہیں ایک جلوا دیکھنے والے
یہ موسیٰؑ اچھے آئے جا کے تنہا دیکھنے والے

نئی ناقوس میں پھونکی ہے جس نے روح، وہ ہیں یوں
ابھی موجود ہیں اہلِ کلیسا دیکھنے والے

کھلیں گی بے ثباتی دیکھ کر آنکھیں حبابوں کی
یہی ہیں سر اٹھا کر جوشِ دریا دیکھنے والے

ہم اپنی وضع رندانہ کریں کیوں ترک محشر میں
یہی ہوں گے وہاں بھی اہلِ دنیا دیکھنے والے

گرے غش کھا کے موسیٰؑ، تو صدا یہ طور سے آئی
کھلیں آنکھیں تری؟ کچھ تو نے دیکھا، دیکھنے والے؟

سنو افسانۂ جم! جام رکھ کر سامنے اُن کے
ابھی دو چار ہیں جم کا زمانا دیکھنے والے

نشیمن میں نہیں ہیں، تو شرار و برق کیوں جائیں
یہ جا کر، کون میرا آشیانا دیکھنے والے

یہ جتنے پینے والے ہیں ریاضؔ ان سب کے مرشد ہیں
ہمیشہ جام مے میں نورِ حق کا دیکھنے والے

○

وحدت پکارتی ہے، وہ کثرت سے دُور ہے
ہر انکشافِ رازِ حقیقت سے دُور ہے

دونوں ہیں ایک میرے لیے عیش ہو کہ غم
میرا مقام دوزخ و جنت سے دُور ہے

ہل چل ہیں حشر کی، نہیں موقع وصال کا
وقتِ وفائے عہد، قیامت سے دُور ہے

آئینہ مثال میں ہوں، حسنِ بے مثال
لیکن وہ عکس ہوں کہ جو صورت سے دُور ہے

میں نے کرم جان کے تجھ کو، کیے گناہ
بخشے نہ تو مجھے، تری رحمت سے دُور ہے

توبہ کے بعد بھی مجھے پہنچے نہ تجھ سے فیض
ساقی یہ تیری چشمِ مروت سے دُور ہے

اے شیخ! اس کی چھاں بھی نہیں خلد کو نصیب
یاروں کا میکدہ تری جنت سے دُور ہے

اس کی بلا سے چاہے قیامت کبھی نہ آئے
ہو جائے صبح، یہ شبِ فرقت سے دُور ہے

پینے کے تو نہیں ہیں توبہ کبھی ریاض
ساغر سے ہاتھ اٹھائیں یہ حضرت سے دُور ہے

○

جس دن سے حرام ہو گئی ہے
مے، خلد مقام ہو گئی ہے

قابو میں ہے ان کے وصل کا دن
جب آتے ہیں شام ہو گئی ہے

آتے ہی قیامت اس گلی میں
پامالِ خرام ہو گئی ہے

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے، جام ہو گئی ہے

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

مے نوش ضرور ہیں وہ نا اہل
جن پر یہ حرام ہو گئی ہے

بجھ بجھ کے جلی تھی قبر پر شمع
جل جل کے تمام ہو گئی ہے

ہر بات میں ہونٹ پر ہے دشنام
اب حسنِ کلام ہو گئی ہے

ہے دُور ابھی ریاض منزل
دن ختم ہے، شام ہو گئی ہے

آزاد انصاری

○

لطف کی آنکھوں سے کیا دیکھا!
آہ! کسی مصرف کا نہ رکھا

آج تک آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں
آہ! وہ پیارا پیارا جلوا

دھم نہ کھانا، ٹھیک نہیں ہے
دیکھو! سستا کر کچھ نہ ملے گا

دامنِ غفلت چھوٹ نہ جائے
آنکھ اٹھا کر، دیکھ نہ لینا

زیست کے دن کاٹے نہیں کٹتے
کاش! ترا ارمان نہ ہوتا

آہ ہماری ناؤ کی حالت
موجیں حائل، طوفاں برپا

آزاد آپ اور قیدِ علائق
"مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ"

○

مے پی، دل کو غم سے نہ پاٹ
خوش جی، اور خوش جی کر کاٹ

آہ! خیالِ فرقتِ دوست
جی بھی بے کل، دل بھی اُچاٹ

جور و جفا کی خُو تو نہ ڈال
مہر و وفا کی جڑ تو نہ کاٹ

رہبرِ حیرت! دیکھ کے چل
غافل! آگے راہ نہ گھاٹ

ارض و فلک، سب سرگرداں
جس کو دیکھو، بارہ باٹ

آزاد آپ اور اتنی ڈُون
"بل بے تندی تیرا پاٹ"

○

کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ!
بھاگ! بلائے عشق سے بھاگ

زلفوں والو! یہ اندھیر
دہرے دہرے کالے ناگ

ماشاء اللہ! طرزِ کلام
جیسے کوئی دلکش راگ

قتلِ جہاں اور پھر یہ ستم
"ہولی ہے ہولی، پھاگ ہے پھاگ!"

میرا سر اور تیرا در
دشمن مری قسمت، دشمن مرے جاگ

خوابِ غفلت، ٹھیک نہیں
جاگ! اے غافل، وقت ہے جاگ

حیف آزادِ دانا حیف
تم اور الفت کا کھڑاگ

○

امید، سو وہ مفقود۔ ارمان، سو وہ معدوم
اے وائے دلِ مرحوم! صد وائے دلِ مرحوم

طالب ہوں، مگر ناکام۔ سائل ہوں، مگر محروم
تقدیر، مری تقدیر، مقسوم، مرا مقسوم

اب دل کی نہ کچھ پوچھو، اب دل کا خدا حافظ
مانوس نہ کچھ مایوس، مسرور نہ کچھ مغموم

بس عذرِ خطا کب تک، بس شکرِ جفا کب تک
ظاہر ہے کہ تو ظالم، ثابت ہے کہ ہم مظلوم

قسمت سے وہ ملزم ہوں، شامت سے وہ مجرم ہوں
جو داد سے بھی محروم، بے داد سے بھی محروم

غمخوار یہ کہتے ہیں: "درمانِ غم آساں ہے"
آثار یہ کہتے ہیں: "خیریتِ جاں معلوم"

آزاد کی مے خواری، آزاد کا حصہ تھی
جب پی تو یہ کہہ کر پی: "النادر کالمعدوم"

○

نہ پوچھو! کون ہیں، کیوں راہ میں ناچار بیٹھے ہیں
مسافر ہیں، سفر کرنے کی ہمت ہار بیٹھے ہیں

اُدھر پہلو سے تم اُٹھے، اِدھر دنیا سے ہم اُٹھے
چلو، ہم بھی تمھارے ساتھ ہی تیار بیٹھے ہیں

کسے فرصت ہے، کہ فرضِ خدمتِ الفت بجا لائے
نہ تم بے کار بیٹھے ہو، نہ ہم بے کار بیٹھے ہیں

جو اُٹھے ہیں، تو گرمِ جستجوئے دوست اُٹھے ہیں
جو بیٹھے ہیں، تو محوِ آرزوئے یار بیٹھے ہیں

مقامِ دستگیری ہے کہ تیرے رہروِ الفت
ہزاروں جستجو میں کر کے ہمت ہار بیٹھے ہیں

نہ پوچھو، کون ہیں، کیا مدعا ہے، کچھ نہیں بابا
گدا ہیں اور زیرِ سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

یہ ہو سکتا نہیں، آزاد سے میخانہ خالی ہو
وہ دیکھو! کون بیٹھا ہے، وہی سرکار بیٹھے ہیں

○

سخت مشکل ہے کہ اس کا جاننا ممکن نہیں
اور بے جانے، ہمارا ماننا ممکن نہیں

زندگی بھر جاننے کی کوششیں کرنے کے بعد
صرف یہ جانا: یہاں کچھ جاننا ممکن نہیں

وہ یہ کہتے ہیں: ہمیں پہچاننے کی سعی کر
اور یہاں اپنے کو بھی پہچاننا ممکن نہیں

وحدتِ بے لوث ہاتھ آئے تو کیوں کر ہاتھ آئے
کثرتیں اتنی ہیں، جن کا چھاننا ممکن نہیں

مادّے کی ساری تعریفات برحق، لیکن اب
روح کو آلودگی میں ساننا ممکن نہیں

رازِ عالم تا زباں لانا تو ممکن ہے مگر
سارے عالم سے لڑائی ٹھاننا ممکن نہیں

کچھ ہو، اب ناقص کو کامل جاننا امرِ محال
کچھ ہو، اب ممکن کو واجب ماننا ممکن نہیں

منکرِ عرفانِ حق! بجا، شبہ و شک بالکل فضول
ظرفِ قابل لے کے آ، عرفان ناممکن نہیں

عقل والو! عقل پر غرّہ تو اک حد تک درست
لیکن اس کو عقل سے پہچاننا ممکن نہیں

حضرتِ آزاد اب ہم ہیں اور اک ایسا جہاں
جس جہاں کو منقلب گرداننا ممکن نہیں

○

(بہ صنعت ترصیع جدید)

وہ تیرا دل میں رہ کر، آنکھ سے مستور ہو جانا
وہ میرا باوجودِ قرب، تجھ سے دور ہو جانا

وہ تیرا، میری امیدوں کو بے دردی سے ٹھکرانا
وہ میرا شیشۂ دل، سنگِ غم سے چور ہو جانا

وہ تیرا جور پر تاکیدِ شکرِ جور فرمانا
وہ میرا امتثالِ امر سے معذور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو آخر مژدۂ یاس وفا دینا
وہ میری غم نصیب امید کا مسرور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو آخر اپنی منزل کا پتا دینا
وہ میری جد و جہدِ شوق کا مشکور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنے درد کی دولت عطا کرنا
وہ میرے دامنِ امید کا بھرپور ہو جانا

وہ تیرا مجھ کو اپنی لمِ یزل الفت عطا کرنا
وہ میرا سرمدی تسکین سے معمور ہو جانا

خوشا آزاد کا فیضانِ صحبت جس نے سمجھایا
خدا کا قرب کیا شے ہے، خودی سے دور ہو جانا

○

جو حال دیکھتے ہو، وہ خود عرضِ حال ہے
درویش ہوں، فقیر ہوں، صورت سوال ہے

اب دل ہے اور دل میں تمھارا خیال ہے
اور وہ خیال، جس کا بھلانا محال ہے

ایسا نہ ہو کہ ضبطِ شکایت نہ ہو سکے!
للہ یہ نہ پوچھ کہ "جی کیوں نڈھال ہے؟"

اچھا! اک آرزو نہ سہی، دل کا کیا علاج
دل بھی تو آرزو کی طرح پائمال ہے

اے طاقتِ جواب! یہ بے اعتنائیاں؟
کم بخت! دیکھ تو، کوئی پرسانِ حال ہے

یہ کون چاہتا ہے کہ "افشائے راز ہو!"
یہ عرض تھی کہ "ضبطِ تمنا محال ہے!"

آزاد دل کا درد چھپانے سے فائدہ؟
صورت ہی کہہ رہی ہے: طبیعت نڈھال ہے!

○

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے
امّید تو نہیں ہے۔ مگر ہاں خدا کرے

تکرارِ لن ترانی پیہم روا، نہ رکھ
ایسا نہ ہو کہ شوقِ تماشا گلا کرے

کیا فائدہ؟ کہ شکوۂ جور و جفا کروں
کیا جانتا نہیں ہوں کہ تو اور وفا کرے؟

شاید تمہیں ہنوز یہ الفاظ یاد ہوں
"تجھ سے دغا کرے، تو خدا سے دغا کرے"

اب میں ہوں اور کوششِ ترکِ تعلقات
شاید یہی علاج کوئی فائدہ کرے!

درویش کی پرکھ ہے، تو درویش کی سنو!
درویش کی صدا ہے کہ "داتا بھلا کرے!"

آزاد! اجرِ خوفِ جزا، امرِ حق سہی
لیکن تری بلا، غمِ روزِ جزا کرے

○

بے خبر! وہ جو بنائے دوسرا بھی عشق ہے
کارِ انساں ہی نہیں، کارِ خدا بھی عشق ہے

سمِ قاتل بھی ہے، تریاقِ شفا بھی عشق ہے
موت بھی ہے موت کے دکھ کی دوا بھی عشق ہے

رہرو! راہِ محبت میں نڈر آگے بڑھو
صرف رہزن ہی نہیں ہے، رہنما بھی عشق ہے

مشکلاتِ عشق سے گھبرا نہ جانا چاہیے
مشکلاتِ عشق کا مشکل کشا بھی عشق ہے

شیخ صاحب! عشق کارِ اہلِ عصیاں ہی نہیں
پیر و مرشد! مسلکِ اہلِ صفا بھی عشق ہے

زندگی میں ترکِ شغلِ عشق کیوں کر کیجیے!
زندگی بھی، زندگی کا مدعا بھی عشق ہے

آؤ! اب آزاد! آسن مار بیٹھیں اور جییں
آتما بھی عشق ہے، پرماتما بھی عشق ہے

آرزوؔ لکھنوی

○

کس مست سے ساقی آنکھ لڑی متوالا بنا لہرا کے گرا
آگے تو ہیں راہیں اور کٹھن دل پہلے ہی ٹھوکر کھا کے گرا

دل شوق کے جوش میں دوڑ پڑا اور شوق تو ہوتا ہے اندھا
در بند پڑا تھا قسمت کا ٹکر جو لگی تیورا کے گرا

کیا عشق کی منزل بھی تھی کٹھن بندھ بندھ کر ہمت ٹوٹ گئی
جو ایک قدم چل کر سنبھلا وہ دو قدم آگے جا کے گرا

سلگی ہوئی ہے غم کی بھٹی دل کیوں نہ پگھل کر ہو پانی
جو قطرہ آنسو بن کے بہا لہرا کے چلا تیورا کے گرا

جو نالہ فلک سے ٹکرایا وہ آرزو اک تارا ٹوٹا
دشمن کی طرف جو لپکا تھا وہ شعلہ مجھی پر آ کے گرا

○

بجھے جی کا اگلا سا جلنا کہاں اب
دھواں سا تو ہے لو نکلنا کہاں اب

وہ ہر آنے والے پہ دھوکا اُنہی کا
وہ گھبرا کے گھر سے نکلنا کہاں اب

رہا کرتا ہے جی بھی ڈوبا ہوا سا
وہ ہاتھوں کلیجہ اچھلنا کہاں اب

پڑے رہتے ہیں یونہی منہ کو لپیٹے
وہ اُٹھ اُٹھ کے پہروں ٹہلنا کہاں اب

للک ہو کسی کی تو ہو کیں بھی اُٹھیں
تڑپ کر وہ کروٹ بدلنا کہاں اب

لگی تک تھا سب کا لگانا بجھانا
جلانا کہاں اب ہے جلنا کہاں اب

اٹھا اور گرا آرزو اس گلی میں
نہیں پاؤں جمتے سنبھلنا کہاں اب

○

سب کی متیں پلٹ گئیں بنکیں بندھی ہوئی ہوائیں
جی ہی نہیں اُداس اُداس کرتا ہے بن بھی سائیں سائیں

اچھا ہے جو گزر چکی آپ بھی اس کو بھول جائیں
سنتا ہے کون دھر کے کان لمبی کتھا کسے سنائیں

کوس کڑے تھے چاہ کے دھوپ میں تیور آ گئے
ہم یہی سوچتے رہے چھاؤں ملے تو بیٹھ جائیں

پوچھ نہ مار کر پلک لمبی سی سانس لی تھی کیوں
پھر ہوئی ویسی ہی کھٹک کاہے کی ہے یہ کیا بتائیں

آگ سی لگی ہوئی چھوڑ دو ہٹو الگ رہو
بجلی ہے ایک ایک نس ہاتھ کہیں نہ جھنجھنائیں

جس نے کہ چین کھو دیا ہے وہی جی کا چین بھی
یہ بھی نہیں کہ رکھیں دھیان یہ بھی نہیں کہ بھول جائیں

چاند سے منہ کی ہے وہ چھوٹ جیسے دمکتی بجلیاں
دیکھنے کی ٹھہر چکی آنکھیں رہیں کہ پھوٹ جائیں!

چپ ہیں تو یہ کہ چپ ہو کیوں بولیں تو ہاں یہ کیا کہا
بھید ہی بھید تو ہیں سب کس سے بتائیں کیا بتائیں

اس کی گلی میں آ ڈٹے آرزو اب ہٹیں گے کب
اس سے ہو چاہے تو تکرار اس سے ہو چاہے جھائیں جھائیں

○

بھولے بن کر حال نہ پوچھو بہتے ہیں اشک تو بہنے دو
جس سے بڑھے بے چینی دل کی ایسی تسلی رہنے دو

رسمیں اس اندھیر نگر کی نئی نہیں یہ پرانی ہیں
مہر پہ ڈالو رات کا پردہ ماہ کو روشن رہنے دو

روح نکل کر باغِ جہاں سے باغِ جناں میں جا پہنچے
چہرے پر اپنے میری نگاہیں اتنی دیر تو رہنے دو

خندۂ گل بلبل میں ہو گا گل میں نغمہ بلبل کا
قصہ ایک زبانیں دو ہیں آپ کہو یا کہنے دو

اپنا جنونِ شوق دیا کیوں خوف جو تھا رسوائی کا
بات کرو خود قابلِ شکوہ اُلٹے مجھ کو ملنے دو

○

اوّلِ شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

قید کو توڑ کے نکلا جب میں اُٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے
دشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

خون ہی کی شرکت وہ نہ کیوں ہو شرکت چیز ہے جھگڑے کی
اپنوں سے وہ دیکھ رہا ہوں جو نہ کرے بیگانہ بھی

ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسبِ مراتب ہیں
لَو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

دونوں جولانگاہ جنوں ہیں بستی کیا ویرانہ کیا
اُٹھ کے چلا جب کوئی بگولا دوڑ پڑا دیوانہ بھی

وحدت میں کی کثرت پیدا جلووں کی پاشانی نے
ایک ہی جا تھا کچھ دن پہلے کعبہ بھی بتخانہ بھی

غنچے چپ ہیں گُل ہیں ہوا پر کس سے کہئے جی کا حال؟
خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اُڑ کے چلا پروانہ بھی

دورِ مسرت آرزو اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے چھوٹ پڑا پیمانہ بھی

○

ہوگئیں کیاریاں ہری جیسے کہ رُت پلٹ گئی
کون یہ مسکرا دیا، ہنسنے لگی کلی کلی!

کھلنے کی آس میں یہاں ڈال گئے تھے اک کلی
رو کے اُٹھا رہے ہیں آج پنکھڑیاں ملی دلی

تاروں کو دیکھتے ہیں سب اور یہ دیکھتا ہوں میں
آئی کہاں سے یہ چمک کس کی ہے یہ جھلا جھلی

رب سے بڑا ہوا تھا دن آئے تھے دیکھنے کبھی
آنکھیں جو چوندھیا گئیں مچ گئی جیسے کھل بلی

دن کی بھی آس ہے یہاں رات کی مگر چاندنی
کتنی رُتیں پلٹ گئیں ڈال کبھی نہ یہ پھلی

چاہ کے ساتھ جی کی تھاہ پائی ہے اور نہ پاؤ گے
ایک ہے دوسرے کی آڑ دونوں میں یوں گھلی ملی

اس کے لیے کہ آرزو بنتا ہوا تھا ساتھ ساتھ
ڈھونڈھتا ہوں بن کے بن چھان پھرا گلی گلی

○

گتھم بات پہیلی ایسی بس وہی بُوجھے جس کو سُجھائے
بھید نہ پائے تو گھبرائے بھید جو پائے تو گھبرائے

مجھ سا باتیں بنانے والا ہنس کے ہنسائے رو کے رُلائے
جب وہ بلائیں اسے کیا کہیے جائے تو منہ تکتا رہ جائے

جس کو اکیلے میں آ آ کر دھیان ترا رہ رہ کے ستائے
چپکے چپکے بیٹھا روئے آنسو پونچھے اور رہ جائے

اچھا اچھا ہنس لو ہنس لو اب نہ کہو گے کوئی بات
ایسا بھولا کوئی نہیں ہے جان کے پھر دھوکا کھائے

ساری کہانی بے چینی کی ماتھے پہ لکھ دیتی ہے
ایسی بات کہ گھٹتے گھٹتے منہ تک آئے اور رہ جائے

چاہ کی بات کھٹکتا کانٹا جس کی بے چینی میں چین
منہ سے نکالے تو پچھتائے جی میں رکھے تو پچھتائے

چپ سے چھپے گی چاہت کیوں کر جب اس میں یہ کھٹکا ہے
اپنی بیتی ایک سے کہے اور جگ بیتی کا بھرم کھل جائے

چھیڑ کے پوچھ پوچھ کے سمجھو ان کے منہ ایسی بات سنو
آس لگا کر کہنے والا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے

ایک نہ سننے والے سے کہنا پتھر سے ٹکرانا ہے
بات بھی وہ جو ڈرتے ڈرتے ہو کے ادھوری منہ تک آئے

چاہت کی ہر بات ہے اُلٹی، مت اُلٹی رونا اُلٹا
جتنا سو سوچی اور رُکے یو نہ رُکے ندی بہہ جائے

سکھ بھی وہی دیتا ہے دکھ بھی پھر کاہے کا رونا ہے
یہ تو ہے اپنی اپنی بھاون جیسا مانگے ویسا پائے

اس کی چوٹ ترسنے والا کھوٹ بھی کرتے ڈرتا ہے
جیسے بے بس سانپ چھبیلا پلٹے کھا کھا کر رہ جائے

آرزو ایسے یوں بہتیرے سنس مکھ پھر کوئی نہیں
چین گنوا لے بے چینی کو ہائے کرے اور ہنستا جائے

○

دکھ روگ کو چاہت کے سکھ روگ بنانا ہے
دہکا ہوا انگار اچھاتی سے لگانا ہے

کھسیانی ہنسی ہنسنا اک بات بنانا ہے
ٹپکے ہوئے آنسو کو پلکوں سے اُٹھانا ہے

کیوں مرتے ہیں ہم تم پر اس "کیوں" کو نہ کچھ پوچھو
پانی نہیں پینا ہے اور پیاس بجھانا ہے

جو آپ سے گزرا ہے پہنچا ہے وہی تجھ تک
جو آپ کو بھولا ہے اس نے تجھے جانا ہے

ہم یونہی نہیں چپ ہیں کیوں چپ ہیں نہ یہ پوچھو
بات اپنی بنانا ہے بھید ان کا چھپانا ہے

اُٹھنا تری چوکھٹ سے اور سوچ کے یہ اُٹھنا
جائیں تو کدھر جائیں پچھتا کے پھر آنا ہے

چپ ایک پہیلی ہے سوچو گے تو بوجھو گے
تم سے وہی کہنا ہے جو سب سے چھپانا ہے

دکھ میں بھی ہنسی آئے یہ آن ہے چاہت کی
چڑھتی ہوئی ندی ہے اور پیر کے جانا ہے

ہاں آرزو اچھا ہے جا اور بھی دکھ جھیلو
سمجھایا ہے جب تم کو کہنا نہیں مانا ہے

○

آگئی پیری، جوانی ختم ہے
صبح ہوتی ہے، کہانی ختم ہے

حسرتوں کا دل سے قبضہ اٹھ گیا
غاصبوں کی حکمرانی ختم ہے

ہوگیا ذوقِ نظارہ خود فنا
یا بہارِ بوستانی ختم ہے

ماجرائے غم چراغِ صبح کا
ختم اور اپنی زبانی ختم ہے

صورتِ تیغ بستہ ہے جوشِ گداز
بہتے دریا کی روانی ختم ہے

ذکرِ غم میں لذتِ غم پھر کہاں
اپنے ساتھ اپنی کہانی ختم ہے

آرزو تھا اک اندھیرے کا چراغ
اس کی بھی اب ضو فشانی ختم ہے

○

ہیرا ابھی ہے دل تو پتھر ہے، یوں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے
ہاں پانی ہو کر بہہ نکلے، پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

سو پلٹے کھائے زمانے نے، اور دل کا رنج خوشی نہ بنا
کیا موت کی نیند میں ہے قسمت جو ایک ہی کروٹ سوتی ہے

وہ نازِ غضب یہ نازِ ستم، دم بند ہے اور جینا مشکل
چپ ہیں تو ستائے جاتے ہیں، بولیں تو شکایت ہوتی ہے

غم خواری جب کا وش رکھتیں، راحت کی امید کروں کس سے
اب نیند بھی راتوں کو آ کر کانٹے آنکھوں میں چبھوتی ہے

اس فیصلے پر تیرے ظالم رونے کی ہے قابل حالتِ دل
ٹوٹا نہ اگر تو پتھر ہے اور چور ہوا تو موتی ہے

الفت میں خموشی پر میری حیرت میں ہیں جو یہ کیا جانیں
پڑتا ہے داغ کلیجے میں اور مہر لبوں پر ہوتی ہے

اے آرزو اب ہم چشموں میں ہے غلت کا اس کے خدا حافظ
جس دل میں جہاں کی نیرنگی سب سرد و گرم ہوتی ہے

علامہ اقبال

○

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے، محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا، کہ چھپا ہوا ہو، سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو، تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

دمِ طوف، کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی، تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

○

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ! کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی،
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں، مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں، اے اہلِ محفل!
چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں، سزا چاہتا ہوں

○

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں، زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

اگر کچھ آشنا ہوتا، مذاقِ جبہ سائی سے
تو سنگِ آستانِ کعبہ، جا ملتا جبینوں میں

کبھی اپنا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں!
کہ لیلیٰ کی طرح، تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مہینے وصل کے، گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی، گزرتی ہیں مہینوں میں

مجھے روکے گا تو اے ناخدا! کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو، ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

تمنا دردِ دل کی ہو، تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر، بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک، اپنے خرمنِ دل کو
کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

محبت کے لیے، دل ڈھونڈ! کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے، جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

خموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے، محبت کے قرینوں میں

برا سمجھوں انھیں، مجھ سے تو ایسا ہو نہیں سکتا
کہ میں خود بھی تو ہوں اقبال اپنے نکتہ چینوں میں

○

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سورج میں، تارے میں

شریعت کیوں گریباں گیر ہو، ذوقِ تکلم کی!
چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعارے میں

جو ہے بیدار انساں میں، وہ گہری نیند سوتا ہے
شجر میں، پھول میں، حیواں میں، پتھر میں، ستارے میں

مجھے پھونکا ہے سوزِ قطرۂ اشکِ محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو
وہ سوداگر ہوں، میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبال میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

○

انوکھی وضع ہے، سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق، کون سی بستی کے یارب! رہنے والے ہیں

علاجِ درد میں بھی، درد کی لذّت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے، نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب! چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

نہ پوچھو! مجھ سے لذّت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

نہیں بیگانگی اچھی، رفیقِ راہِ منزل سے
ٹھہر جا، اے شرر! ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

○

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پختہ ہوتی ہے، اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش، تو ہے خام ابھی

بے خطر کود پڑا، آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے، محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں، معنیِ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے، آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زنّاریِ بت خانۂ ایام ابھی

عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

سعیِ پیہم ہے، ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی

ابرِ نیساں! یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک؟
میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب
میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار، پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

○

نہ آتے، ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمھارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ، مستی میں ہشیار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد!
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی؟

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی، تیری گفتار کیا تھی

○

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا، تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق، تو آنکھوں کو بند کر!
ہے دیکھنا یہی، کہ نہ دیکھا کرے کوئی

عذر آفرینِ جرمِ محبت ہے حسنِ دوست
محشر میں عذرِ تازہ نہ پیدا کرے کوئی

نظارہ کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق کے
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

○

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

نہ کر دیں مجھ کو مجبورِ نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمیِ محفل نہ بن جائے

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو
یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

کہیں اس عالمِ بے رنگ و بو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ دنبالۂ محمل نہ بن جائے

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

○

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن!

حسرت موہانی

○

سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا

آنکھیں تری جو ہوش ربائی میں فرد ہیں
ان میں یہ سحر کاریِ رنگِ حیا ہے کیا

گر جوشِ آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

آتے ہیں وہ خیال میں کیوں میرے بار بار
عشقِ خدا نما کی یہی ابتدا ہے کیا

اک برقِ مضطرب ہے کہ اک سحرِ بے قرار
کچھ پوچھئے نہ وہ نگہِ فتنہ زا ہے کیا

اس درجہ دل پذیر ہے آہنگِ نغمہ کیوں
پنہاں لباسِ درد میں تیری صدا ہے کیا

چل بھی دئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

نزدیک بامِ یار سے ہے نردبانِ عشق
اے دل! یہ جائے حوصلہ ہے دیکھتا ہے کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

○

لایا ہے دل پہ کتنی خرابی
اے یار! تیرا حسنِ شرابی

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

ق

عشرت کی شب کا وہ دورِ آخر
نورِ سحر کی وہ لاجوابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں
کیفیت ان کی وہ نیم خوابی
بزمِ طرب ہے وہ بزم، کیوں ہو
ہم غم زدوں کو واں باریابی

ق

اس نازنیں نے باوصفِ عصمت
کی وصل کی شب وہ بے حجابی
شوق اپنی بھولا گستاخ دستی
دل ساری شوخی، حاضر جوابی
وہ روئے زیبا ہے جانِ خوبی
ہیں وصف جس کے سارے کتابی
اس قیدِ غم پر قربان حسرت
عالی جنابی، گردوں رکابی

○

بھلاتا لاکھ ہوں، لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی! ترکِ الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشتِ خود فراموشی کے چکر یاد آتے ہیں

نہیں آتی، تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

○

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوقِ بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عیش کی
اب نظر کاہے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغاز وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

○

توڑ کر عہدِ کرم ناآشنا ہو جائیے
بندہ پرور! جائیے، اچھا خفا ہو جائیے

میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جائیے

خاطرِ محروم کو کر دیجیے محوِ الم،
درپئے ایذائے جانِ مبتلا ہو جائیے

راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو از راہِ ستم
ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جائیے

گر نگاہِ شوق کو محوِ تماشا دیکھیے
قہر کی نظروں سے مصروفِ سزا ہو جائیے

میری تحریرِ ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب
دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہو جائیے

مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جائیے

ہاں! یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُرجفا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے
اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجے نکال
آرزوئے شوق سے ناآشنا ہو جائیے

کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر!
مائلِ آرام و مشتاقِ شفا ہو جائیے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر بے نیازِ مدعا ہو جائیے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جائیے

ہائے ری بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو، مگر
اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے

چاہتا ہے مجھ کو تو بھولے نہ بھولوں میں تجھے
تیرے اس طرزِ تغافل کے فدا ہو جائیے

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرتؔ جی میں ہے
چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جائیے

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

با ہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

بار بار اُٹھنا اسی جانب نگاہِ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردہ کا کونا، دفعتہً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پابوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر، وہ مسکرانا یاد ہے

تجھ کو تنہا جب کبھی پانا، تو ازراہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو! کچھ تم کو بھی وہ کارخانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے، راتوں کو آنا یاد ہے

آگیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رُلانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بُلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے، تیرا بلانا یاد ہے

میٹھی میٹھی چھیڑ کی باتیں نرالی پیار کی
ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اُڑانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا، تو پھر خود رُوٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں، پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا، وہ گدگدانا یاد ہے

باوجود ادعائے اتقا حسرتؔ مجھے
آج تک عہدِ ہوس کا وہ فسانا یاد ہے

○

یاد ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

وہ سراپا ناز تھا، بیگانۂ رسمِ جفا
اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں
التماسِ عذر و تمہیدِ شکایت کے مزے

صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا ان کی عیادت کے مزے

○

تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہُوا
ہم سے پھر بھی ترا گلا نہ ہُوا

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی
دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہُوا

جانِ عاشق نثارِ دوست ہوئی
شادیٔ مرگ کا بہانہ ہُوا

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہُوا

کچھ عجب چیز ہے وہ چشمِ سیاہ
تیر جس کا کبھی خطا نہ ہُوا

حیف ہے اس کی بادشاہی پر
تیرے کوچہ کا جو گدا نہ ہُوا

مر مٹے ہم تو مٹ گئے سب رنج
یہ بھی اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا

جب تلک میرے دل میں جاں رہی
دردِ مایوس مرحبا نہ ہُوا

مل گئی مجھ کو صبرِ عشق کی داد
وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہُوا

تابعِ رنجِ عشق تھا حسرت
عیشِ دنیا سے آشنا نہ ہُوا

○

یہ کار گئے، باصفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

نہ جانا کہ شوق اور بھڑکے گا میرا
وہ سمجھے کہ اس سے جدا ہو گئے ہم

دمِ واپسیں آئے پُرسش کو ناحق
بس اب جاؤ! تم سے خفا ہو گئے ہم

جب ان سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا
تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم

فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت
سزاوارِ خلدِ بقا ہو گئے ہم

○

ہم حال انھیں یوں دل کا سنانے میں لگے ہیں
کچھ کہتے نہیں پاؤں دبانے میں لگے ہیں

اور ایسے کہاں حیرت و حسرت کے مرقعے
اے دل! جو ترے آئنہ خانے میں لگے ہیں

کہنا ہے انھیں یہ کہ "نہ ہم ہوں گے مخاطب"
پر کہتے نہیں زلف بنانے میں لگے ہیں

کچھ ہوش سر و پا کا نہیں، رندِ خرابات
ابھی ہے گھٹا دھوم مچانے میں لگے ہیں

قاتل! ترے دامن پہ مرے خون کے دھبے
کچھ اور بھی خنجر سے چھٹانے میں لگے ہیں

ہر دم ہے یہ ڈر، پھر نہ بگڑ جائیں وہ حسرت
پھر دل جنھیں رو رو کے منانے میں لگے ہیں

اصغر گونڈوی

○

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُرآشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

کچھ دعوئ تمکیں میں ہے معذور بھی زاہد
مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا، تو گریباں نہیں دیکھا

شائستۂ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغر
کافر نہیں دیکھے، کہ مسلماں نہیں دیکھا

○

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا؟ اے واعظِ ناداں!
ہزاروں بن گئے کعبے، جبیں میں نے جہاں رکھ دی

قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل، معاذ اللہ!
کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی

کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں
بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے!
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

○

جانِ بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی
اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

بے محابا ہو اگر حسن، تو وہ بات کہاں
چھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

خود ہی گل سے لپٹ کر وہیں مرجھانا تھا
اب کرے کیوں گلۂ تنگیٔ داماں کوئی

کیا مرے حال پہ سچ مچ انھیں غم تھا قاصد؟
تو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی؟

کیا کرے زاہدِ بے چارہ، اسے کیا معلوم؟
رحم کرتا ہے بہ اندازۂ عصیاں کوئی

دل میں اک بوند لہو کی نہیں، رونا کیسا
اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

اب اسے ہوش کہوں یا کہ جنوں اے اصغر
مجھ کو ہر تار میں ملتا ہے گریباں کوئی

○

کیا کیجئے! جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو
سیراب کر دیا دلِ منت گزار کو

جوشِ شباب، نشۂ صہبا، ہجومِ شوق
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

ہر ذرہ آئینہ ہے کسی کے جمال کا
یوں ہی نہ جانیے مری مشتِ غبار کو

میرے مذاقِ شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ
میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو

ہاں! اے نگارِ خوبی و اے جانِ دلبری
تو نے حیات بخشی ہے صبحِ بہار کو

اس جوئبارِ حسن سے سیراب ہے فضا
روکو نہ اپنی لغزشِ مستانہ وار کو

تھی بوئے دوست موجِ تبسم سحر کے ساتھ
یہ اور لے اڑی مری مشتِ غبار کو

یہ رازِ دل ہے ہستیٔ کل کائنات ہے
دیکھیں حضور دیدۂ امیدوار کو

کچھ اور ہی فضا دلِ بے مدعا کی ہے
دیکھا ہے روزِ وصل و شبِ انتظار کو

اصغر نشاطِ روح کا اک کھِل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

○

صحنِ حرم نہیں ہے، یہ کوئے بتاں نہیں
اب کچھ نہ پوچھئے کہ کہاں ہوں کہاں نہیں

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیّر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

اب ہو تو سنگِ وخشت سے سر کو سکون ہو
وہ آستاں نہیں، تو کوئی آستاں نہیں

سارا حصول، عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے، وہی رائیگاں نہیں

کسبِ حیات تو، تری ہر ہر ادا سے ہے
مرنا پسندِ خاطرِ اربابِ جاں نہیں!

تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت
سب کچھ سہی، مگر وہ ترا آستاں نہیں

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں، مگر بے زباں نہیں

فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

دیکھوں! ہجومِ غم میں وہ لے کس طرح خبر
یہ اس کا امتحاں ہے، مرا امتحاں نہیں

اب اس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیف ہے
مجھ کو دماغِ صحبتِ روحانیاں نہیں

○

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا، اسے غمِ جاناں بنا دیا

یوں مسکرائے، جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اے شیخ! وہ بسیطِ حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

اِک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

وہ شورشیں، نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

بلبل بہ آہ و نالہ و گل مست رنگ و بو
مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

کہتے ہیں: اک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

عالم سے بے خبر بھی ہوں، عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اس حسنِ کاروبار کو مستوں سے پوچھیے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

○

جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشم بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

یہ عارض پر نور یہ زلفیں ہیں پریشاں
کم بخت! نکل گر ہی شام و سحر سے

مے دافع آلام ہے، تریاق ہے لیکن
کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

وہ شوخ بھی معذور ہے مجبور ہوں میں بھی
کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے

اس عالم ہستی میں نہ مرنا ہے نہ جینا
تو نے کبھی دیکھا نہیں مستوں کی نظر سے

جاں بازوں کے سینے میں ابھی اور بھی دل ہیں
پھر دیکھئے اک بار محبت کی نظر سے

○

نہ ہوگا کاوشِ بے مدعا کا راز داں برسوں
وہ زاہد، جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

کچھ اس انداز سے چھیڑا تھا میں نے نغمۂ رنگیں
کہ فرطِ ذوق سے جھومی ہے شاخِ آشیاں برسوں

جبینِ شوق لائی ہے وہاں سے داغِ ناکامی
یہ کیا کرتی رہی کم بخت، ننگِ آستاں برسوں

وہی تھا حال میرا، جو بیاں میں آ نہ سکتا تھا
جسے کرتا رہا افشا سکوتِ راز داں برسوں

نہ پوچھو! مجھ پہ کیا گزری ہے میری مشقِ حسرت سے
قفس کے سامنے رکھا رہا ہے آشیاں برسوں

خروشِ آرزو ہو، نغمۂ خاموشِ الفت ہو
یہ کیا اک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں برسوں

نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے
مجھے دیکھا کیا اٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

وہاں کیا ہے؟ نگاہِ ناز کی ہلکی سی جنبش ہے
مزے لے لے کے اب تڑپا کریں اربابِ جاں برسوں

محبت ابتدا سے تھی مجھے گلہائے رنگیں سے
رہا ہوں آشیاں میں لے کے برقِ آشیاں برسوں

میں وہ ہرگز نہیں جس کو قفس سے موت آتی ہو!
میں وہ ہوں جس نے خود دیکھا نہ سوئے آشیاں برسوں

○

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا! حلقہ ہائے دام کیا؟ رنجِ اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو، ہر طرح آزاد ہوتا ہے

بہار انجام سمجھوں اس چمن کا، یا خزاں سمجھوں
زبانِ برگِ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزام ہستی ہی نہیں اصغر
پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

○

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے، چمن بیدار ہو جائے

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں سے پار ہو جائے
مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے

تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے

سحر لائے گی کیا پیغامِ بیداری شبستاں میں
نقابِ رخ الٹ دو، خود سحر بیدار ہو جائے

یہ اقرارِ خودی ہے دعویٔ ایمان و دیں کیسا؟
ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے

نظر اس حسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی خود پھول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

فانیؔ بدایونی

○

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

فصلِ گل آئی، یا اجل آئی، کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہنچا، یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

لیجئے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیے!
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گزری چھوٹ گیا

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی!
تھک تھک کر اس راہ میں آخر ایک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانیؔ ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن!
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

○

پھر وہ اندازِ نظر یاد آیا
چاکِ دل تا بہ جگر یاد آیا

ذوقِ اربابِ نظر یاد آیا
سجدۂ بے منتِ سر یاد آیا

ہر تبسم پہ یہ کھاتا ہوں فریب
کہ انھیں دیدۂ تر یاد آیا

پھر ترا نقشِ قدم ہے در کا
سجدۂ راہ گذر یاد آیا!

جمع کرتا ہوں غبارِ رہِ دوست
سرِ شوریدہ مگر یاد آیا

ہائے وہ معرکۂ ناوکِ ناز
دل بچایا، تو جگر یاد آیا

آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا
میں بہ عنوانِ دگر یاد آیا

درد کو پھر ہے مرے دل کی تلاش
خانہ برباد کو گھر یاد آیا

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ
کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

○

ضبط اپنا شعار تھا، نہ رہا
دل پہ کچھ اختیار تھا، نہ رہا

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غم گسار تھا، نہ رہا

آ، کہ وقتِ سکونِ مرگ آیا
نالہ ناخوش گوار تھا، نہ رہا

اُن کی بے مہریوں کو کیا معلوم
کوئی اُمیدوار تھا، نہ رہا

آہ کا اعتبار بھی کب تک
آہ کا اعتبار تھا، نہ رہا

کچھ زمانے کو سازگار سہی
جو ہمیں سازگار تھا، نہ رہا

اب گریباں کہیں سے چاک نہیں
شغلِ فصلِ بہار تھا، نہ رہا

موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا، نہ رہا

مہرباں! یہ مزارِ فانی ہے
آپ کا جاں نثار تھا، نہ رہا

○

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دُور
اس آپ کی زمیں سے الگ، آسماں سے دُور

شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں!
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دُور

وہ پُوچھتے ہیں اور کوئی دیتا نہیں جواب
کس کی وفا ہے دسترسِ امتحاں سے دور

آنکھیں چُرا کے آپ نے افسانہ کر دیا
جو حال تھا زباں سے قریب اور بیاں سے دُور

ہے منعِ راہِ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے، منزل کہاں سے دُور

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دُور

فانی دکن میں آ کے یہ عقدہ کھُلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں، ہندوستاں سے دُور

○

آپ سے شرحِ آرزو تو کریں
آپ تکلیفِ گفتگو تو کریں!

وہ یہیں ہیں، جو وہ کہیں بھی نہیں
آئیے! دل میں جستجو تو کریں!

اہلِ دنیا مجھے سمجھ لیں گے
دل کسی دن ذرا لہو تو کریں!

رنگ و بُو کیا ہے یہ تو سمجھا دو
سیرِ دنیائے رنگ و بو تو کریں!

تم سے ملنے کی آرزو ہی سہی!
تم سے ملنے کی آرزو تو کریں

وہ اُدھر، رُخ اِدھر ہے میّت کا
لوگ فانیؔ کو قبلہ رُو تو کریں

○

مشتاق خبردار رہیں دل سے، جگر سے
ملتی ہے زمانے کی نظر اُن کی نظر سے

دل جن سے ملے اب وہ نگاہیں نہیں ملتیں
ملنے کو تو ملتی ہے نظر، اُن کی نظر سے!

پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں، رفو کے بھی ہیں ٹانکے
سینے میں دھواں خیر ہے! اُٹھتا ہے کدھر سے

کیا پھر ترے ناوک نے کیا عزمِ نوازش
لبیک کی آتی ہے صدا چاکِ جگر سے

کس صبح کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانیؔ
روتی ہے گلے مل کے سحر، شمعِ سحر سے!

○

تو خنجر بھی جو بسمل نہیں ہونے پاتے
مر گئے شرمندۂ قاتل نہیں ہونے پاتے

حرم و دیر کی گلیوں میں پڑے پھرتے ہیں
بزمِ رنداں میں جو شامل نہیں ہونے پاتے

موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا
رُخ مگر جانبِ ساحل نہیں ہونے پاتے

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے!
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو
میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

خود تجلّی کو نہیں اذنِ حضوری فانی
آئینے اُن کے مقابل نہیں ہونے پاتے

○

اس کشمکشِ ہستی میں کوئی راحت نہ ملی جو غم نہ ہوئی
تدبیر کا حاصل کیا کہیے! تقدیر کی گردش کم نہ ہوئی

اللہ رے سکونِ قلب اس کا، دل جس نے لاکھوں توڑ دیے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

غم راز ہے اُن کی تجلّی کا، جو عالم بن کر عام ہوا
دل راز ہے اُن کی تجلّی کا جو راز رہی عالم نہ ہوئی

دل کی یہ ویرانی ہی عجب ہے، وہ بھی آخر کیا کرتے
جب دل میں ان کے رہتے بستے یہ ویرانی کم نہ ہوئی

انسان کی ساری ہستی کا مقصد ہے فانی ایک نظر
یعنی وہ نظر، جو دل میں اُتر کر زخم بنی، مرہم نہ ہوئی

○

نظر آج ان سے رہ گئی مل کے
آخری کچھ پیام تھے دل کے

تو نے دیکھے ہیں اے نسیمِ سحر!
کچھ فدائی تھے شمعِ محفل کے

خلشیں تھیں ہمارے دم کے ساتھ
آج کانٹے نکل گئے دل کے

پھول کو پھول جاننے والے
گل یہ چھینٹے تھے خونِ بسمل کے

تیز تر جادۂ وفا سے گزر!
مٹ رہے ہیں نشان منزل کے

مل بھی جاتے ہیں چھوٹنے والے
چھوٹ جاتا ہے یوں کوئی مل کے

خاک ہے تو اسی گلی کی خاک
اللہ اللہ یہ حوصلے دل کے!

اُن کی نظریں ہی کچھ کہیں تو کہیں
ان کی نظروں نے کیا کیا مل کے

مرگِ فانی میں اب تو دیر نہ کر
سہل فرمانے والے مشکل کے

○

دُنیا میری بلا جانے، مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے، رازِ بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشتِ دل سے پھرنا ہے، اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں، یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اُجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم!
بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے!

فانیؔ جس میں آنسو کیا، دل کے لہو کا کال نہ تھا.
ہائے! وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

جگر مُرادآبادی

○

تیرا تصور شب ہمہ شب — خلوتِ غم بھی بزمِ طرب
دعویٰ شوق اور شکوہ بلب — شرم بادلِ آرام طلب
باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک — تیری طلب یا اپنی طلب
آہی گیا اک مستِ شباب — شیشہ بدست و نغمہ بلب
ختم ہوا انعامِ فراق — آہی گیا پیغامِ طلب
بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ — ہجر کی شب اور آخرِ شب
حسن مکمل جذب و گریز — عشق مسلسل ترک و طلب

ترکِ طلب اور اطمینان
دیکھ تو میرا حسنِ طلب

○

دنیا کے ستم یاد، نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتہ آپ بتاؤں
کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

میں ترکِ رہ و رسمِ جنوں کر ہی چکا تھا
کیوں آگئی ایسے میں تری لغزشِ پا یاد

کیا جانیے، کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادا یاد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

○

یہ دن بہار کے اب کے بھی راس آ نہ سکے
کہ غنچے کھل تو سکے، کھل کے مسکرا نہ سکے

مری تباہیِ دل پر تو رحم کھا نہ سکے
مگر کبھی وہ نظر سے نظر ملا نہ سکے

یہ آدمی ہے وہ پروانۂ شمعِ دانش کا
جو روشنی میں رہے، روشنی کو پا نہ سکے

انھیں سعادتِ منزل رسی نصیب ہوئی
وہ پاؤں راہِ طلب میں جو ڈگمگا نہ سکے

نہ جانے آہ! کہ ان آنسوؤں پہ کیا گزری
جو دل سے آنکھ تک آئے، مژہ تک آ نہ سکے

کریں گے مر کے بقائے دوام کیا حاصل
جو زندہ رہ کے مقامِ حیات پا نہ سکے

زہے خلوصِ محبت! کہ حادثاتِ جہاں
مجھے تو کیا، مرے نقشِ قدم مٹا نہ سکے

مری نظر سے گریزاں بہت رہے لیکن
مرے خلوصِ محبت سے بچ کے جا نہ سکے

یہ مہر و ماہ مرے ہم سفر رہے برسوں
پھر اس کے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے

مری نظر نے شبِ غم انھیں بھی دیکھ لیا
وہ بے شمار ستارے کہ جگمگا نہ سکے

نیا زمانہ بنانے چلے تھے دیوانے
نئی زمین، نیا آسماں بنا نہ سکے!

○

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

ہائے وہ کیونکر جی بہلائے
غم بھی جس کو راس نہ آئے

دل پہ کچھ ایسا وقت پڑا ہے
بھاگے لیکن راہ نہ پائے

جھوٹی ہے ہر ایک مسرت
روح اگر تسکین نہ پائے

حسن وہی ہے حسن جو ظالم
ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

ضبطِ محبت، شرطِ محبت
جی ہے کہ ظالم اُمڈا آئے

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے

راہِ طلب آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے

○

کوئی یہ کہہ دے گلشن گلشن — لاکھ بلائیں ایک نشیمن
کامل رہبر، قاتل رہزن — دل سا دوست، نہ دل سا دشمن
پھول کھلے ہیں گلشن گلشن — لیکن اپنا اپنا دامن
عمریں بیتیں، صدیاں گزریں — ہے وہی اب تک عقل کا بچپن
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے — عشق ہے کارِ شیشہ و آہن
برقِ حوادث اللہ اللہ! — جھوم رہی ہے شاخِ نشیمن
بیٹھے ہم ہر بزم میں لیکن — جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن
دل کہ مجسم آئینہ ساماں — اور وہ ظالم آئینہ دشمن
غیر مزاجِ حسن کی یارب! — تیز بہت ہے دل کی دھڑکن
تجھ سا حسیں اور خونِ محبت — وہم ہے شاید سرخیِ دامن
آج نہ جانے راز یہ کیا ہے — ہجر کی رات اور اتنی روشن
آ کہ نہ جانے تجھ بن کب سے — روح ہے لاشہ، جسم ہے مدفن

ق

کام ادھورا اور آزادی — نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی — سایہ ہے لیکن روشن روشن
علم ہی ٹھہرا علم کا باغی — عقل ہی نکلی عقل کی دشمن

ق

ہستیِ شاعر، اللہ اللہ — حسن کی منزل عشق کا مسکن
رنگیں فطرت، سادہ طبیعت — فرش نشیں اور عرش نشیمن

کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر
کون چھڑائے اپنا دامن

○

سراپا حقیقت، مجسم فسانا
محبت کا عالم، جنوں کا زمانا

وہ پہلے پہل دونوں جانب یہ عالم
ادا بے تعلق، نظر محرمانہ

نظر اٹھتے اٹھتے، نظر ملتے ملتے
دھڑکتے دلوں کا وہ نازک فسانہ

طبیعت شگفتہ، مگر کھوئی کھوئی
ہر انداز دلکش، مگر والہانہ

وہ شعر و ترنم کا پرکیف موسم
وہ اشک و تبسم کا رنگیں زمانہ

غرورِ تجمل، مگر زخم خوردہ
شکستِ محبت، مگر فاتحانہ

یہ ترا جمالِ کامل، یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ

مجھے عشق کی صداقت پہ بھی شک سا ہو چلا ہے
مرے دل سے کہہ گئی کیا؟ وہ نگاہِ ناقدانہ

مری زندگی تو گزری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے! کوئی چاہیے بہانہ

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق تجھ میں مجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ

مرے دل کے ٹوٹنے پر ہے کسی کو ناز کیا کیا؟
مجھے اے جگر مبارک! یہ شکستِ فاتحانہ

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل، چہرے کی تابانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

چلے جاتے ہیں بڑھ بڑھ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر
حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی

وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی
وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پہ گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جگر وہ بھی ز سر تا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

○

عجب عالم سا دل پر چھا رہا ہے
حسیں جیسے کوئی شرما رہا ہے

وہ زلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں
جہانِ آرزو تھرا رہا ہے

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

وہ خود تسکینِ خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے

طبیعت ہے کہ ٹھہری جا رہی ہے
زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے

مری رودادِ غم وہ سن رہے ہیں
تبسم سا لبوں پر آ رہا ہے

جگر ہی کا نہ ہو افسانہ کوئی
در و دیوار کو حال آ رہا ہے

○

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

طبیعت عشق کی خوددار بھی ہے
ادھر نازک مزاجِ یار بھی ہے

یہ نغمے جن سے اک دنیا ہے نالاں
انھیں سے گرمیِ بازار بھی ہے

غنیمت ہے کہ اس دورِ ہوس میں
ترا ملنا بہت دشوار بھی ہے

خبردار اے سبک ساران ساحل
یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے

جو کوئی سن سکے نکہتِ گل
شکستِ رنگ کی جھنکار بھی ہے

جوش ملیح آبادی

○

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ
جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا، میں نے تجھے یاد کیا

اے میں سو جان سے اس طرزِ تکلم کے نثار
پھر تو فرمائیے! کیا آپ نے ارشاد کیا

اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

اتنا مانوس ہوں فطرت سے، کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا: مجھ سے کچھ ارشاد کیا؟

مجھ کو تو ہوش نہیں تم کو خبر ہو شاید
لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا!

○

ملا جو موقع تو روک دوں گا جلالِ روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

یہی تو ہیں دو ستونِ محکم، انھیں پہ قائم ہے نظمِ عالم
یہی تو ہے رازِ خلد و آدم، نگاہ میری شباب تیرا

صبا تصدق ترے نفس پر، چمن ترے پیرہن پہ قرباں
شمیمِ دوشیزگی میں کیسا بسا ہوا ہے شباب تیرا

تمام محفل کے روبرو گو، اٹھائیں نظریں، ملائیں آنکھیں
سمجھ سکا ایک بھی نہ لیکن، سوال میرا جواب تیرا

ہزار شاخیں ادا سے لچکیں، ہوا نہ تیرا سا لوچ پیدا
شفق نے کتنے ہی رنگ بدلے، ملا نہ رنگِ شباب تیرا

ادھر مرا دل تڑپ رہا ہے تری جوانی کی جستجو میں
ادھر مرے دل کی آرزو میں مچل رہا ہے شباب تیرا

کرے گی دونوں کا چاک پردہ، رہے گا دونوں کو کر کے رسوا
یہ شورشِ ذوقِ دید میری، یہ اہتمامِ حجاب تیرا

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں، فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا، تمام زورِ شباب تیرا

بھلا ہوا جوش نے اٹھایا نگاہ کا چشمِ تر سے پردہ
بلا سے باقی رہیں گر آنکھیں کھلا تو بندِ نقاب تیرا

○

پہچان گیا سیلاب ہے اس کے سینے میں ارمانوں کا
دیکھا جو سفینے کو میرے، جی چھوٹ گیا طوفانوں کا

یہ شوخ فضا، یہ تازہ چمن، یہ مست گھٹا، یہ سرد ہوا
کافر ہے اگر اس وقت بھی کوئی رُخ نہ کرے میخانوں کا

یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے اُڑتے ذرّے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا

مطرب! بربط ہاتھ سے رکھ دے، ماضی نے در کھول دیا
فریاد کہ چُبھ کر ٹوٹ گیا، پھر کانٹا سا ارمانوں کا!

ہاں! ظلم و ستم سے بھی قدرے پڑتی ہیں خراشیں سینے میں
سب سے ہے مہلک زخم مگر اے حسن ترے ارمانوں کا

اے دینِ وفا! اے جانِ کرم! یوں غم میں نہ میرا ہاتھ بٹا
مرجاؤں گا میں اے شمع! خدارا! روپ نہ بھر پروانوں کا

دنیا نے فسانوں کو بخشی افسردہ حقائق کی تلخی!
اور ہم نے حقائق کے نقشے میں رنگ بھرا افسانوں کا

کم بخت جوانی سینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہے
ہر موجِ نفس اک طوفاں ہے کونین شکن ارمانوں کا

اے جوش! جنوں کی شام و سحر میں وقت کی یہ رفتار نہیں
داناؤں کی طولانی صدیاں اور ایک نفس دیوانوں کا

○

ہٹ گئے دل سے تیرگی کے حجاب
آفریں! اے نگاہِ عالم تاب

آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں!
مشورے دے کے ہٹ گئے احباب

کیا قیامت تھی صبر کی تلقین!
اور بھی روح ہو گئی بے تاب

بارے اُٹھے تو ناصحِ مشفق!
ہاں کدھر ہے صراحیٔ مے ناب

ہاں! اثر اب ہُوا محبت کا
ہم سے آنے لگا ہے اُن کو حجاب

شب، جو وہ بیٹھے میرے پہلو میں
مسکرانے لگی شبِ مہتاب

جوش کھلتی تھی جن سے دل کی کلی
کیسے وہ لوگ ہو گئے نایاب

○

عشووں کو چین ہی نہیں آفت کیے بغیر
تم، اور مان جاؤ شرارت کیے بغیر!

اہلِ نظر کو یار دکھاتا رہِ وفا
اے کاش! ذکرِ دوزخ و جنت کیے بغیر

اب دیکھ اس کا حال کہ آتا نہ تھا قرار
خود تیرے دل کو جس پہ عنایت کیے بغیر

اے ہم نشیں محال ہے ناصح کا ٹالنا!
یہ اور یہاں سے جائیں نصیحت کیے بغیر

تم کتنے تند خو ہو کہ پہلو سے آج تک
اک بار بھی اُٹھے نہ قیامت کیے بغیر

چلتا نہیں ہے محفلِ حسنِ جواں میں کام
ہر جنبشِ نظر سے عبادت کیے بغیر

مانا کہ ہر قدم پہ قیامت ہے پھر بھی جوش
بنتا نہیں کسی سے محبت کیے بغیر!

○

جہنم سر پہ ہے جنت کے در کھلوائے جاتے ہیں
سرِ محشر پجاری حسن کے بلوائے جاتے ہیں

غضب ہے یہ ادا اُن کی دمِ آرائشِ گیسو
جھکی جاتی ہیں آنکھیں خود بخود شرمائے جاتے ہیں

سحر کی ضو، شفق کی سرخیاں، برسات کے بادل
مجھے ہمراز پا کر یہ مناظر کھلائے جاتے ہیں

نہ جانے کتنی رنگیں صحبتیں ہیں میری نظروں میں
بس اے مطرب! مری آنکھوں میں آنسو آئے جاتے ہیں

شبِ وعدہ یہ کیسی تیرگی ہے؟ وقت کیا ہوگا
تمناؤں کے غنچے ہم نفس کھلائے جاتے ہیں

کوئی حد ہی نہیں اس احترامِ آدمیت کی!
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں کل جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

○

قدم انساں کا راہِ دہر میں تھرّا ہی جاتا ہے
چلے کتنا ہی کوئی بچ کے ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

نظر ہو خواہ کتنی ہی حقائق آشنا، پھر بھی!
ہجومِ کشمکش میں آدمی گھبرا ہی جاتا ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں، مگر واعظ
وہ آتے ہیں تو چہرہ پر تغیّر آ ہی جاتا ہے

ہوائیں زور کتنا ہی لگائیں آندھیاں بن کر
مگر جو گھر کے آتا ہے وہ بادل چھا ہی جاتا ہے

شکایت کیوں اسے کہتے ہو؟ یہ فطرت ہے انساں کی
مصیبت میں خیالِ عیشِ رفتہ آ ہی جاتا ہے

سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے!
سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسّم آ ہی جاتا ہے

○

اٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر
گہر پاشیاں کر، زر افشانیاں کر!

وہ چہکے عنادل، وہ مہکیں ہوائیں
گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر

صراحی جھکا اور وضو میں مچا دے!
گلابی اٹھا اور گل افشانیاں کر!

مٹا داغِ ہوش اور مدہوش بن جا
اٹھا جامِ زر اور سلطانیاں کر!

نگاہوں سے برسا دے ابرِ جوانی!
مئے لالہ گوں سے گلستانیاں کر

سمندر پہ چل اور الیاس بن جا!
ہواؤں پہ اُڑ اور سلیمانیاں کر

صبا کی طرح کنج میں رقص فرما
بگولوں کی مانند جولانیاں کر

سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے
خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر!

علم کھول کر جوشِ بدمستیوں کے
جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر!

○

جہاں ہے شوق، وہاں کیف و کم کی بات نہیں
دیارِ عشق میں دیر و حرم کی بات نہیں

جہاں بھی روک لے منظر، وہیں ٹھہر جاؤں
عرب کی بات نہیں ہے عجم کی بات نہیں

ازل سے دشت نوردی کا شوق ہے دل کو
غزالِ دشت کے اندازِ رم کی بات نہیں

جلا رہی ہے مری خو سے اعتبار مجھے
کسی کے قول، کسی کی قسم کی بات نہیں

گدائے راہ ہے بزمِ وفا کے حلقہ بگوش
جہاں پناہ کے طبل و علم کی بات نہیں

خود اپنا ذوقِ اسیری ہے پاؤں کی زنجیر
حضور! آپ کی زلفوں کے خم کی بات نہیں

دل اپنی وضعِ محبت سے ہے رہینِ تلف
خطا معاف! یہ لطف و کرم کی بات نہیں

جہاں نما ہے جو ہستی نہیں نگاہ مری
یہ فیضِ جام کی ہے، فرِّ جم کی بات نہیں

مرے وجود کی بنیاد ہے عبادت پر
بہارِ کوثر و باغِ ارم کی بات نہیں

کسی کے عشوۂ دریا دلی پہ مرتا ہوں
کسی کی بخششِ دام و درم کی بات نہیں

جہاں مزاج کی افتاد میں ہے ذوقِ سجود
کسی کی شوخیٔ نقشِ قدم کی بات نہیں

یہ طرزِ شیفتگی، دل کا اک تقاضا ہے
کرم فروشیٔ آں محترم کی بات نہیں

○

نمایاں منتہائے سعیِ پیہم ہوتی جاتی ہے
طبیعت بے نیازِ ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے

اٹھی جاتی ہے دل سے ہیبتِ آلامِ روحانی
جراحت ہر قلبِ زار مرہم ہوتی جاتی ہے

کنارہ کر رہا ہے رخ سے ہیجانِ سر تابی!
کہ گردن جستجو کے ذوق میں خم ہوتی جاتی ہے

جنوں کا چھا رہا ہے زندگی پر اک دھندلکا سا
خرد کی روشنی سینے میں مدھم ہوتی جاتی ہے

نسیمِ بے نیازی آ رہی ہے بامِ گردوں سے
عروسِ مدعا کی زلف برہم ہوتی جاتی ہے

نمایاں ہو چلا ہے اک جہاں چشمِ تصور پر
نظر شاید حریفِ ساغرِ جم ہوتی جاتی ہے

گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفس ذوقِ تماشا کی
کہ ہر ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

فضا میں کانپتی ہیں دھندلی دھندلی نقرئی شکلیں
ہر اک تمثیلِ پاکیزہ مجسم ہوتی جاتی ہے

نہ جانے سینۂ احساس پر یہ ہات ہے کس کا
طبیعت بے نیازِ شادی و غم ہوتی جاتی ہے

سمجھ میں آ گئیں کیا باریکیاں قانونِ قدرت کی
عبارت کثرتِ معنی سے مبہم ہوتی جاتی ہے

مچلتا جس کی شورش سے تلاطم بحرِ ہستی کا
مرے دل میں وہ ہلچل جوش اب کم ہوتی جاتی ہے

فراق گورکھپوری

○

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

پھر ترا غم وہی رسوائے جہاں ہے کہ جو تھا
پھر فسانہ بحدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گذراں ہے کہ جو تھا

منزلیں عشق کی تاحدِ نظر سُونی ہیں
کوئی رہرو نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے کہ جو تھا

یوں تو اس دَور میں بے کیف سی ہے بزمِ حیات
ایک ہنگامہ سرِ رطلِ گراں ہے کہ جو تھا

جو بھی کر جور و ستم جو بھی کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

آنکھ جھپکی کہ اُدھر ختم ہُوا روزِ وصال
پھر بھی اس دن پہ قیامت کا گماں ہے کہ جو تھا

قرب ہی کم ہے نہ دُوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

پھر ہر میکدۂ عشق ہے اک بارشِ نور
چھلکے جاموں سے چراغاں کا سماں ہے کہ جو تھا

آج بھی آگ دبی ہے دلِ انساں میں فراق
آج بھی سینوں سے اُٹھتا وہ دھواں ہے کہ جو تھا

○

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق
اب بھی کوئی بنالے تو بگڑی نہیں ہے بات

کچھ اور بھی تو ہو ان اشارات کے سوا
یہ سب تو اے نگاہِ کرم بات بات

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

ہم اہلِ انتظار کے آہٹ پہ کان تھے
ٹھنڈی ہوا تھی، غم تھا ترا ڈھل چکی تھی رات

یوں تو بچی بچی سی اُٹھی وہ نگاہِ ناز!
دنیائے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

جن کا سراغ پا نہ سکی غم کی روح بھی
ناداں اُٹھے ہیں عشق میں ایسے بھی سانحات

ہر سعی و ہر عمل میں محبت کا ہاتھ ہے
تعمیرِ زندگی کے سمجھ کچھ محرّکات

مجھ کو تو غم نے فرصتِ غم بھی نہ دی فراق
دے فرصتِ حیات نہ جیسے غمِ حیات

○

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اُٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

تمام شعلۂ گل ہے تمام موجِ بہار
کہ تا حدِ نگہِ شوق لہلہاتے ہیں باغ

نئی زمین، نیا آسماں، نئی دنیا
سنا تو ہے کہ محبت کو ان دنوں ہے فراغ

جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اُٹھے ہیں چراغ

نگاہیں مطلعِ نو پر ہیں ایک عالم کی
کہ مل رہا ہے کسی پھوٹتی کرن کا سراغ

دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

فراقؔ بزم چراغاں ہے محفلِ رنداں
سجے ہیں پگھلی ہوئی آگ سے چھلکتے ایاغ

○

جولانگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں
منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

مانا کہ تیرے لطف و کرم میں کمی نہیں
آسان اس قدر تو تری دوستی نہیں

کچھ ٹھوکریں تو کھا چمک اُٹھیں گی منزلیں
پائے طلب کو فکرِ سلامت روی نہیں

کب دیکھیے دلوں کو ملے اذنِ یاس ابھی
بیگانہ وار کہتی ہے وہ آنکھ ابھی نہیں

بیخود سے تھے تو وقت کا یہ بھی فریب تھا
ہم اور تجھ کو دل سے بھلا دیں کبھی نہیں

نیند آ چلی ہے انجمِ شامِ ابد کو بھی
آنکھ اہلِ انتظار کی اب تک لگی نہیں

بادِ بہار دیکھ کے کس طرح یہ کہیں
رنگینیوں کی جان تری سادگی نہیں

اے دوست یوں تو ہم تری حسرت کو جی گئے
لیکن یہ زندگی تو کوئی زندگی نہیں

اے عشق کارواں دو عالم بچھڑ گئے
اے خضرِ راہ یہ تو کوئی رہبری نہیں

یہ کیفیت سکون و سحر میں کہاں کی ہے
وہ شام ہے جو صبح بھی ہو کر گئی نہیں

شامیں کسی کو مانگتی ہیں آج بھی فراقؔ
گو زندگی میں یوں مجھے کوئی کمی نہیں

○

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

تم نے پوچھا بھی نہیں ہم نے بتایا بھی نہیں
کونسا راز وہ ایسا تھا کہ جانا بھی نہیں

یہ بھی سچ ہے کہ محبت پہ نہیں میں مجبور
یہ بھی سچ ہے کہ ترا حسن کچھ ایسا بھی نہیں

بدگماں ہو کے مل اے دوست جو ملنا ہے تجھے
یہ جھجکتے ہوئے ملنا کوئی ملنا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہِ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

مدتیں گذریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مجھ سے سنبھلیں تو سنبھال اپنے حجابِ بے باک
ہیں اُٹھاتا حدِ آدابِ تماشا بھی نہیں

ہائے وہ رازِ محبت جو چھپائے نہ بنے
ہائے وہ داغِ محبت جو ابھرتا بھی نہیں

آہ یہ مجمعِ احباب یہ بزمِ خاموش
آج محفل میں فراقؔ سخن آرا بھی نہیں

○

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو
بیخودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوتِ ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہر رگِ دل وجد میں آتی رہے دکھتی رہے
یونہی اس کے جا و بے جا ناز کی باتیں کرو

جو عدم کی جان ہے جو ہے پیامِ زندگی
اس سکوتِ راز اس آواز کی باتیں کرو

عشق رسوا ہو چلا بے کیف سا بیزار سا
آج اس کی نرگسِ غماز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراقؔ
آج اس عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو

○

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی، بھر آنکھ بھر آئے

وہ چوٹ، جو کیا جانے کہاں سے اُبھر آئے
وہ درد فرشتوں کو جو انسان بنائے

آنکھوں کو پھر اک شاہدِ رعنا نظر آئے
زرّیں کمرے، کج کلہے، تنگ قبائے

اک برقِ ادا، شعلہ قبا، پیکرِ رنگیں
دل ہائے مہ و مہر کو پہلو میں دبائے

کوندا ہو گداز اُف یہ تبسّم کی گھلاوٹ
لہجے کی کھنک تو جو ستاروں سے چرائے

وہ مستیٔ قامت کہ گھٹا جھوم کے اُٹھے
وہ چستیٔ ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے

نس نس میں کوئی جیسے دبی چنگیاں بھرئے
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے

وہ شیرہ جوانی کی ادھر ٹوٹتی انگڑائی
تصویر اُدھر قوس و قزح کھینچتی جائے

وہ شوخیٔ مسّاط کے بچتے ہوئے انداز
دنیا بھی نہ بننے دے، قیامت بھی نہ ڈھائے

یہ کم نگہی چشمِ فسوں ساز کی کیسی
دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے

کچھ ایسی بھی گزری ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو، مگر نیند نہ آئے

○

زہے آب و گل کی یہ کیمیا، ہے چمن کہ معجزۂ نمو
نہ خزاں سے کچھ، نہ بہار کچھ، وہی خار و خس، وہی رنگ و بو

ہوئی ختم صحبتِ مے کشی، رہی داغ سینوں میں رہ گیا
کہ طلوع ہونے سے رہ گئے، کئی آفتابِ خم و سبو

کئی لاکھ پھولوں نے پیرہن سرِ باغ ہنس کے اڑا دیے
زہے فصلِ گل وہ ہوا چلی کہ چمن کی لے اُڑی آبرو

تجھے اپنے آپ سے کہتے بھی مجھے آن لاکھ حجاب ہے
وہ زمانہ عشق کو یاد ہے، مری عرضِ غم ترے روبرو

ہوئی واردات سحر یہاں، تو گلوں کا سینہ دھڑک گیا
یہ چلی کہ تیغ نسیم نے کئی ہاتھ اچھال دیا لہو

وہی آنکھ، جامِ مئے حیا، وہی آنکھ جامِ جہاں نما
جو نگاہِ عشق نہیں کبھی، وہ نگاہ جاتی ہے چار سو

یہ کہاں سے بزمِ خیال میں امنڈ آئیں چہروں کی ندیاں
کوئی مہرکان، کوئی خور فشاں، کوئی زہرہ وش، کوئی شعلہ رو

گلے باغِ حسن عدن عدن، لگے داغِ حسنِ ختن ختن
تب و تاب روئے سحر نمو، خم و پیچ زلفِ سیاہ مو

مری شاعری نے کھلائے گل سرِ نوکِ خارِ چمن چمن
جو کیے یہ دعوے حریف نے رگِ فکر دینے لگی لہو

تجھے اہلِ دل کی خبر نہیں کہ جہاں میں گنج لٹا گئے
یہ گدا گرانِ دیارِ غم، یہ قلندرانِ تہی کدو

اب اسی کا تکیہ زمانے میں یہ سنا ہے مرجعِ خلق ہے
جو فراقؔ تیرے لیے پھرا، کبھی در بدر، کبھی کو بہ کو

○

ڈھلی ڈھلی سی شبِ مرگ ختم پر آئی
وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اُن کی رہگذر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

کہیں زمان و مکاں میں ہے نام کو بھی سکوں
مگر یہ بات محبت کی بات پر آئی

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

دلوں میں آج تری یاد مدتوں کے بعد
بہ چہرہ تبسم بہ چشمِ تر آئی

فضا کو جیسے کوئی راگ چیرتا جائے
تری نگاہ دلوں میں یونہی اتر آئی

ذرا وصال کے بعد آئنہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

عجب نہیں کہ چمن در چمن بنے ہر پھول
کلی کلی کی صبا جا کے گود بھر آئی

شبِ فراق اٹھے دل میں اور بھی کچھ درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

○

دنیا دنیا عالم عالم تھے اک روز یہی ویرانے
وادی وادی جنگل جنگل پہچان گئے تیرے دیوانے

ڈھونڈ چکا ہے اگر میرے دلوں میں پیمانوں کو ٹکرانے
بات وہ کہہ اے عشق کہ سن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے

اُسی درد سے دنیا غافل اُسی درد کا گھر گھر چرچا
ایک شبِ غم کی سو راتیں ایک محبت سو افسانے

اور اس سے بھی حسن کے بدلے جھوٹا سچا پیار کیا تھا
وہ بھی تھے تیرے عشق کے جیسے وہ بھی تھے تیرے غم کے بہانے

تو نے ہوا کی زد میں سوئی کو اپنی گوں پہ لگانا چاہا
صید گہِ ہستی میں ناداں یونہی خطا ہوتے ہیں نشانے

غفلت ہو تو کوئی چونکائے جاگے ہوؤں کو کون جگائے
ہائے وہ کارِ جہاں خود جس سے نکلیں بے عملی کے بہانے

حسن کے پاس اس کا نہیں چارہ عشق کا اس میں کیا ہے بھلا
یونہی پھر جاتی ہیں نگاہیں یونہی بدل جاتے ہیں زمانے

اس کی نظر پر حیراں حیراں مجبوری بھی آزادی بھی
دیکھ گئے جو سب کے دل میں سب کی سنے اور اپنی مانے

دنیا اپنے رنگ محل میں خوش تھی اب خوشی کے دیکھ رہی ہے
جس میں خوشی نے آنکھیں کھولی تھیں وہ محبت کے غم خانے

حسن و محبت آپ اپنی تزئین ہیں گر معصوم نہ ہوں
تھوڑی دیر کو جیسے بن لیں ہم بھی سیانے تم بھی سیانے

امن و اماں کی دنیا میں بھی ایسوں کو کب ملتے ہیں ٹھکانے
کئی بار تو عشق گیا ہے موت کے منہ میں جان بچانے

شعلۂ گل پہ چادرِ شبنم سرتاسر تصویرِ حیات
رو لینا ہے ہنستے ہنستے ہنس لینا ہے غم کے بہانے

ذرہ ذرہ تارا تارا قطرہ قطرہ دریا دریا
ہوش و خرد ہیں حیراں حیراں کیا کوئی سمجھے کیا کوئی جانے

سامنے کی چیزیں بھی فراق انسان کو چونکا دیتی ہیں
بزم میں جاگتا خواب یہ دیکھا ہیں چراغ میں پروانے

حفیظ جالندھری

○

او دل توڑ کے جانے والے، دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں، مجھ کو بھی سمجھاتا جا

ہاں، میرے مجروح تبسم! خشک لبوں تک آتا جا
پھول کی ہست و بود یہی ہے کھلتا جا، مرجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا، شرماتا جا

یہ دُکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکرِ نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا!

جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا سامان کروں
عشق میں کیا ہوتا ہے ناصح، عقل کی بات سجھاتا جا

تجھ کو ابر آلود دنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے
بہلاتا ہے باتوں سے بہلاتا جا بہلاتا جا!

دونوں سنگِ راہِ طلب ہیں، راہنما بھی منزل بھی
ذوقِ طلب! ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے تو اپنی دُھن میں گاتا جا

آخر تجھ کو بھی موت آئی۔ خیر۔ حفیظ خدا حافظ
لیکن جاتے جاتے پیارے وجہِ مرگ بتاتا جا

○

کوئی دوا نہ دے سکے، مشورۂ دعا دیا
چارہ گروں نے اور بھی درد کا دل بڑھا دیا

ذوقِ نگاہ کے سوا، شوقِ گناہ کے سوا
مجھ کو خدا سے کیا ملا، مجھ کو بتوں نے کیا دیا

تھی نہ خزاں کی روک تھام دامنِ اختیار میں
ہم نے بھری بہار میں اپنا چمن لٹا دیا

حسنِ نظر کی آبرو صنعتِ برہمن سے ہے
جس کو صنم بنا لیا، اس کو خدا بنا دیا

داغ ہے مجھ پہ عشق کا، میرا گناہ بھی تو دیکھ
اُس کی نگاہ بھی تو دیکھ جس نے یہ گل کھلا دیا

عشق کی مملکت میں ہے شورشِ عقل نامراد
اُبھرا کہیں جو یہ فساد، دل نے وہیں دبا دیا

نقشِ وفا تو میں ہی تھا، اب مجھے ڈھونڈتے ہو کیا
حرفِ غلط نظر پڑا، تم نے مجھے مٹا دیا

خبثِ دروں دکھا دیا، ہر دہنِ غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے، ہنس دیا مسکرا دیا

○

جھگڑا دانے پانی کا ہے، دام و قفس کی بات نہیں
اپنے بس کی بات نہیں، صیاد کے بس کی بات نہیں

جان سے پیارے یار ہمارے، قیدِ وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے، اک تارِ نفس کی بات نہیں

تیرا پھولوں کا بستر بھی راہ گزارِ سیل میں ہے
آقا۔ اب یہ بندے ہی کے خار و خس کی بات نہیں

دونوں ہجر میں روتے ہیں، دونوں وصل کے طالب ہیں
حسن بھلا کیسے پہچانے، عشق ہوس کی بات نہیں

نوش ہے عنوان — نیش نتیجہ ان شیریں افسانوں کا
تذکرہ ہے انسانوں کا، یہ مور و مگس کی بات نہیں

کار مغاں پہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں!
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں، خالی رس کی بات نہیں

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں

○

اے دوست مٹ گیا ہوں فنا ہو گیا ہوں میں
اس دردِ دوستی کی دوا ہو گیا ہوں میں

قائم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو
دنیا سمجھ رہی ہے، فنا ہو گیا ہوں میں

ہمت بلند تھی، مگر افتاد دیکھنا!
چپ چاپ آج محوِ دعا ہو گیا ہوں میں

نا آشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست
کم بخت جانتے نہیں، کیا ہو گیا ہوں میں

مٹنے کا اعتبار، نہ ہونے کا اعتبار
کیا زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

ہاں کیفِ بے خودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہوں میں!

○

مستوں پہ انگلیاں نہ اٹھاؤ بہار میں
دیکھو تو — ہوش ہے بھی کسی ہوشیار میں

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ
پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار میں

وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ، جاؤ جاؤ
جاؤ — کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں!

اللہ بات کیا ہے کہ دیوانگی مری!
دیوانگی نہیں نظرِ ہوشیار میں

وہ عندلیبِ گلشنِ معنی ہوں میں حفیظ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

○

جوانی کے ترانے گا رہا ہوں
دبی چنگاریاں سلگا رہا ہوں

مری بزمِ وفا سے جانے والو
ٹھہر جاؤ: کہ میں بھی آ رہا ہوں

بتوں کو قول دیتا ہوں وفا کا
قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں

وفا کا لازمی تھا یہ نتیجہ!
سزا اپنے کیے کی پا رہا ہوں

خدا لگتی کہو بتخانے والو!
تمہارے ساتھ میں کیسا رہا ہوں

[illegible] گر [illegible]
ہجوم [illegible] رہا ہوں

نئے کعبے کی بنیادوں سے پوچھو
پرانے بتکدے کیوں ڈھا رہا ہوں

نہیں کانٹے بھی کیا ابھرے چمن میں
کوئی [illegible] کے پیچھے ہی جا رہا ہوں

ہوئی جاتی ہے کیوں بیتاب منزل
مسلسل چل رہا ہوں آ رہا ہوں

حفیظ اپنے پرائے بن رہے ہیں
کہ میں دل کو زباں پر لا رہا ہوں

○

ناکامیِ عشق، یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی
آنکھیں ہیں یہ مست پیرا کتابی
بادہ شبانہ، جام آفتابی
پھولوں میں دو پھول، رنگوں میں دو رنگ
لب لعلِ نابی، عارض گلابی
دنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا
دیوانہ ہو جا، بن جا شرابی
اُن کا بہانہ برجستہ گوئی
میرا تبسم حاضر جوابی
دیندار کر دے، کافر بنا دے
یہ پردہ داری، یہ بے حجابی
ہیں تختِ دل پر سرکار، ورنہ
تختہ اُلٹ دیں، ہم انقلابی
دربان سے ہوں دست و گریباں
الحمد للہ یہ باریابی!

○

کہہ گئے الفراق یارانے
رہ گئے ناتمام افسانے
دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے
صبحدم اپنی اپنی راہ لگے
شمع کے جاں نثار پروانے
ساقیا! یہ روا روی کا ہے دور
بھر دے بھر دے کچھ اور پیمانے
ماتمِ اہلِ ظرف کے دن ہیں
احتراماً ہیں بند مے خانے
زندگی سے نپٹ رہا ہوں ابھی
موت کیا ہے مری بلا جانے
کر رہا ہوں تلاش اپنوں کی!
جب سے گم ہو گئے ہیں بیگانے
ہم نے روکا حفیظ کو ورنہ
اور بھی کچھ لگے تھے فرمانے!
تگ و دو ہے ترے جلووں میں حفیظ
اور کیا چاہتا ہے دیوانے

○

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمھیں بھلا سکے

تم ہی نہ سُن سکے اگر، قصۂ غم سُنے گا کون
کس کی زباں کھلے گی پھر، ہم نہ اگر سُنا سکے

ہوش میں آچکے تھے ہم، جوش میں آچکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے۔ لب پہ حکایتیں رہیں!
دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی، برہمیِ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست، جس کی سمجھ میں آسکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
سُن کے یقین کر سکے، جا کے انھیں سُنا سکے

شوقِ وصال ہے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں، ہم سے نظر ملا سکے؟

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظؔ، درد کے گیت گا سکے

○

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

یہ خوب کیا ہے یہ زشت کیا ہے جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے!

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں، حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کر لے، مری وفا کا حساب کر دے

حفیظؔ سب سے بڑی خرابی، ہے عشق میں لطفِ کامیابی
کسی کی دنیا تباہ کر دے، کسی کی عقبیٰ خراب کر دے

میرزا یاس یگانہ

○

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

بُرا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

اسیرو! شوقِ آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا

دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

○

ہنوز زندگیٔ تلخ کا مزا نہ ملا
کمالِ صبر ملا، صبر آزما نہ ملا

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاج اس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

جواب کیا وہی آوازِ بازگشت آئی
قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

امیدوارِ رہائیٔ قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا

ہزار ہا اسی جانب ہے منزلِ مقصود
دلیلِ راہ کا غم کیا، ملا ملا نہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

خوشا نصیب جسے فیضِ عشقِ شورانگیز
بقدرِ ظرف ملا ظرف سے سوا نہ ملا

سمجھ میں آ گیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

○

رنگ لاتی ہے آخر ایک جنبشِ لب کیا
دیکھئے دکھاتا ہے وعدۂ تذبذب کیا

چلّو بھر میں متوالی، دو ہی گھونٹ میں خالی
یہ بھری جوانی کیا، جذبۂ لبالب کیا

ہاں دعائیں لیتا جا، گالیاں بھی دیتا جا
تازگی تو کچھ پہنچے، اچھا بنا رہوں لب کیا

شامت آگئی آخر کہہ گیا خدا لگتی
راستی کا پھل پاتا، بندۂ مقرب کیا

اُلٹی سیدھی سنتا رہ اپنی کہہ تو اُلٹی کہہ
سادہ ہے تو کیا جانے بھانپنے کا ہے ڈھب کیا

سب جہاد ہیں دل کے، سب فساد ہیں دل کے
بے دلوں کا مطلب کیا اور ترکِ مطلب کیا

ہو رہے گا سجدہ بھی جب کسی کی یاد آئی
یاد جانے کب آئے زندہ داریٔ شب کیا

کارِ مرگ کے دن کا تھوڑی دیر کا جھگڑا
دیکھنا ہے یہ ناداں جینے کا ہے کرتب کیا

پڑ چکے بہت پالے ڈس چکے بہت کالے
موذیوں کے موذی کو فکرِ نیشِ عقرب کیا

میرزا یگانہ واہ! زندہ باد! زندہ باد!
اک بلا سے بے زباں جب تم گئے تھے داب کیا

○

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سُنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو!
لو دیکھ لو وہی کل آج بن کے آ نہ گیا

گناہِ زندہ دلی کہئے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سُنا نہ گیا

کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا

کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

○

لذتِ زندگی مبارک باد
کل کی کیا فکر؟ ہرچہ بادا باد

اے خوشا زندگی کہ پہلوئے شوق
دوست کے دم قدم سے ہے آباد

دل سلامت ہے، دردِ دل نہ سہی
درد جاتا رہا کہ درد کی یاد؟

زیست کے ہیں یہی مزے واللہ
چار دن شاد چار دن ناشاد

کون دیتا ہے دادِ ناکامی
خونِ فرہاد برسرِ فرہاد

صبر اتنا نہ کر کہ دشمن پر
تلخ ہو جائے لذتِ بیداد

صلح کر لو یگانہ غالب سے
وہ بھی استاد تم بھی اک استاد

○

جب تک خلشِ دردِ خداداد رہے گی
دنیا دلِ ناشاد کی آباد رہے گی

دنیا کی ہوا راس نہ آئے گی کسی کو
ہر سر میں ہوائے عدم آباد رہے گی

چونکائے گی رہ رہ کے تو غفلت کا مزہ کیا
ساتھ اپنے اجل صورتِ ہمزاد رہے گی

دل اور دھڑکتا ہے ادب گاہِ قفس میں
شاید یہ زبانِ تشنۂ فریاد رہے گی

جو خاک کا پتلا وہی صحرا کا بگولا
مٹنے پہ بھی اک ہستیِ برباد رہے گی

ہر شام ہوئی صبح کو اک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

شہرہ ہے یگانہ تری بیگانہ روی کا
واللہ یہ بیگانہ روی یاد رہے گی

○

مزاج آپ کا دنیا سے کچھ کشیدہ سہی
فریب کھاؤ گے پھر بھی فریب دیدہ سہی

یہ سبز باغ کا عالم یہ رنگِ لیل و نہار
بہل ہی جائے گا دل آپ سے رمیدہ سہی

یہ غنچہ کیسا کہ دیکھے سے دل دھڑکتا ہے
ارے یہ ایک ہی فتنہ ہے نودمیدہ سہی

نگاہِ شوق کی گرمی خدا کی قدرت ہے
مزے پہ آ ہی گیا حسنِ نارسیدہ سہی

کھٹکتی رہتی ہے دل میں نگاہِ دزدیدہ
خطائے حسن کہے کون چشم دیدہ سہی

نگاہِ حسن سے اب تک وفا ٹپکتی ہے
ستم رسیدہ سہی پیرہن دریدہ سہی!

فریبِ ابرِ کرم بھی بڑا سہارا ہے
بلا سے نخلِ تمنا خزاں رسیدہ سہی

پتنگے کی کہیے تو ظالم کا رنگ اڑتا ہے
زبانِ حال سے اک حرفِ ناشنیدہ سہی

قریب ہوں مگر اتنا کہ جیسے کوسوں دور
مجھے نہ دیکھ سکو گے، زمانہ دیدہ سہی

مری نظر کی خطا ہو گی یا گلوں کی خطا
تمھارے راج میں کانٹا ہی برگزیدہ سہی

یگانہ حسن گری بیڈھب تو سوچیے کیا ہو
شریکِ کار نہیں تو میں جریدہ سہی

○

حسن پر فرعون کی پھبتی کہی
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی!

دامنِ یوسف ہی بھڑکاتا رہا
عشق اور ترکِ ادب؟ اچھی کہی

کوئی ضد تھی یا سمجھ کا پھیر تھا
من گئے وہ میں نے جب الٹی کہی

درد سے پہلے کروں فکرِ دوا!
واہ یہ اچھی الٹوانسی کہی

دوست سے پردہ کیا یہ کیا کیا
آپ بیتی چھوڑ جگ بیتی کہی

شک ہے کافر کو مرے ایمان میں
جیسے میں نے کوئی منہ دیکھی کہی

کیا خبر تھی یہ خدائی اور ہے
ہائے میں نے کیوں خدا لگتی کہی

مفت میں سن لی یگانہ کی غزل
ان سنی کر دی جو مطلب کی کہی

○

کس کی آواز کان میں آئی؟ دور کی بات دھیان میں آئی

ایسی آزاد رُوح اس تن میں کیوں پرائے مکان میں آئی

آپ آتے رہے بلاتے رہے آنے والی اک آن میں آئی

ہائے کیا کیا نگاہ بھٹکی ہے جب کبھی امتحان میں آئی

علم کیا علم کی حقیقت کیا جیسی جس کے گمان میں آئی

حسن کیا خواب سے ہوا بیدار جان تازہ جہان میں آئی

جان لیوا ہے یہ کڑی تیوری یہ کشش کس کمان میں آئی

بات ادھوری مگر اثر دونا اچھی لکنت زبان میں آئی

آنکھ نیچی ہوئی ارے یہ کیا؟

کیوں غرض درمیان میں آئی

○

کارگاہِ دنیا کی نیستی بھی ہستی ہے

اک طرف اُجڑتی ہے ایک سمت بستی ہے

بے دلوں کی ہستی کیا، جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

خواب ہے نہ بیداری ہوش ہے نہ مستی ہے

کیمیائے دل کیا ہے خاک ہے مگر کیسی؟

لیجیے تو مہنگی ہے بیچیے تو سستی ہے

خضرِ منزل اپنا ہوں اپنی راہ چلتا ہوں

میرے حال پر دُنیا کیا سمجھ کے ہنستی ہے

کیا کہوں سفر اپنا ختم کیوں نہیں ہوتا

فکر کی بلندی یا حوصلہ کی پستی ہے

حسنِ بے تماشا کی دھوم کیا معمہ ہے

کان بھی ہیں نامحرم آنکھ بھی ترستی ہے

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا

چال سے تو کافر پر سادگی برستی ہے

ترکِ لذتِ دنیا کیجیے تو کس دل سے

ذوقِ پارسائی کیا فیضِ تنگدستی ہے

دیدنی ہے یاس اپنے رنج و غم کی طغیانی

جھوم جھوم کر کیا کیا یہ گھٹا برستی ہے

سیماب اکبرآبادی

○

رات کا جانا، وداعِ شیشہ و پیمانہ تھا
صبح کا تارا نہ تھا، قفلِ درِ مےخانہ تھا

حسن تنگ آکر بھڑک اُٹھا فضائے طور سے
طالبِ دیدار کا ارمان گستاخانہ تھا

ڈھونڈتا پھرتا تھا چشمِ آرزو کی روشنی
میں شبِ فرقت اندھیری رات کا پروانہ تھا

میری خاکستر سے پیدا تھا جہانِ آرزو
جو پتنگا دل کے شعلوں سے اُڑا، پروانہ تھا

کیف اے ساقی! اچھا مجھ کو نہ جھجنے کی طرح
کچھ مرے انداز سے چھوٹا ترا پیمانہ تھا

○

اب تو یہ حال ہے نظرِ سوگوار کا
کیفِ جمال ہے، نہ مزہ انتظار کا

کہتے ہیں جس کو نزع کا عالم جہان میں
پچھلا پہر ہے میری شبِ انتظار کا

دل سرگرانِ حسرتِ دیدار رہ گیا
آنکھوں نے لطف لوٹ لیا انتظار کا

منہ زرد، خونِ یاس میں پلکیں بھری ہوئی
عالم تو دیکھئے سحرِ انتظار کا

یہ نازِ منفعل، یہ ادائیں حجاب کی
منہ ہو تو چوم لوں نگہِ شرمسار کا

سیماب کیا سناؤں میں اپنا کسی کو حال
زندہ ہوں اور شکر ہے پروردگار کا

○

نامہ گیا کوئی، نہ کوئی نامہ بر گیا
تیری خبر نہ آئی، زمانہ گزر گیا

ہنستا ہوں یوں کہ ہجر کی راتیں گزر گئیں
روتا ہوں یوں کہ لطفِ دعائے سحر گیا

اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

یا رب! نہیں میں واقفِ رودادِ زندگی
اتنا ہی یاد ہے کہ جیا اور مر گیا

○

جتنے ستم کیے تھے کسی نے عتاب میں
وہ بھی ملا لیے کرمِ بے حساب میں

حسرت کو گھر کہیں نہ ملا اضطراب میں
بسنے کو آ گئی دلِ خانہ خراب میں

اُٹھا ہے ابرِ میکدہ دستِ دعا کے ساتھ
اتنی برس پڑے کہ نہا لوں شراب میں

آ، اے گلِ فسردہ! لگا لوں تجھے گلے
تو بھی تو میری طرح لُٹا ہے شباب میں

ہر چیز پر بہار، ہر اک شے پہ حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

○

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئنہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

صبر آ ہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں
امکاں اک اور ظلم ہے قیدِ محال میں

آزردہ اس قدر ہوں سرابِ خیال سے
جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں

تنگ آ کے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو
یا مطمئن کرو کہ تمھیں ہو خیال میں

دنیا ہے خواب، حاصلِ دنیا خیال ہے
انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں

بجلی گری ہی اور آنچ نہ آئی کلیم پر
شاید ہنسی بھی آ گئی ان کو جلال میں

عمرِ دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی
کچھ خواب میں گزر گئی، باقی خیال میں

○

جنوں پہنچا بیاباں میں، بہار آئی گلستاں میں
یہ دونوں کیوں نہ آ بیٹھے مرے چاکِ گریباں میں

یہ کس کافر نے لیں انگڑائیاں صحنِ گلستاں میں
قیامت چھپتی پھرتی ہے گلوں کے چاکِ داماں میں

دلِ غمگیں! مداراتِ ستم کی بات رہ جائے
لہو کی بوند بن کر جذب ہو جا، نوکِ پیکاں میں

ذرا کھل کر پکار اے صورِ اعجازِ زبانِ الفت کو
یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

○

طولِ رہِ حیات سے گھبرا رہا ہوں میں
گھبرا رہا ہوں اور چلو جا رہا ہوں میں

چھوتی نہیں مجھے پرِ جبریل کی ہوا
یہ کن بلندیوں پہ اُڑا جا رہا ہوں میں

پھر لے رہا ہوں فطرتِ انساں کو درسِ ناز
سرِ آستانِ حسن سے اٹھوا رہا ہوں میں

کیوں میرے ترکِ بادہ پہ تجھ کو یقیں نہیں
ساقی ترے لبوں کی قسم کھا رہا ہوں میں

تحلیل ہو رہی ہے مری روح ہر نفس
تعمیرِ کائنات میں کام آ رہا ہوں میں

○

برباد حسنِ ظن سے مآلِ وفا نہ ہو
ایسا نہ ہو کہ حقِ محبت ادا نہ ہو

الجھا رہا ہوں زلفِ تصور میں دستِ شوق
اور اس طرح کہ موجِ ہوا آشنا نہ ہو

وہ سرخوشی کا وقت ہے جب کائنات میں
دل بولتا ہو اور کوئی بولتا نہ ہو!

آ، اور آخری نگہِ یاس دیکھ جا!
شاید پھر اس کے بعد عیادت روا نہ ہو

○

کیوں ہنسی تو اے اجل! فانی اگر سمجھا مجھے
ایک دن سب کو فنا ہے کیا تجھے اور کیا مجھے

ہے حصولِ آرزو کا راز ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے

کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے
جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے

صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دئے
آگیا تھا شامِ غم اک نیند کا جھونکا مجھے

دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے میں اٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

○

چمک جگنو کی برقِ بے اماں معلوم ہوتی ہے
قفس میں رہ کے قدرِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

چمن کے ساتھ کو مدتیں گزریں، مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی آشیاں معلوم ہوتی ہے

ترقی پر ہے روز افزوں خلشِ دردِ محبت کی
جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے

قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے
کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

○

حیا میں اک ادا نکلی، اداؤں سے حجاب آیا
شباب آیا اور اس انداز سے ان کا شباب آیا

جوانی اور آئینہ، تبسم اور انگڑائی
حیا بے اختیار آئی، اداؤں پر عتاب آیا

وہی آنکھیں کہ جن سے بادۂ گلگوں چھلکتا تھا
وہی نرگس کی کلیاں تھیں جہاں ہنگامِ خواب آیا

بگڑنا، روٹھنا، باتیں بنانا مجھ سے آتی ہیں
مگر اے دل نہ کوئی ان کے طعنوں کا جواب آیا؟

نظر اٹھی نظر کے ساتھ اک موجِ شراب اٹھی
مجسم کیفِ رنگیں بن کے وہ مستِ شباب آیا

گلوں کی گود میں جیسے نسیم آ کر مچل جائے
اسی انداز سے ان پُرخمار آنکھوں میں خواب آیا

بسا پھولوں کی نکہت میں لیے مستی شرابوں کی
مہکتا، لہلہاتا ایک کافر کا شباب آیا

نہ دینا دادِ شوخی کی خطا تھی اب یہ تہمت ہے
نگاہیں اٹھ گئیں کیوں جب ادھر وہ بے نقاب آیا!

اثر کو ہوش میں پاؤ تو کہہ دو کوئی کہتا تھا
کہاں ہے کیا ہوا، جا کر نہ وہ خانہ خراب آیا

○

مثالِ برگِ خزاں دیدہ ہوا ہے زرد آفتاب کیسا
مگر قیامت قریب آئی، کھلا ہے بندِ نقاب کیسا

دلِ ستم کش کو بجلیوں کا خزانہ جس نے بنا دیا ہے
تری نظر میں نہاں تھا ظالم یہ محشرِ اضطراب کیسا

کبھی ہے تکیہ ترے کرم پر، کبھی ہے خوفِ عتاب دل میں
یہی ہے جنت یہی ہے دوزخ، عذاب کیسا ثواب کیسا

میں ان کے جلووں کا آئنہ ہوں وہ میری حیرت کا آئنہ ہیں
جہاں یہ عالم ہو محویت کا، سوال کیسا، جواب کیسا

بجا ہے یاد میں کسی کی پیا ہے خونابِ دل وگرنہ
تمہاری آنکھوں سے آج چھلکا اثر یہ رنگِ شراب کیسا

○

کاہے کو ایسے ڈھیٹ تھے پہلے، جھوٹی قسم جو کھاتے تم
غیرت سے آجاتا پسینا، آنکھ نہ ہم سے ملاتے تم

حیف تمھیں فرصت ہی نہیں ہے، ورنہ کیا کیا حسرت تھی
حال ہمارا کچھ سُن لیتے، کچھ حال اپنا سناتے تم

ننگ ہے ملنا، عارِ تکلم، ایک زمانہ ایسا تھا
بزم میں اپنی ہم کو بلا کر، عزت سے بٹھلاتے تم

ہم وہ نہیں، یا تم وہ نہیں، اب تم ہنستے ہو اور ہم روتے ہیں
یا بجلی الٹی جاتی تھی، جتنا ہمیں سمجھاتے تم

وضع بھی کوئی شے ہے آخر، دل کو اثر سمجھانا تھا
در سے کسی کے اک بار اُٹھ کر کاش دوبارہ نہ جاتے تم

○

صحرا سے چلے ہیں سُوئے گلشن
خونیں جگراں بچاک دامن

پیغام بہار دے رہی ہے
داغوں کی جھلک دلوں کی اُلجھن

رقصاں ہے نسیم برگِ گُل پر
شبنم میں ہے گھنگروؤں کی چھن چھن

غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے
مستی میں چھوا صبا نے دامن

دل کش نہ ہو کیوں کلام اختر کا
سیکھا ہے یہ اس نے میر سے فن

○

دل کا ہے رونا کھیل نہیں ہے، منہ کو کلیجا آنے دو
تھمتے تھمتے اشک تھمیں گے، ناصح کو سمجھانے دو

اُٹھ گئیں شرطیں مٹ گئیں قیدیں طاقتِ دل جب طاق ہوئی
ضبط کی آخر حد بھی ہے کوئی، اب تو یہ پردہ اٹھانے دو

کہتے ہی کہتے حال کہیں گے، ایسی تمھیں جلدی کیا ہے
دل تو ٹھکانے ہونے دو، اور آپ میں ہم کو آنے دو

مجھ کو تڑپتا چھوڑ نہ جائے ایسی کوئی تدبیر کرو
زخمی تیغِ ناز و ادا سے ہاتھ نہ اس کو اٹھانے دو

بزمِ طرب میں دیکھ کے مجھ کو پھیر لیں آنکھیں ساقی نے
میرے لیے تھے زہرِ ہلاہل رس کے بھرے پیمانے دو

خود سے گریباں پھٹتے تھے اکثر، چاک ہوا میں اڑتے تھے
اب وہ جنوں کا جوش نہیں، آئی بہار تو آنے دو

یادِ دلِ گم گشتہ میں رہیں ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا
ہنس کے ستمگر کہتا کیا ہے، بات ہی کیا ہے جانے دو

صورتِ منزل کیا نظر آئے، ثبت ہیں دل پر نقشِ خودی
عقل ہے دشمن نفس ہے رہزن ٹھوکریں کچھ دن کھانے دو

دل کو آخر کیسے لوٹ لیا ہے، شوخ نگہ اک کافر نے
کوئی نہ اس کو رونے سے روکو، آگ لگی ہے بجھانے دو

○

کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو روتے پھرنا راتوں کو
جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں عشق و جنوں کی باتوں کو

صبح کو جلوہ بر سرِ منبر، شب کو پیرِ میخانہ
اب کیسے تو بھلا کیا کہیے ایسی مقدس ذاتوں کو

وہ جو نہ آئے یا دل چھائے اگرچہ بھیدے کھل بھی گئے
اس کے سوا ہم ہجر کے مارے کیا جانیں برساتوں کو

بات یہ اور ہے شوق کے ہاتھوں خونِ دلِ عاشق ہو جائے
کام نہیں کچھ خونریزی سے تیرے حنائی ہاتھوں کو

شرم و حیا ہے ناز و ادا ہے، عشوہ کرشمہ شوخی بھی
کیا تمھیں لینے جانا کہیں ہے دل لینے کی گھاتوں کو

کیا کیا ہم پر لطف و کرم ہے، کیسی کیسی مہر و وفا
تلخ اگر سن سکتے نہیں تو کیوں چھیڑو ان باتوں کو

دید کی عشرت، محویت، پھر بیہوشی مے خوار کی سی
شوق نے ختم نہیں یہ کیا یہ لطف ملاقاتوں کو

غم میں وہ لذت پائی ہم نے ذوقِ طلب پہ نثار کیا
حسنِ قبول عطا جو ہوا بھی شب کی مناجاتوں کو

ہو نہ ہو سب ہے اپنی بیتی لاکھ کرو انکار اثر
نیند آنکھوں کی اڑاتے ہو کہہ کہہ کے فسانہ راتوں کو

○

بھیگی ذرا جو آنکھ جوانی گذر گئی
بدلی کی چھاؤں تھی اِدھر آئی اُدھر گئی

مشاطۂ بہار عجب گُل کتر گئی
منہ بند جو کلی تھی کھلی اور سنور گئی

پیشِ جمالِ یار کرن آفتاب کی
شرما کے چاہتی تھی کہ پلٹے بکھر گئی

مَل کر بھبھوت جیسے پہاڑوں کی چھاؤں کا
دھونی رمائے در پہ یہ کس کے سحر گئی

کیا جانے آنکھ مار کے کیا کہہ گئی شفق
پھولوں کی گود موجِ نسیم آ کے بھر گئی

سینے میں اور تاب دے شعلے کو شوق کے
سجدہ غلط اگر نہ تجلی نکھر گئی

تیری ہی جلوہ زار ہے دنیائے رنگ و بُو
اے وائے وہ نظر جو حجابات پر گئی

اب ہاتھ ملتے ہیں کہ دمِ عرضِ ماجرا
کہنے کی بات دھیان سے کیسی اُتر گئی

کچھ دن کی اور کشمکشِ زیست ہے اثرؔ
اچھی بُری گذرنی تھی جیسی گذر گئی

○

مگر ہر قدم پر لچکتی رہی
یہ بجلی سوئے دل لپکتی رہی

ادب لاکھ تھا پھر بھی اس کی طرف
نظر میری اکثر بھٹکتی رہی

اگر ہونٹ سی بھی لیے کیا ہوا
نگاہوں سے الفت چھلکتی رہی

غبارِ دلِ مضطرب تھم گیا
صبا اپنا دامن جھٹکتی رہی

نہ کھلنے پہ بھی میرے دل کی کلی
گلِ تر کی صورت مہکتی رہی

دلِ زار کی آہ بھی زار تھی
اگر آئی لب پر سسکتی رہی

اثرؔ کی سی شیوا بیانی کہاں
بہت یوں تو بلبل چہکتی رہی

○

کچھ نشیمن تو گلوں سے چھا گئے
دور کچھ بجلی کی زد میں آ گئے

سر جھکا کر کچھ کہا، شرما گئے
دلدہی کو آئے تھے شرما گئے

جرم ٹھہرا ہے وفا کا ذکر بھی
ہم سزا اپنے کئے کی پا گئے

منزلِ عشق اب نگاہوں سے ہو طے
پاؤں تو اس راہ میں تھرا گئے

آنے والے آ، کہاں تک انتظار
چاند ڈوبا، تارے بھی کجلا گئے

بجلیوں میں بجلیاں حل ہو گئیں
ناگہاں دو دل جہاں ٹکرا گئے

سعیِ ضبطِ اشک کے باوصف اثرؔ
چند افسانے مژہ تک آ گئے

○

دلہن بنی ہوئی اب کی چمن میں آئی ہے — بہار ہو کے تری انجمن میں آئی ہے
شمیمِ دوست لیے پیرہن میں آئی ہے — نسیم ہوش اڑاتی چمن میں آئی ہے
ظہورِ عشق حقیقت طراز تھا ورنہ — یہ دل کشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے
بسائی جاتی ہے اس میں قمیصِ یوسف کی — ہوا جو مصر سے بیت الحزن میں آئی ہے
وہ بوئے خوں ہے کہ گھٹتا ہے دم معاذ اللہ — بہار وادیٔ زخمِ کہن میں آئی ہے
یہ کس کی خاک ہے جو حسرتِ نشیمن میں — صبا کے دوش پہ صحنِ چمن میں آئی ہے
نسیمِ صبح کے جھونکے مہک وہ پھولوں کی — نفس نفس میں نئی روح تن میں آئی ہے
بقدرِ ذوق نہیں جوئے شیر موج افزا — ہوائے تیشہ سرِ کوہکن میں آئی ہے

گمان ہوتا ہے اُف ری کلام کی گرمی
زبانِ شعلہ اثرؔ کے دہن میں آئی ہے

اساتذۂ غزل

(۲)

سراج دکنی

○

لیا ہے نقدِ جانِ بلبلاں، یعنی خراج اپنا
چلایا خسروِ گل نے اسی رنگوں رواج اپنا

ارے غم! صبح آنے کی خبر ہے سرو قامت کی
قیامت کل تو آتی ہے، عمل کر لے تو آج اپنا

لگا کر راکھ جوگن ہوئی قمری باغ کو تج کر
مگر کوئی سرو قد کے واسطے چھوٹے ہے راج اپنا

ترا غم زہر تھا پر نوشدارو جان کر کھایا
کیا ہے اپنے ہاتھوں دل ہمارے نے علاج اپنا

وہ ظالم ہم کو جلتا دیکھ کر اتنا بھی نہیں کہتا
کہ کیا ثابت قدم ہے، کیوں نہ ہو آخر سراج اپنا

○

خبرِ تحیرِ عشق سن، نہ جنوں رہا، نہ پری رہی،
نہ تو تُو رہا، نہ تو مَیں رہا، جو رہی سو بےخبری رہی

شہِ بیخودی نے عطا کیا، مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی جامہ دری رہی

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظرِ تغافلِ یار کا گلہ کس زباں سے کروں بیاں
کہ شرابِ حسرت و آرزو خُمِ دل میں تھی، سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وُہ دھری رہی

ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سے یہاں ہوا
کہ نہ آئینے میں جلا رہی، نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا، جو رہی سو بے خطری رہی

شاہ مبارک آبرو

○

جان! اگر دشمن ہوئے ہو تُم ہمارے اس قدر
تو ہمارے دل کو کیوں لگتے ہو پیارے اس قدر

گاہ گاہے پیار کی آنکھوں سے کرتا ہے نگاہ
مہرباں ہوتا چلا ہے اب تو بارے اس قدر

دیکھنے کو دوڑتے ہیں لوگ بھو پچھپا سمجھ
آہ سے دل کے نکلتے ہیں شرارے اس قدر

عاجزوں کو بے گنہ آزار دینا خوب نہیں
ڈر خُدا سے! آبرو کو مت ستا رے اس قدر

○

دیکھو تو جان! تم کو مناتا ہوں کب ستی
بولو خدا کے واسطے! ٹک لال لب ستی

یہ جانیو ہر ایک سے لالچ نہیں ہے خوب
ہے بھیک مانگ کھانا بھلا اس کسب ستی

پانی میں ڈوب آگ میں جل کر مرو، پن ایک
عاشق نہ ہو، پکار کے کہتا ہوں سب ستی

باندھا ہے برگِ تاک کا کیوں سر پہ سہرا
کیا آبرو کا بیاہ ہے بنت العنب ستی

شاہ حاتم

○

عاشق کا جہاں میں گھر نہ دیکھا
ایسا کوئی در بدر نہ دیکھا

جیسا کہ اُڑے ہے طائرِ دل
ایسا کوئی تیز پر نہ دیکھا

خوبانِ جہاں ہوں جس سے تسخیر
ایسا کوئی ہم ہُنر نہ دیکھا

اس تیغِ نگہ سے ہو مقابل
ایسا کوئی بے جگر نہ دیکھا

جو آب ہے آبرو میں حاتم!
ایسا کوئی ہم گُہر نہ دیکھا

○

تمہارے عشق میں ہم ننگ و نام بھول گئے
جہاں کے کام تھے جتنے، تمام بھول گئے

گئے تھے زعم میں اپنے، پر اس کو دیکھتے ہی
جو دل نے ہم سے کہے تھے پیام، بھول گئے

تری طرف ہوئی صورت گرانِ چیں کی نگاہ
قلم کو ہاتھ سے رکھ، اپنا کام بھول گئے

تری یہ زلفِ گرہ گیر دیکھ کر صیاد
شکار آپ ہوئے، صید و دام بھول گئے

بڑا غضب ہے کہ حاتم کو تم نہ پہچانا
وہی قدیم تمارا غلام بھول گئے

اشرف علی خان فغاںؔ

○

کہتے ہیں: فصلِ گل تو چمن سے گذر گئی
اے عندلیب! تو نہ قفس بیچ مر گئی

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشکِ سُرخ کا
تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

تنہا اگر میں یار کو پاؤں، تو یُوں کہوں
انصاف تو نہ چھوڑ، مروّت اگر گئی

مجھ سے جو پُوچھتے ہو، تو ہر حال شُکر ہے
یُوں بھی گزر گئی مری، وُوں بھی گزر گئی

آخر فغاںؔ وُہی ہے اسے کیوں بھلا دیا
وہ کیا ہوئے تپاک، وہ اُلفت کدھر گئی!

○

ظالم! تجھے قسم ہے، جو اس کو جلا نہ دے
یہ دل بھی دل نہ ہووے، جو تجھ کو دُعا نہ دے

قاتل کے کیوں قدم سے تڑپ کر پڑا ہے دُور
بسمل! تو اپنے ہاتھ سے شرطِ وفا نہ دے

بے طرح جوشِ گل نے چمن میں لگائی آگ
ڈرتا ہوں آشیانے کو کافر جلا نہ دے

تیرے ہی دل سے پُوچھیے اس غم کو ہاں فغاںؔ
الفت بُری بلا ہے، کسی کو خدا نہ دے

میرزا مظہر جان جاناں

○

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے! بس چلتا نہیں، کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب
پھر انہیں خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں، آتی ہے بہار

شاخ گل ہلتی نہیں، پر بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

○

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے
نہ مجھ کو وہ دماغ و دل رہا ہے

نہیں آتا کسی تکیہ اُپر خواب
یہ سر پاؤں سے تیرے ہِل رہا ہے

خدا کے واسطے! اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

میر سوز

○

یہ تیرا عشق کب کا آشنا تھا
کہاں کا جان کو میری دھرا تھا

وہ ساعت کون سی تھی یا الٰہی!
کہ جس ساعت دوچار اس سے ہوا تھا

میں کاش! اس وقت آنکھیں موند لیتا
کہ میرا دیکھنا، مجھ پر بلا تھا

میں اپنے ہاتھ اپنے دل کو کھویا
خداوندا! میں کیوں عاشق ہوا تھا

ولے کیا آن تھی، اللہ اللہ!
کہ جس غمزے سے چھاتی پر چڑھا تھا

وہ مجھ کو ذبح کرتا تھا چھری سے
میں اس کی تیز دستی تک رہا تھا

نہ تھا اس وقت جز اللہ کوئی
ولے یہ سوز پہلو میں کھڑا تھا

○

مری جان جاتی ہے، یارو! سنبھالو!
کلیجے میں کانٹا چبھا ہے، نکالو

نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی
مجھے مار ڈالو، مجھے مار ڈالو

خدا کے لیے، اے مرے ہم نشینو!
یہ بانکا جو جاتا ہے اس کو بلا لو

اگر وہ نہ آوے تمہارے کہے سے
تو منت کرو، گھیرے گھیرے بلا لو!

اگرچہ خفا ہو کے وہ گالیاں دے
تو دم لے رہو، کچھ نہ بولو نہ چالو

کہو: ایک بندہ تمہارا مرے ہے
اسے جاں کنی سے تو جا کر بچا لو!

جلوں کی بری آہ ہوتی ہے پیارے
تم اس سوز کی اپنے حق میں دعا لو

قائمؔ چاندپوری

○

ہو گر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت
تم سلامت رہو! بندہ کے خریدار بہت

ہم گر جب خفگی آئی، تو جھگڑا کیا ہے
تم کو خواہندہ بُت ہم کو طرحدار بہت

سچ کہو، قتل پہ کس کے یہ کمر باندھی ہے
ان دنوں ہاتھ میں تم رکھتے ہو تلوار بہت

قائمؔ آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

○

رکھتا ہے جو تو صفائے عارض
موتی نے کہاں یہ پائے عارض

اک صافئ تن ہے گُل میں بھی لیک
ایسا وہ کہاں سے لائے عارض

اس پسینے سے مُنہ رگڑ نہ اے داغ
اس کی نہ چھٹی کبھو یہ جائے عارض

بیعانے میں مہر و ماہ دیتے
تیرا ہو جہاں بہائے عارض

کس سے کہوں اس کے منہ کا نقشہ
اے وائے جبین وہائے عارض

کیا دور، جو حشر ہووے قائمؔ
کمھلاٹ جو وُہ دکھائے عارض

انعام اللہ خاں یقین

○

سرِ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا
ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

مجھے زنجیر کرنا کیا مناسب تھا بہاراں میں
کہ گُل ہاتھوں میں اور پاؤں میں میرے خار بہتر تھا

ہموں نے ہجر سے کچھ وصل میں دُھڑکے بہت دیکھے
ہمارے حق میں اس راحت سے وہ آزار بہتر تھا

مرا دل مر گیا جس دن سے نظارہ سے باز آیا
یقیںؔ پرہیز اگر کرتا، تو وہ بیمار بہتر تھا

○

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
بُرا بُرا نہیں یہ شغل، کچھ بھلا بھی ہے

اس اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے کہیں
یہ دل کچھ آب رسیدہ ہے کچھ جلا بھی ہے

یہ آرزو ہے کہ اس بے وفا سے یہ پوچھوں
کہ میرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے بجن خاک میں ملانے کا
کسو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے

یقیںؔ کا شورِ جنوں سُن کے یار نے پوچھا
کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

خواجہ احسن اللہ بیانؔ

○

مَیں ترے ڈر سے رو نہیں سکتا
گردِ غم دل سے دھو نہیں سکتا

شب مرا شورِ گریہ سُن کے کہا
اس کے ہاتھوں میں سو نہیں سکتا

مصلحت ترکِ عشق ہے ناصح
لیک یہ ہم سے ہو نہیں سکتا

جوں مسلسل بیاںؔ کہے ہے سخن
کوئی موتی پرو نہیں سکتا!

○

جو ہوتا ہے ریحان و سُنبل کے صدقے
نہ ہوں کیونکہ اس زلف و کاکل کے صدقے

خزاں میں بھی چھوڑا نہ طوفِ چمن کو
غرض ہو جیے عشقِ بلبل کے صدقے

جلو میں پھرے ہیں پری زاد لڑکے
دِوانے ترے اس تجمّل کے صدقے

ابھی وعدہ کر کر، لگا سوچنے تُو
نہیں یاد گویا، تامّل کے صدقے

بیاںؔ کون ہے؟ اب تلک پُوچھتے ہو
تغافل کے قرباں، تجاہل کے صدقے

ہدایت خاں ہدایتؔ

○

پہنچے ہے فصلِ گُل کوئی حسنِ نگار کو
مکھڑے پہ اُس کے صدقے کیا نو بہار کو

کس دل جلے کی آگ لے گزری چمن میں آج
دیکھا عرق فشاں میں نسیمِ بہار کو

لازم ہے دستگیریِ افتادگاں نسیم!
لے پہنچ اس گلی کے تئیں مجھ غبار کو

نالے سے میرے اور تُو اب چاہتا ہے کیا
پانی تو کر دیا ہے دلِ کوہسار کو

اللہ رے کارخانۂ تقدیرِ ذوالجلال
یہ اعتبار ہستیٔ بے اعتبار کو

○

رہا مرتے مرتے مجھے غم اسی کا
نہیں بعد میرے کوئی بے کسی کا

کیا تیغِ قاتل نے جب کام اپنا
میں مُنہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا

عبث ہے غرض ان بتاں سے بھی ملنا
نہیں آج دنیا میں کوئی کسی کا

کیا حسن سے اُس نے آگاہ اُس کو
الٰہی! ہو خانہ خراب آرسی کا

ہدایتؔ کہا ریختہ جب سے ہم نے
رواج اٹھ گیا ہند سے فارسی کا

میر محمدی بیدارؔ

○

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجیے گا
ایک ملنے کو نہ کم کیجیے گا

گر یہی زلف دہی بکھرا ہے
غارتِ دیر و حرم کیجیے گا

جی میں ہے آج بجائے مکتوب
یہی بیت اس کو رقم کیجیے گا

مہربانی سے پھر اے بندہ نواز!
کہیے! بس روز کرم کیجیے گا

○

تیری ہم خاطرِ نازک سے خطر کرتے ہیں
ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

دل و دیں تھا سو لیا، اور بھی کچھ مطلب ہے
بار بار آپ جو ادھر کو نظر کرتے ہیں

کیا ہو گر ایک گھڑی یاں بھی کرم فرماؤ
آپ اس راہ سے آخر تو گزر کرتے ہیں

تیرے ایامِ فراق، اے صنم مہر گسل
آہ! مت پوچھ کہ کس طرح بسر کرتے ہیں

دن کو پھرتے ہیں تجھے ڈھونڈتے اور رات تمام
شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کرتے ہیں

یہ وہی فتنہ و آشوب جہاں ہے بیدارؔ
دیکھ کر پیر و جواں جس کو حذر کرتے ہیں

بس نہیں خوب کہ ایسے کو دل اپنا دیجے
آگے تو جان میاں! ہم تو خبر کرتے ہیں

میر عبدالحیؔ تاباںؔ

○

رہتا ہے خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہُوا
میرے غریب دل کو الٰہی ! یہ کیا ہُوا

مَیں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح
یارب ! کبھی خوشی سے نہ دیکھا کھلا ہُوا

تو دیکھ مجھ کو نزع میں مت کڑھ کہ تیرے یار
مجھ سے بہت ہیں ، ایک نہ ہو گا ، تو کیا ہُوا

ہر دم کروں نہ کیونکہ گریباں کو اپنے چاک
آتا ہے یاد یار کا جامہ چسا ہُوا

تاباںؔ کے دیکھنے سے بُرا مانتے تھے ہم
کھو دی بہار خط نے تمہاری ، بھلا ہُوا

○

آئی بہار ، شورشِ طفلاں کو کیا ہُوا
اہلِ جنوں کدھر گئے ، یاراں کو کیا ہُوا

غنچے لہو میں تر نظر آتے ہیں تہ بہ تہ
اس رشکِ گُل کو دیکھ ، گلستاں کو کیا ہُوا

اس جامہ زیب غنچہ دہن کو چمن میں دیکھ
حیراں ہوں مَیں کہ گل کے گریباں کو کیا ہُوا

آنے سے تیرے خط کے یہ کیوں ہے گرفتہ دل
بتلا کہ تیری زلفِ پریشاں کو کیا ہُوا

روتے ہی تیرے غم میں گزرتی ہے اس کی عُمر
پُوچھا کبھی نہ تُو نے کہ تاباںؔ کو کیا ہُوا

میر اثرؔ

○

ہم ہیں بے دل، نہ دل اپنے پاس نہیں
آہ! اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں

بے وفا کچھ نہیں تری تقصیر
مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

قتل میرا ہے، تیری بدنامی
جان کا ورنہ کچھ ہراس نہیں

تُو ہی بہتر ہے ہم سے آئینے
ہم تو اتنے بھی رُوشناس نہیں

یُوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثرؔ کی ہمیں تو آس نہیں

○

دل میں ہے جَور ترے از سرِ نو یاد کریں
تُو سُنے یا نہ سُنے، نالہ و فریاد کریں

ان بُتوں کی ہے بڑی دوڑ یہی دل شکنی
یہ کہاں، جو یہ کسی دل کے تئیں شاد کریں

ہم اسیروں کی اسے چاہئے خاطر داری
اور الٹی نہ کہ ہم خاطرِ صیاد کریں

آپ کے دل سے بھلا ٹک تو نکل جائے بخار
اور بھی جی میں جو کچھ ہوئے سو ارشاد کریں

جعفر علی حسرتؔ

○

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا
تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا

فلک اک دم بھی تُو نے وصل کی شب کو نہ ٹھہرایا
یہ ساری عُمر میں تجھ تک ہمارا کام آیا تھا

بہاریں بھول گئیں، پر یاد ہے اتنا کہ گلشن میں
گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

نہیں معلوم کیا تھا، جو سحر تک شمع رو یا کی
کچھ اپنا حال پروانہ سنانے شام آیا تھا

ہوا لبریز جام زندگی جس وقت اے حسرتؔ
دریغ! اس وقت میں ساقی پلانے جام آیا تھا

○

کس کا ہے جگر، جس پہ یہ بیداد کرو گے
لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں، کیا یاد کرو گے

دل لینے کو اَوروں سے بھی کہہ دیکھو بھلا تم
لا دیں گے بجا ہم تو، جو ارشاد کرو گے

بے خوابی و حیرانی و طغیانیٔ گریہ
سب آنکھوں پہ ہم لیں گے جو امداد کرو گے

تاراج کیا صبر و دل و جان، پھر آگے
کیا خاک ہے مجھ میں جسے برباد کرو گے

کہہ دیجو صبا ٹک تو جوانانِ چمن سے
فرحت ہے کسی دل کو اگر شاد کرو گے

پانی کریں پتھر کو بھی حسرتؔ کی یہ آہیں
دل اپنا بتاں تک تئیں فولاد کرو گے

سعادت یار خاں رنگین

○

دل تھا جو بساط اپنی، سو گذران چُکے ہیں
جی نذر کریں، جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں

مت چُوک! ادھر دیکھ! یہ ہے مفت کا سودا
اک بوسہ پہ دین و دل و ایمان چُکے ہیں

سو بار کہا آؤں گا، اور آئے نہ ہرگز
بدعہد ہو تم، ہم تمہیں پہچان چُکے ہیں

پھر چل نہیں کچھ فائدہ، بس سونے دے رنگیں
وہ منہ پہ دوپٹے کے تئیں تان سے چکے ہیں

○

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے
مجھ کو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے

شکوہ ہم کرتے ہیں کیوں رسم ہے دُنیا کی یہی
دل جو لگتا ہے، تو پھر پاس کہاں رہتا ہے

جو ترے پاس سے آتا ہے، میں پوچھوں ہوں یہی
کیوں جی! کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

پنکھڑی گل کی جو کروٹ تلے اس کے آئے
نازک اتنا ہے بدن اس کا، نشاں رہتا ہے

ق

اس ستمگر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا
کوئی رنگین بھی ترے کوچہ میں یاں رہتا ہے

تر کچھ اک تاؤ سا کھا، چیں بجبیں ہو کے وہیں
گالی دے کر یہ کہا اس نے کہ ہاں رہتا ہے

شاہ نصیرؔ

○

کب دل نہیں پھولوں سے ہمارا ہمہ تن چشم
نظارۂ ساقی کو ہے مینا ہمہ تن چشم

تو وُہ چمن آرا ہے کہ ہر دستۂ نرگس
دیکھے ہے تر ابن کے تماشا ہمہ تن چشم

بُرقع کو اُلٹ مُنہ سے جو کرتا ہے تو باتیں
اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم

کیا خاک ہو صیّاد مجھے چشمِ رہائی
حلقوں سے بنا دام ہے تیرا ہمہ تن چشم

آنکھوں کے تصور میں نصیرؔ اس کی شب و روز
دل صورتِ آئینہ ہے اپنا ہمہ تن چشم

○

قدم نہ رکھ مرے چشم پُر آب کے گھر میں
بھرا ہے موج کا طوفاں حباب کے گھر میں

کھلے ہے دیکھ کے وُہ عکسِ رُخ بہ ساغرِ مے
نزولِ ماہ ہُوا آفتاب کے گھر میں

مدام رند کریں کیوں نہ آستاں بوسی
حرم ہے شیخ مشیخت مآب کے گھر میں

ہمارے دل میں کہاں آبلے ہیں اے ساقی
چُنے ہوئے ہیں یہ شیشے شراب کے گھر میں

دلا نہ کیونکہ کروں اختلاط کی باتیں!
حجاب گیا ہے اب اس بے حجاب کے گھر میں

نصیرؔ دیکھ! تو کیا جلوۂ خدائی ہے
ہمارے اس محبت خانہ خراب کے گھر میں

میر نظام الدّین ممنونؔ

○

بندہ ہُوں حسنِ صورت و عشقِ مجاز کا
ہر آئینہ میں جلوہ ہے اُس جلوہ ساز کا

اے آہ بے ادب! نہ اسے پھُونکیو کہ ہے
دل جلوہ گاہ، پردہ نشینانِ راز کا

ہے آستانِ دیر پہ اپنی نشست و خاست
کب ہو حرم میں ہم کو ارادہ نماز کا

یاں جان تک بھی دے چکے پروا ہی اں نہیں
جھگڑا چکے گا کیوں کہ یہ ناز و نیاز کا

ممنونؔ دلِ ستم زدہ ہے عشق کا حریف
یاں ہے دو چار صعوۂ بے بال، باز کا

○

ہم سے کتنے بے دلوں کی کب ہے منزل تک پہنچ
یار گو دل میں ہے، پر ہم کو کہاں دل تک پہنچ

کشتیٔ طاقت شکستہ اور بحرِ غم کا جوش
مژدہ نومیدی نہیں اب اپنی ساحل تک پہنچ

دشتِ تنہائی میں صحرا گرد ہے، جُوں گرد باد
مشتِ خاکِ قیس کی، مشکل ہے محمل تک پہنچ

صید گاہِ شوق میں کیا بے ادب وُہ صید ہے
جو کہ جاتا ہے تڑپ کر پائے قاتل تک پہنچ

کرامت علی شہیدیؔ

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

پری اُٹھی مرے پہلو سے بارہا ناکام
فریفتہ ہوں تری طرزِ دل رُبائی کا

مجھے عذابِ جہنم کہ بُت پرست ہوں میں
وہ بت بہشت میں دعویٰ جسے خدائی کا

فضائے باغ سے ہے گوشۂ قفس خوشتر
گر اپنے دل میں نہ ہو دغدغہ رہائی کا

ادب نہ وادیٔ وحشت کے مجھ سے ترک ہوئے
جنوں میں ہوش رہا ہے برہنہ پائی کا

نگاہ، خندہ، تغافل، عتاب کہنہ ہوئے
نکال طرز نیا کوئی دل رُبائی کا

بُتوں کا سجدہ مری سرنوشت میں کب تھا
کہ عزم کعبہ کے در پر ہو جبہ سائی کا

ابتک رہا ہے کھڑا بام عرش پہ کم بخت
قلق ہے مجھ کو شہیدیؔ کی نارسائی کا

○

جی چاہے گا جس کو، اُسے چاہا نہ کریں گے
ہم عشق و ہوس کو کبھی یک جا نہ کریں گے

اے کاش! بچیں عہد شکن بن کے جہاں میں
باز آئے! وفاداری کا دعویٰ نہ کرینگے

گو حُسن پرستی نہ ہو خاطر سے فراموش
خوش قامتوں کا یاد سراپا نہ کریں گے

نرگس کی شب تیرہ میں لوٹیں گے بہاریں
پر سُرمگیں آنکھوں کی تمنا نہ کریں گے

بہلائیں گے سیرِ گُل و شبنم سے دل اپنا
اس عارضِ گُل رنگ کی پروا نہ کریں گے

انگاروں پہ لوٹیں گے، پر ان شعلہ رُخوں کے
نظارہ سے ہم آنکھ بھی سینکا نہ کریں گے

عصمت کا انہیں خوف ہے، تقویٰ کا ہمیں پاس
نے کی ہے کبھی خواہشِ بے جا، نہ کریں گے

کہنے کے شہیدیؔ کے بُرا مانیو مت جان!
ہیں عاشقِ صادق کبھی ایسا نہ کریں گے

وزیر لکھنوی

○

چلا ہے او دلِ راحت طلب! کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

سی باعث تو قتلِ عاشقاں کو منع کرتے تھے
کیلے پھر رہے ہو، یوسفِ بے کارواں ہو کر

کیا قتل اس نے غیروں کو مُوئے ہم رشک کے مارے
جل بھی دوستو! آئی نصیبِ دشمناں ہو کر!

بناوٹ نے بگاڑا، باتیں سنوائیں خموشی نے
نہ پوچھو، ہم نے کیا ہی منہ کی کھائی بے زباں ہو کر

وہ پیاسا ہوں، لگا کر تیغ پر آب اس نے جب کھینچی
نکل آئی دہانِ زخم سے سوکھی زباں ہو کر

دا سے جھک کے ملتے ہو، نگہ سے قتل کرتے ہو
ستم ایجاد ہو، ناوک لگاتے ہو، کماں ہو کر

○

سر مرا کاٹ کے پچھتائیے گا
جھوٹی پھر کس کی قسم کھائیے گا

کیا گریباں نے گلا گھونٹا ہے
ادھر اے دستِ جنوں آئیے گا

آپ کہتے ہیں کہ جا، جاتا ہوں
پر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا

تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے
ابھی پہلو سے نہ اٹھ جائیے گا

کہئے! یارانِ عدم، کیا گذری
کچھ لبِ گور سے فرمائیے گا

مردمِ چشم سے گر آئے حجاب
آنکھ کے پردے میں چھپ جائیے گا

ہم بھی آنکلیں گے مسجد میں وزیر
خشتِ خم لے کے جو بنوائیے گا

صبا لکھنوی

○

واعظ کے ہیں ضرور ڈرانے سے ڈر گیا
جام شراب لائے بھی ساقی کدھر گیا

بلبل کہاں، بہار کہاں، باغباں کہاں
وُہ دن گزر گئے، وہ زمانہ گُزر گیا

ایسی ہوا چلی مری آہوں کی رات کو
سب آسماں پہ خرمن انجم بکھر گیا

اچھا ہُوا جو ہو گئے وحدت پرست ہم
فتنہ گیا، فساد گیا، شور و شر گیا

کعبے کی سمت سجدہ کیا دل کو چھوڑ کر
تو کس طرف تھا دھیان ہمارا کدھر گیا

پھر سیر لالہ زار کو ہم اے صبا چلے
آئی بہار، داغ جنوں پھر ابھر گیا

○

تری طرف سے دل اے جانِ جاں اُٹھا نہ سکے
بہت ضعیف تھے بارِ گراں اُٹھا نہ سکے

ہزار بار بہار آئی، لیکن اے صیاد
نگاہ ہم طرفِ بوستاں اُٹھا نہ سکے

اسیر زلف جو مرتے ہیں تو وُہ کہتے ہیں
ذرا بھی صدمۂ قیدِ گراں اُٹھا نہ سکے

سنیں جو یار کی باتیں غش آ گیا ہم کو
یہ ناتواں تھے کہ لطفِ بیاں اُٹھا نہ سکے

دیا شنکر نسیم

○

جب ہو چکی شراب، تو مَیں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

نے قاصدِ خیال نہ پیکِ نظر گیا
اُن تک میں اپنی آپ ہی لے کر خبر گیا

سمجھا ہے حق کو اپنے ہی جانب ہر اک شخص
یہ چاند اُس کے ساتھ چلا، جو جدھر گیا!!

طوفانِ نوح اس میں ہو یا شورِ حشر ہو
ہونا جو کچھ ہے ہوگا، جو گزرا، گزر گیا

مَیں نے بھی آنکھیں دیکھی ہیں پریوں کی جا بجا
تم نے دکھائی آنکھ مجھے، اور مَیں ڈر گیا!

گزرا جہاں سے مَیں تو کہا اُن کے یار نے
فتنہ گیا، فساد گیا، دردِ سر گیا!

کاغذ سیاہ کرتے ہو کس کے لیے نسیم
آیا جواب خط نہیں اور نامہ بر گیا

○

خم نہ بن کر خود غرض ہو جائیے
مثلِ ساغر اور کے کام آئیے

ابرِ رحمت سُنتے ہیں نام آپ کا
خاکساروں پر کرم فرمائیے!

آپ آہو چشم ہیں، آہو نہیں!
ہم سے وحشت کی نہ لیجیے، آئیے!

صبر رُخصت ہو تو جانے دیجیے
بے قراری آئے، تو ٹھہرائیے

جوہرِ تیغِ نگہ کھل جائے گا!
منہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے

دل میں ہے دکھلائیے تاثیرِ عشق
ٹھنڈی سانسوں سے انہیں گرمائیے

سرد آہیں بھرتے ہیں جب ہم نسیم
کہتے ہیں وہ! ٹھنڈے ٹھنڈے جائیے

رندؔ لکھنوی

○

رکھو خدمت ہیں مجھ سے کام تو لو
بات کرتے نہیں سلام تو لو

بات تم نے نہیں کی غیر سے کل
سر پہ اللہ کا کلام تو لو!

ناز و انداز و حسن و خوبی میں
کون ہے تم سا، اس کا نام تو لو

رندؔ حاضر ہیں شیشہ و ساغر
مے نہ سمجھو اگر حرام، تو لو!

○

مجھے دے کے دل، جان کھونا پڑا ہے
غرض ہاتھ دونوں سے دھونا پڑا ہے

جو رونا یہی ہے، تو پھوٹیں گی آنکھیں
مجھے اب تو آنکھوں کا رونا پڑا ہے

کیے سینکڑوں گھر محبت نے غارت
سنو جس محلّے میں، رونا پڑا ہے

میں پاتا نہیں دل کو سینے میں اپنے
کئی دن سے خالی یہ کونا پڑا ہے

کرو چل کے آباد اب گور اے رندؔ!
بہت دن سے سونا وہ کونا پڑا ہے

نسیم دہلوی

(نواب اصغر علی خان)

فصلِ گل آئی ہے کل اَور ہی ساماں ہوں گے
میرے دامن میں ترے دست و گریباں ہوں گے

سب یہ کافر ہیں، حسینوں کی نہ سُن تُو اے دل!
چار دن بعد یہی دشمنِ ایماں ہوں گے

کس طرح جانیں گے مانع ہے یہیں خوفِ مزاج
زلف پرخم ہے، تو کچھ وہ بھی پریشاں ہوں گے

گریہ انجام تبسم ہے، نہ ہنس اے غافل!
خون روئیں گے وُہی زخم جو خنداں ہوں گے

یاد آئے گا پسِ مرگ ہمارا یہ کمال
حال کُھل جائے گا جب خاک میں پنہاں ہوں گے

خانہ زادوں کو کہاں قیدِ محبت سے فراغ
ہم وہ بلبل ہیں یہیں خاکِ گلستاں ہوں گے

دورِ ہر نخل کریں گے صفتِ گردِ نسیم
ہم پسِ مرگ بھی قربانِ گلستاں ہوں گے

دیکھ او قاتل! بسر کرتے ہیں کس مشکل سے ہم
چارہ گر ہے دردِ نالاں، درد سے دل، دل سے ہم

ہائے کیا بے خود کیا ہے غفلتِ امید نے
حالِ دل کہتے ہیں اپنا پھر اسی قاتل سے ہم

رشکِ اعدا نے کئے روشن بدن میں استخواں
شمعِ محفل ہو کے اُٹھے آپ کی محفل سے ہم

اس کو کہتے ہیں وفاداری کہ بعد از قتل بھی
داغِ خوں ہو کر نہ چھوٹے دامنِ قاتل سے ہم

چشمِ روشن سے نظر آتے ہیں جلوے رُوح کے
حسن لیلےٰ دیکھتے ہیں پردۂ محمل سے ہم

خالی از احساں نہیں یہ بھی کہ وقتِ اضطراب
خوش تو ہو جاتے ہیں تیرے وعدۂ باطل سے ہم

آؤ آپس میں سمجھ لیں غیر کا ہے کو سُنے
تم کہو دل سے ہمارے کچھ تمہارے دل سے ہم

ہنس کے رو دیتے ہیں اکثر صورتِ زخمِ جگر
آپ شرماتے ہیں اپنے خندۂ باطل سے ہم

رشک ہے حسرت پہ اس کی دل میں آتا ہے یہی
اپنے قالب کو بدل لیں قالبِ بسمل سے ہم

سینہ و دل میں ہجومِ داغِ حسرت ہے نسیم
پھول چن لیتے ہیں اپنے گلشنِ حاصل سے ہم

ظہیر دہلوی

○

ساقیا! مر کے اُٹھیں گے ترے مے خانے سے
عہد و پیماں ہیں یہی زیست میں پیمانے سے!

تو کہاں آئی مرا درد بٹانے کے لیے
اے شبِ ہجر! نکل جا مرے غم خانے سے

کون ہوتا ہے مصیبت میں کسی کا دل سوز
اُٹھ گئی شمع بھی جل کر مرے کاشانے سے

مجھ پہ بھی کوہ کن و قیس پہ گذری ہو گی!
ملتی جلتی ہے کہانی مرے افسانے سے

جبہ فرسائے درِ کعبہ تھے کل تک تو ظہیر
گرتے پڑتے ہوئے آج آتے ہیں بتخانے سے

○

وہ نیرنگِ الفت کو کیا جانتا ہے
کہ اپنے سے مجھ کو جُدا جانتا ہے

کچھ ایسی تو دشمن میں خوبی نہیں ہے
مگر تو خدا جانے کیا جانتا ہے

یہ منہ سے تو کہتا ہوں چھوڑی محبت
مگر حال دل کا خُدا جانتا ہے

تمہاری شرارت کو کیا جانے کوئی
یہ مَیں جانوں یا دل مرا جانتا ہے

ظہیر اپنے عیبوں کو مَیں جانتا ہوں
زمانہ مجھے پارسا جانتا ہے

سالکؔ دہلوی

○

مجھ ناتواں پہ حشر میں وہم فغاں غلط
مَیں گفتگو کی تاب رکھوں، یہ گماں غلط

تم بھی وہی کہو، تو کہیں سب بجا۔ درست
مَیں بھی وُہی کہوں، تو کہے اک جہاں غلط

گرمی سے اُس کے حُسن کی، جس کا جگر جلا
تشبیہِ مہر و رُوئے نکوئے بُتاں غلط

کہئے! اسیرِ خواہشِ سُنبل کوئی ہُوا
دینی مثال کاکلِ عنبر فشاں غلط

سچ ہے کہ آدمی کو غرض آدمی سے ہے
واعظ! بیانِ دلکشِ حورِ جناں غلط

کہہ کر تمام سالکؔ غمگیں کا ماجرا
مَیں نے کہا غلط ہے، تو بولے کہ ہاں غلط

○

کچھ تغیّر مرے احوالِ پریشاں میں نہیں
ایسے عالم میں ہُوں، جو عالمِ امکاں میں نہیں

صبحِ محشر بھی دکھائی نہیں دیتی یارب!
روزِ بد بھی تو نصیب شبِ ہجراں میں نہیں

وحشتِ عشق کو ثابت قدمی بھی ہے ضرور
قیس کا نقشِ قدم تک تو بیاباں میں نہیں!

ہو گیا ذوق فزائے خلشِ یادِ مژہ!
کون کہتا ہے کہ لذّت ترے پیکاں میں نہیں

دشتِ وحشت میں اکڑے پھرتے ہیں آرام سے ہم
جو صفت ضعف میں ہے تختِ سلیماں میں نہیں

میر مہدی مجروح

○

غیروں کو بھلا سمجھے اور مجھ کو برا جانا
سمجھے بھی تو کیا سمجھے، جانا بھی تو کیا جانا

اک عمر کے دکھ پائے، سوتے ہیں فراغت سے
اے غلغلۂ محشر! ہم کو نہ جگا جانا

کیا یار کی بدخوئی، کیا غیر کی بدخواہی
سرمایۂ صد آفت ہے دل ہی کا آ جانا

کچھ عرضِ تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا
میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

چلمن کا الٹ جانا، ظاہر کا بہانہ ہے
ان کو تو بہر صورت اک جلوہ دکھا جانا

ہے حق بطرف اس کے، چاہے سو ستم کر لے
اس نے دلِ عاشق کو مجبورِ وفا جانا

انجام ہوا اپنا آغازِ محبت میں
اس شغل کو جاں فرسا ایسا تو نہ تھا جانا

مجروح ہوئے مائل کس آفتِ دوراں پر
اے حضرتِ من تم نے دل بھی نہ لگا جانا

○

گریباں چاک ہیں گل بوستاں میں
اثر کتنا ہے بلبل کی فغاں میں

قفس صیاد کا خالی پڑا ہے
نہ ہوں بے چین کیونکر آشیاں میں

دعائے وصل جا اب تو اثر تک
کیے نالوں نے روزن آسماں میں

سنے گر طالعِ خفتہ کا قصہ
تو نیند آ جائے چشمِ پاسباں میں

زلیخا کی بچھی جاتی ہیں آنکھیں
کہیں یوسف نہ ہو اس کارواں میں

تمام اسبابِ دنیاوی کے بدلے
ہے اک بے رونقی اپنی دکاں میں

سنا حالِ دلِ مجروح شب کو
کوئی حسرت سی حسرت تھی بیاں میں

جلاؔل لکھنوی

○

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا
ملا وہ غم کدہ، جس میں چراغ بھی نہ ملا

گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلفِ یار کی بو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

اسیر کر کے ہمیں، کیوں رہا کیا صیاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے، وہ باغ بھی نہ ملا

بتوں کے عشق میں کیا ہوتی ہم سے یادِ خدا
کہ دل بھی تھا نہ ٹھکانے، فراغ بھی نہ ملا

دکھائیں یار کو کیا جسمِ داغدار کی سیر
نظر فریب ہمیں ایک داغ بھی نہ ملا

بھر آئے محفلِ ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی
وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ ملا

چراغ لے کے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈیں
شبِ فراق تھی، کوئی چراغ بھی نہ ملا

خبر کو یار کی بھیجا تھا، گم ہوئے ایسے
حواسِ رفتہ کا اب تک سراغ بھی نہ ملا

جلاؔل باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے، ہم کو داغ بھی نہ ملا

○

نہ ٹھہری جب کوئی تسکینِ دل کی شکل یاروں میں
تو آ نکلے تڑپ کر ہم تمہارے بے قراروں میں

کسی کے عشق میں دردِ جگر سے دل یہ کہتا ہے
ادھر بھی آ نکلنا ہم بھی ہیں امیدواروں میں

وہ ماتم بزمِ شادی ہے، تمہاری جس میں شرکت ہو
وہ مرنا، زندگی ہے، تم جہاں ہو سوگواروں میں

تعلّی سے یہ نفرت ہے کہ بعدِ مرگ خاک اپنی
اگر اٹھتی بھی ہے جا بیٹھتی ہے خاکساروں میں

ہمارے دل نے ہم سے بے وفائی کر کے کیا پایا؟
وہاں بھی جا کے ٹھہرایا گیا بے اعتباروں میں

وہ کھینچوں گا جلاؔل آہیں کہ اس کی خاک اڑا دیں گی
فلک نے پیس ڈالا ہے سمجھ کر خاکساروں میں

تسلیم لکھنوی

○

وصل کی شب بھی ادائے رسمِ حرماں میں رہا
صبح تک میں التماسِ شوقِ پنہاں میں رہا

مر گئے لاکھوں شہیدِ ناز، کچھ پروا نہیں
وہ تماشائے ہلالِ عیدِ قرباں میں رہا

کام اپنا کر چکی بیماریٔ عشقِ بتاں
میں فریبِ نسخہ و تاثیرِ درماں میں رہا

واہ رے پاسِ وفا! اللہ ری شرمِ آرزو
ہر نفس ہمراہیٔ عمرِ گریزاں میں رہا

کیا پڑھے اشعارِ تسلیمِ جگر افگار نے
شورِ تحسیں ہر طرف بزمِ سخنداں میں رہا

○

کل مرا تھا، آج وہ بُت غیر کا ہونے لگا
وائے قسمت دو ہی دن میں کیا سے کیا ہونے لگا

یاد میری آگئی، منہ پھیر کر رونے لگے
انجمن میں اُن کی جب ذکرِ وفا ہونے لگا

ہائے کب اُس نے نکالے اپنے پیکاں کھینچ کر
درد کی لذّت سے جب دل آشنا ہونے لگا

آہ نے اتنی تو کی تاثیر پیدا، شکر ہے
بام پر آنے لگے وہ، سامنا ہونے لگا

بام پر جب تک وہ مہرِ حُسن ہے سرگرمِ سیر
بھیڑ کیوں چھٹنے لگی، کیوں راستا ہونے لگا

خوب رویا بیٹھ کر واماندگی کی جان کو
جب مری نظروں سے پنہاں قافلا ہونے لگا

یہ بھی اے تسلیم ہے برگشتہ بختی کا اثر
جب دوا کی ہم نے دردِ دل سوا ہونے لگا

مرزا قادر بخش صابرؔ

○

جو دل کو محبت کے مزے آئے ہوئے ہیں
وہ اپنی طبیعت پہ ابھی چھائے ہوئے ہیں!

ہر بات پہ اظہارِ نزاکت ہے، حیا ہے!
ثابت ہے کہ تکلیف بھی کچھ پائے ہوئے ہیں

کچھ تم نے ہمیں دل میں سمجھ رکھا ہے سمجھو!
کچھ ہم بھی تمہیں ذہن میں ٹھہرائے ہوئے ہیں

پھر ملنے کو جی چاہتا ہے یار کا ہم سے
ناچار ہیں غصے میں قسم کھائے ہوئے ہیں!

اللہ ری ضد کوٹھے کے چڑھنے کو کیا ترک!
جس روز سے ہم یار کے ہمسائے ہوئے ہیں

اب دل کو لگاتے ہیں ذرا سوچ سمجھ کر
دو چار جگہ پہلے جو زک پائے ہوئے ہیں

کچھ در پہ جھکائے ہوئے سر بیٹھے ہیں صابر
اس بزم سے شاید کہ نکلوائے ہوئے ہیں!

○

پہلے نہ اُڑایا کسی بے کس کے جگر کو
پر ہم نے لگائے ہیں ترے تیرِ نظر کو

ہے تیرِ نگہ بزمِ عدو میں مری جانب
غصے میں چھپایا ہے محبت کی نظر کو

کیوں آتشِ گُل باغ میں ہے تیز کہ ہم آپ
اٹھ جائیں گے اے شبنمِ شاداب! سحر کو

دن رات کا فرق ان کی محبت میں ہے اب تو
وعدہ تو کیا شام کا اور آئے سحر کو

دل چیز ہے کیا جان بھی دُوں عشق میں صابرؔ
میں نفع سمجھتا ہوں مدام ایسے ضرر کو

نظام رامپوری

○

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو، چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

بے ساختہ نگاہیں جو آپس میں مل گئیں
کیا منہ پہ اُس نے رکھ لئے آنکھیں چُرا کے ہاتھ

یہ بھی نیا ستم ہے حنا تو لگائیں غیر
اور اس کی داد چاہیں وہ مجھ کو دکھا کے ہاتھ

بے اختیار ہو کے جو مَیں پاؤں پر گرا
ٹھوڑی کے نیچے اُس نے دھرا مسکرا کے ہاتھ

قاصد! ترے بیاں سے دل ایسا ٹھہر گیا
گویا کسی نے رکھ دیا سینے پہ آ کے ہاتھ

دیکھا جو کچھ رُکا مجھے، تو کس تپاک سے
گردن میں میری ڈال دئے آپ آ کے ہاتھ

کوچے سے تیرے اُٹھیں تو پھر جائیں ہم کہاں
بیٹھے ہیں یاں تو دونوں جہاں سے اُٹھا کے ہاتھ

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ!
مُنہ پھیر کر اُدھر کو، اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ!

○

کیوں کرتے ہو اعتبار میرا — معلوم ہے تم کو پیار میرا
یہ خیر ہے آج، کچھ تو کہئے! — کیوں ذکر ہے بار بار میرا
اِک بات میں فیصلہ ہے تم سے — رنجیدہ ہے دل ہزار میرا
تیرا نہیں اعتبار مجھ کو! — تو بھی نہ کر اعتبار میرا
شاید کہ نہ ہو تم اپنے بس میں — دل پر تو ہے اختیار میرا
مجھ کو نہ ہو رشکِ غیر ممکن — تو اور ہو دوستدار میرا
کچھ سمجھے ہوئے ہیں اپنے دل میں — سنتے نہیں حالِ زار میرا
وہ ہائے بگڑ کے اس کا جانا — رونا وہیں زار زار میرا

کل تک تو نظامؔ یہ نہ تھا حال
دل آج ہے بے قرار میرا

بیانؔ یزدانی

○

جھونکے آتے ہیں بوئے اُلفت کے
پھول یا رب ہیں کس کی تربت کے

شور ہے دل میں غم کے نالوں کا
علم اُٹھتے ہیں آج حسرت کے

تیری باتوں میں کیا حلاوت تھی
کہ نہ لب کھل سکے شکایت کے!

ہم پہ اور تیغ ناز اُٹھ نہ سکے
جو چلے ہیں تری نزاکت کے

اے بیانؔ! قیس و وامق و فرہاد
ہیں یہ سارے مُرید حضرت کے

○

ترا کُشتہ اُٹھایا اقربا نے
چلے محشر کو مٹی میں دبانے

نفس گُم اور سخن باقی رہے گا
نہ ہوگا تار اور ہوں گے ترانے

خدا ٹھنڈا رکھے اے شمع تجھ کو
کھڑی روتی ہے بیکس کے سرہانے

ترے چھننے سے سینے میں نہیں کے
اُٹھا اک درد محشر کے بہانے

ہمیں نے پنجۂ دستِ جنوں سے
کئے ہیں کوہ کی چوٹی میں شانے

حفیظ جونپوری

○

دل اس لئے ہے دوست کہ دل میں جائے دوست
جب یہ نہ ہو بغل میں، ہے دشمن بجائے دوست

مٹنے کی آرزو ہے اسی راہگذار میں
اتنے مٹے کہ لوگ کہیں خاک پائے دوست

تقریر کا ہے خاص ادائے بیاں میں لطف
سُنئے مری زبان سے کچھ ماجرائے دوست

سب کچھ ہے اور کچھ نہیں عالم کی کائنات
دنیا برائے دوست ہے عقبیٰ برائے دوست

○

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

نہیں مرتے ہیں تو ایذا نہیں جھیلی جاتی
اور مرتے ہیں تو پیماں شکنی ہوتی ہے

دن کو اک نور برستا ہے مری تُربت پر
رات کو چادر مہتاب تنی ہوتی ہے

لُٹ گیا وہ ترے کُوچے میں رکھا جس نے قدم
اس طرح کی بھی کہیں راہزنی ہوتی ہے

ہجر میں زہر ہے ساغر کا لگانا منہ سے
مے کی جو بُوند ہے ہیرے کی کنی ہوتی ہے

میکشوں کو نہ کبھی فکرِ کم و بیش ہوئی
ایسے لوگوں کی طبیعت بھی غنی ہوتی ہے

ہوک اٹھتی ہے اگر ضبط فغاں کرتا ہوں
سانس رُکتی ہے تو برچھی کی انی ہوتی ہے

پی لو دو گھونٹ کہ ساقی کی رہے بات حفیظ
صاف انکار میں خاطر شکنی ہوتی ہے

بیخود بدایونی

○

دردِ دل میں کمی نہ ہو جائے
دوستی ، دشمنی نہ ہو جائے

تم مری دوستی کا دم نہ بھرو
آسماں مدّعی نہ ہو جائے

بیٹھتا ہے ہمیشہ رندوں میں
کہیں زاہد ولی نہ ہو جائے

طالعِ بد وہاں بھی ساتھ نہ دے
موت بھی زندگی نہ ہو جائے

اپنی خوئے وفا سے ڈرتا ہوں
عاشقی بندگی نہ ہو جائے

کہیں بیخود تمہاری خودداری
دشمنِ بے خودی نہ ہو جائے

○

ساتھ ساتھ اہلِ تمنا کا وہ مضطر جانا
اللہ اللہ ترا بزم سے اُٹھ کر جانا

رہبری کر کے مری خضر بھی چکّر میں پڑے
اب اُنہیں جلوہ گہِ یار میں اکثر جانا

داغ کم حوصلگی دل کو گوارا نہ ہُوا
ورنہ کچھ ہجر میں دُشوار نہ تھا مر جانا

سادگی سے یہ گماں ہے کہ بس اب رحم کیا
مطمئن ہُوں کہ مجھے آپ نے مضطر جانا

نشہ میں بھی ترے بیخود کی تعلّی نہ گئی
بادۂ ہوش رُبا کو مئے کوثر جانا

برج نرائن چکبست

○

فنا کا ہوش آنا، زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

مقام کوُچ کیا ہے منزلِ مقصود تک بھوُلے
قیامت تھا سرائے دہر میں دو دن ٹھہر جانا

بہت سودا رہا واعظ تجھے نارِ جہنم کا
مزا سوزِ محبت کا بھی کچھ اے بے خبر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
مُبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

سدھاری منزلِ ہستی سے کس بے اعتنائی سے
تنِ خاکی کو شاید رُوح نے گردِ سفر جانا

○

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا — آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا
زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا
ہم کو منظور ہے اے دیدۂ وحدت آگیں — ایک غنچہ میں تماشائے گلستاں ہونا
جس طرح خم سے کسی جام کا ٹکرا کے چھلکے — یونہی گردوں سے مہِ نو کا نمایاں ہونا
سر میں سودا نہ رہا پاؤں میں زنجیر نہ رہی — میری تقدیر میں تھا بے سروساماں ہونا
صفحۂ دہر میں مہر یہ قدرت سمجھو — پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا
ہو بیاضِ سحرِ نوُر پہ دل کیا مائل — یاد ہے دفترِ انجم کا پریشاں ہونا
کل بھی وُہ کل جو ہے فردائے قیامت ظاہر — اور پھر اس کے لئے آج پریشاں ہونا
اڑنے غنچے کے مشتاق ہیں اے جوشِ جنوں — ہے مگر شرط ترا سلسلہ جنباں ہونا
گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک — ہے اسے طرۂ دستارِ غریباں ہونا

ہے مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھ کر
ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

علی حیدر نظمؔ طباطبائی

○

کسی سے بلکہ امیدِ کشودِ کار نہیں
مجھے اجل کے بھی آنے کا اعتبار نہیں

جواب نامہ کا، قاصد مزار پر لایا
کہ جانتا تھا اسے تابِ انتظار نہیں

یہ کہہ کے اُٹھ گئی بالیں سے میری شمعِ سحر
تمام ہو گئی شب اور تجھے قرار نہیں

جو تُو ہو پاس تو حُور و قصور سب کچھ ہو
جو تُو نہیں، تو نہیں، بلکہ زینہار نہیں

خزاں کے آنے سے پہلے ہی تھا مجھے معلوم
کہ رنگ و بوئے چمن کا کچھ اعتبار نہیں

غزل کہی ہے کہ موتی پروئے ہیں اے نظمؔ
وہ کون شعر ہے، جو دُرِ شاہوار نہیں

○

یہ آہ بے اثر کیا ہو، یہ نخلِ بے ثمر کیا ہو
نہ ہو جب درد ہی یارب! تو دل کیا ہو، جگر کیا ہو

بغل گیر آرزو سے ہیں مرادیں، آرزو مجھ سے
یہاں اس وقت تو اک عید ہے تم جلوہ گر کیا ہو

مقدر میں یہ لکھا ہے، کٹے گی عمر مر مر کر
ابھی سے مر گئے ہم، دیکھئے اب عمر بھر کیا ہو

مروّت سے ہو بیگانہ، وفا سے دُور ہو کوسوں
یہ سچ ہے، نازنیں ہو، خوبصورت ہو، مگر کیا ہو

لگا کر زخم میں ٹانکے قضا تیری نہ آجائے
جو وہ سفّاک سن پائے بتا اے چارہ گر! کیا ہو؟

قیامت کے بکھیڑے پڑ گئے آتے ہی دُنیا میں
یہ مانا ہم نے مر جانا تو ممکن ہے مگر کیا ہو

کہا میں نے کہ نظمِ مبتلا مرتا ہے حسرت میں
کہا اس نے اگر مر جائے تو میرا ضرر کیا ہو

وحید الدین سلیم

○

گریباں سے ترے کس نے نکالا صبحِ خنداں کو
کیا کس نے نہالِ امن کی کلیوں سے گلستاں کو

اُڑایا چٹکیوں میں میرے ذرّے نے بیاباں کو
مرے قطرے نے پانی کر دیا ہر موجِ طوفاں کو

مری کشتی بھنور سے کھیلنے کا شوق رکھتی ہے
یہ کس نے کر دیا خاموش یارب موجِ طوفاں کو

یہ کیا نغمہ تھا چھیڑا جو یکایک قلبِ مضطر نے
کہ میری نَے نے رقصاں کر دیا سارے گلستاں کو

میں وہ ہوں قطرۂ شبنم کہ چمکا تیرے پرتو سے
لگی ہیں کھینچنے کرنیں مری مہرِ درخشاں کو

مرے ذوقِ فنا پر زندگی ہے خضر کی قرباں
مرے تلخابۂ غم میں ڈبو دو آبِ حیواں کو

کلیمِ طورِ معنی ہوں یدِ بیضا ہے میرا دل
منوّر کر دیا جس نے مرے چاکِ گریباں کو

○

مدت ہوئی ہے مدحِ حسیناں کیے ہوئے
نورِ سخن سے دل کو چراغاں کیے ہوئے

عرصہ ہوا ہے وصفِ بہارِ جمال سے
روئے ورق کو رشکِ گلستاں کیے ہوئے

برسوں ہوئے ہیں تذکرۂ سوزِ عشق سے
بزمِ سخنوری کو درخشاں کیے ہوئے

آتا ہے کس شکوہ سے وہ رشکِ آفتاب
ظلمت کدے دلوں کے چراغاں کیے ہوئے

جاتا ہوں کوئے یار کو دیکھے اُسے گھٹا مجھے
برپا ہجومِ اشک سے طوفاں کیے ہوئے

بیٹھے ہیں ہم تصورِ گیسوئے یار میں
اس زندگی کو خوابِ پریشاں کیے ہوئے

خوں کر کے لے چلا ہوں دل و جاں کو اپنے ساتھ
دیدارِ روئے یار کا ساماں کیے ہوئے

مر مٹے اس ادا پہ کہ کچھ لوگ جل بجھے
سینے میں سوزِ عشق کو پنہاں کیے ہوئے

وہ نوبہارِ حسن ابھی اس راہ سے گیا
ہر نقشِ پا کو روضۂ رضواں کیے ہوئے

شوکت

سید کاظم علی شوکت بلگرامی

○

جب میں رویا ہوں وہ روئے ہیں بہ الفت میرے ساتھ
مدتوں برسا کیا ہے ، ابرِ رحمت میرے ساتھ

جان جائے ، یار ہے دل کو رہے گا پاسِ عشق
قبر میں جائیں گے تیرے رازِ الفت میرے ساتھ

دیتی ہے ترغیب نالے کی کہ ہو آزردہ دوست
دشمنی کرتی ہے اب میری محبت میرے ساتھ

میں تو ہوں دلدادۂ الفت کہو میں کیا کروں
دلربا ہو کر کرو تم جب یہ الفت میرے ساتھ

شکل تیری سامنے آنکھوں کے ہے آٹھوں پہر
یاد تیری ہے شریکِ رنج و راحت میرے ساتھ

بن گیا ہے تاب دل اک محشرستانِ خیال
خواب میں جب وہ ہوئے سرگرمِ الفت میرے ساتھ

یاد اب بھولے سے بھی صبحِ وطن آتی نہیں
ہو گئی مانوس ایسی شامِ غربت میرے ساتھ

دل میں دھڑکن ، لب پہ نالے ، چشمِ تر میں اشکِ خوں
کیا کہوں ، کیا کر گئی تیری محبت میرے ساتھ

یاد آتا ہے یہ رفتارِ قمر کو دیکھ کر
سیر کرتا تھا وہ یوں ہی ماہ طلعت میرے ساتھ

تو ہے اور تیری نظر میں اک قیامت کا غرور
میں ہوں اور اِک محشرِ ارمان و حسرت میرے ساتھ

وہ تو رخصت کر کے مجھ کو گھر میں جا بیٹھے مگر
یاد ان کی دور تک آئی تھی شوکت میرے ساتھ

○

لکھا ہے گو تری قسمت میں شوکت چشمِ تر رکھنا
مگر ظالم! کسی کی آبرو پر بھی نظر رکھنا

نہ بھولے گا نہ بھولے گا ، قیامت تک نہ بھولے گا
کسی کا وہ محبت سے مرے سینہ پہ سر رکھنا

نہ اُٹھے گا دلِ نازک سے صدمہ رنجِ فرقت کا
الٰہی میرے دردِ دل سے ان کو بے خبر رکھنا

وہ کیا جانے بھلا ہوتی ہیں کیسی عیش کی راتیں
میسر ہو نہ جس کو تا سحر تکیہ پہ سر رکھنا

دلِ بے آرزو کافی ہے ہم حسرت نصیبوں کو
مبارک ہو صدف کو اپنی مٹھی میں گہر رکھنا

نہ ہو کس طرح شرطِ دلبری دنیا میں دلداری
جہاں میں گھر بنانا سہل ہے مشکل ہے گھر رکھنا

محشر

مرزا کاظم حسین لکھنوی

مدتیں ہو گئی ہیں چپ رہتے
کوئی سنتا تو ہم بھی کچھ کہتے

جل گیا خشک ہو کے دامنِ دل
اشک آنکھوں سے اور کیا بہتے

بات کی اور منہ کو آیا جگر
اس سے بہتر یہی تھا چپ رہتے

ہم کو جلدی نے موت کی مارا
اور جیتے، تو اور غم سہتے

سب ہی سنتے تمہاری اے محشر
کوئی کہنے کی بات اگر کہتے

دیر تک اٹھ نہ سکا واں سے وہ دیوانۂ دوست
چھڑ گیا جب کہ کہیں بیٹھ کے افسانۂ دوست

آج اٹھے جاتے ہیں درباں کی جفا سے لیکن
زندگی بھر کہیں چھٹتا ہے درِ خانۂ دوست

ہجر میں حالتِ دل کی ہیں وہ آنکھیں نگراں
دیکھی تھی جن سے کبھی رونقِ کاشانۂ دوست

راہبر شوقِ دلی، سر پہ اجل، دل بے تاب
بے خبر یوں میں چلا ہوں طرفِ خانۂ دوست

آج کیوں حد سے سوا دل کو خوشی ہے محشر
کیا بلائے ہوئے جاتے ہو سوئے خانۂ دوست

مضطر خیر آبادی

دمِ خواب راحت بُلایا انھوں نے تو دردِ نہاں کی کہانی کہوں گا
مرا حال لکھنے کے قابل نہیں ہے اگر مِل گئے تو زبانی کہوں گا

لبِ جوئے الفت رمائی ہے دھونی، یہاں قصۂ سخت جانی کہوں گا
ادھر آ ادھر رُوحِ شیریں ادھر آ، ترے کوہکن کی کہانی کہوں گا

خضر! تیرے چشمہ کا پانی ہے اچھا، مگر میں اسے موجِ فانی کہوں گا
محبت کا مارا ہوا دل جلا دے، میں تب تیرے پانی کو پانی کہوں گا

تری ذاتِ واحد ہے بیدارِ مطلق، تجھے تو کبھی نیند آتی نہیں ہے
تری آنکھ لگنے کی حسرت میں یارب! کہاں تک میں قصے کہانی کہوں گا

وہ اک آئنہ جس میں منہ دیکھتے ہیں کسی ایک کا وقفِ صورت نہیں ہے
یہیں سے یہ پردہ اٹھا کر دوئی کا، میں وحدت کو کثرت کا بانی کہوں گا

یہ ہستی کا شیشہ جو تو نے دیا ہے ذرا اس پہ چاہت کی صیقل تو کر لوں
یہ ہو جائے پھر اپنی ہستی کو میں بھی، تری ذات کا نقشِ ثانی کہوں گا

ازل ہی میں تجھ پر نظر پڑ چکی ہے، نہ کر مجھ سے انکارِ جلوہ نمائی!
تجلی تری کو نئی روشنی ہے، مگر میں تو اس کو پرانی کہوں گا

محبت میں انکارِ جلوہ نمائی ذرا اس طریقے کو تو یاد رکھنا!
اگر میں کبھی تیرے منصب پہ پہنچا، تو میں بھی یونہی لن ترانی کہوں گا

[illegible] وفا ہوں جو محشر میں مضطر خدا سے کروں شکوۂ قتل اپنا!
[illegible] خون ناحق بہایا، اگر مجھ سے پوچھا تو بانی کہوں گا!

غرورِ الفت کی طرزِ نازش عجب کرشمے دکھا رہی ہے
ہماری رُوٹھی ہوئی نظر کو تری تجلی منا رہی ہے

وہ طُور والی تری تجلی، غضب کی گرمی دکھا رہی ہے
وہاں تو پتھر جلا دئے تھے یہاں کلیجہ جلا رہی ہے

مرے نشیمن میں شانِ قدرت کے سارے اسباب ہیں مہیا
ہوا صفائی پہ ہے مقرر، چراغ بجلی جلا رہی ہے

نہ لگے دامن سے میں ہی اُلجھا، نہ میرے دامن سے یہ ہی اُلجھی
ہوا سے میرا بگاڑ کیا ہے جو شمعِ تربت بجھا رہی ہے

فرشتے آئے اگر لحد میں، تو صاف کہہ دُوں گا راستہ لو!
جب اُن کی چاہت میں جان دے دی تو بات کہنے کو کیا رہی ہے

جمالِ قدرت مجھی کو دے دے کہ میں کلیجے کی چوٹ سینکوں
کلیم کے گھر میں رکھے رکھے وہ آگ اب کیا بنا رہی ہے

شبلی نعمانی

تیس دن کیلئے ترکِ مے و ساقی کر لوں
واعظِ سادہ کو روزوں میں تو راضی کر لوں

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد! تری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں

اے نکیرین! قیامت ہی پہ رکھو پرسش
میں ذرا عمرِ گذشتہ کی تلافی کر لوں

کچھ تو ہو چارۂ غم، بات تو یکسو ہو جائے
تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں

اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل
غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کر لوں

دل ہی ملتا نہیں سفلی سے، وگرنہ شبلی
خوب گذرے فلکِ دوں سے جو یاری کر لوں

یار کو رغبتِ اغیار نہ ہونے پائے
گلِ تر کو ہوسِ خار نہ ہونے پائے

اس میں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ
شکوۂ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے

فتنۂ حشر جو آنا، تو دبے پاؤں ذرا
بختِ خفتہ مرا بیدار نہ ہونے پائے

ہائے دل کھول کے کچھ کہہ نہ سکے سوزِ دروں
آبلے ہم سخنِ خار نہ ہونے پائے

باغ کی سیر کو جاتے تو ہو، پر یاد رہے
سبزہ بیگانہ ہے، دوچار نہ ہونے پائے

جمع کر لیجئے غمزوں کو مگر خوبیٔ بزم
بس وہیں تک ہے کہ بازار نہ ہونے پائے

آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی
حالِ دل دیکھئے اظہار نہ ہونے پائے!

حسنؔ بریلوی

○

حُسن جب مقتل کی جانب تیغِ بُرّاں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا

خونِ ناحق کی حیا بولی: ذرا منہ ڈھانک لو
ناز جب ان کو سرِ خاکِ شہیداں لے چلا

خاکِ عاشق روکنے کو دُور تک لپٹی گئی
جب سمندِ ناز کو وہ گرمِ جولاں لے چلا

جب چلی مقتل سے قاتل کی سواری رات کو
آگے آگے مشعلیں خونِ شہیداں لے چلا

آرزوئے دیدِ جاناں بزم میں لائی مجھے
بزم سے مَیں آرزوئے دیدِ جاناں لے چلا

ڈھونڈتی تھی ہر طرف کس کو نگاہِ واپسیں
اُس کسی کے دیدہ کی بیارِ ہجراں لے چلا

نازِ آزادی حسنؔ وجہِ اسیری ہو گیا!
موکشاں دل کو خیالِ زلفِ پیچاں لے چلا

○

جلوے ترے جو رونقِ بازار ہو گئے
خوبانِ خود فروش خریدار ہو گئے

تلووں سے راستہ چمن دلکشا بنا!
جلووں سے آئینہ در و دیوار ہو گئے

دل جاں بلب، جگر میں تپک، جان بیقرار
ہم تیرا نام لے کے گنہگار ہو گئے!

گلزار ہے بہار یُونہی حُسنِ یار سے
جیسے چمن، بہار سے گُلزار ہو گئے

یہ حُسنِ خود فروش عجب جنس ہے حسنؔ
وہ بِک گئے جو اس کے خریدار ہو گئے

نسیمؔ

شبّر حسین بھرتپوری

○

غیر کے گھر ہیں وہ مہمان بڑی مشکل ہے
جان جانے کے ہیں سامان بڑی مشکل ہے

کہتے ہیں آپ ہیں جس بات کے طالب ہم سے
ہے وہی غیر کو ارمان بڑی مشکل ہے

اُس نے لی جان ہزاروں کو یہ دم دے دیکر
مجھ پہ مرنا نہیں آسان، بڑی مشکل ہے

روز کہتے ہو کہ تو کس کے لئے ہے بیتاب
جان کر بنتے ہو انجان، بڑی مشکل ہے

دوستی سہل نہیں اس بُتِ بدخُو سے نسیمؔ
ضد نہ کر، دیکھ مری جان، بڑی مشکل ہے

○

اُن کے پیکان پہ پیکان چلے آتے ہیں
دل میں گھر کرنے کو مہمان چلے آتے ہیں

دیکھ کر آئے ہیں کیا عارض و گیسو اُن کے
لوگ حیران پریشان چلے آتے ہیں

چار انگل کا وہ پرچہ نہیں لکھتے مجھ کو
پاس اغیار کے فرمان چلے آتے ہیں

بزمِ اغیار میں کس شخص نے گستاخی کی
کہ وہ نا خوش پشیمان چلے آتے ہیں!

بیخود دہلوی

○

شمع مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا
تم جس پہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا

تڑپوں گا عمر بھر دلِ مرحوم کیلئے
کم بخت نامراد لڑکپن کا یار تھا

سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور شئے
مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا

جادو ہے یا طلسم تمہاری زبان میں
تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا

کیا کیا ہمارے سجدہ کی رسوائیاں ہوئیں
نقشِ قدم کسی کا سرِ رہگذار تھا

اس وقت تک تو وضع میں آیا نہیں ہے فرق
تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

○

وہ سن کر حور کی تعریف پردے سے نکل آئے
کہا پھر مسکرا کر حسنِ زیبا اس کو کہتے ہیں

اجل کا نام دشمن دوسرے معنی میں لیتا ہے
تمہارے چاہنے والے تمنا اس کو کہتے ہیں

مرے مدفن پہ کیوں روتے ہو عاشق مر نہیں سکتا
یہ مرجانا نہیں ہے صبر آنا اس کو کہتے ہیں

نمک بھر کر مرے زخموں میں تم کیا مسکراتے ہو
مرے زخموں کو دیکھو مسکرانا اس کو کہتے ہیں

زمانے سے عداوت کا سبب تھی دوستی جن کی
اب ان کو دشمنی ہے ہم سے دنیا اسکو کہتے ہیں

دکھاتے ہم نہ آئینہ تو یہ کیونکر نظر آتا
بشر حوروں سے اچھا تم نے دیکھا اسکو کہتے ہیں

پنڈت امرناتھ ساحرؔ

○

جلا ہے کس قدر دلِ ذوقِ کاوش ہائے مژگاں پر
کہ سو سو نشتروں کی نوک ہے، ایک اک رگِ جاں پر

پڑا ہوگا مگر عکسِ عذارِ لالہ گوں، ورنہ
یہ گستاخی! ہمارا خون اور قاتل کے داماں پر

طریقِ عشق میں ہے رنج پہلے اور خوشی پیچھے
مدارِ صبحِ روزِ وصل ہے اک شامِ ہجراں پر

مری دیوانگی روزِ قیامت میرے کام آئی
قلم رحمت کا کھینچا اُس نے آخر میرے عصیاں پر

اگر اُن کے تغافل کو ہے دعویٰ اپنی تمکیں کا
ہماری خود فراموشی کو ہے ناز اپنے نسیاں پر

○

رُسوائے عشق ہے ترا شیدا کہیں جسے
عشاق میں مثال ہے رُسوا کہیں جسے

سینہ چمن ہے، غنچۂ دل ہے شگفتہ دل
تیری نگاہ ہے چمن آرا کہیں جسے

غم پُر دریغ ہے دلِ شوریدگانِ عشق!
فرقت کی ایک رات ہے دُنیا کہیں جسے

منسُوب کفر دَیر سے، ایماں حرم سے ہے
اک رہ گیا ہوں مَیں کہ تمہارا کہیں جسے

ہم غیر معتبر سہی اور غیر معتبر
کہنا بجا ہے آپ کا، جیسا کہیں جسے

ساحرؔ نفس وُہ دام ہے، جس میں گرہ ہے ایک
موجِ رمِ خیال کہ عنقا کہیں جسے

سائل دہلوی

○

سنا بھی کبھی ماجرا درد و غم کا کسی دل جلے کی زبانی، کہو تو
نکل آئیں آنسو کلیجہ پکڑ لو، کروں عرض اپنی کہانی، کہو تو

تمہیں رنگِ مے شیخ مرغوب کیا ہے گلابی ہو یا زعفرانی، کہو تو
پلائے کوئی ساقیِ حور پیکر، مصفا، کشیدہ، پرانی، کہو تو

تمنائے دیدار ہے حسرتِ دل کہ تم جلوہ فرما ہو میں آنکھیں سینکوں
نہ کہہ دینا موسیٰ سے جیسے کہا تھا، مری عرض پر لن ترانی، کہو تو

وفا پیشہ عاشق نہیں دیکھا تم نے، مجھے دیکھ لو، جانچ لو، آزما لو
تمہارے اشارے پہ قربان کردوں ابھی مایۂ زندگانی، کہو تو

کہاں میں کہاں داستاں کا تقاضا مرے ضبطِ دردِ نہاں کا ہے کہنا
پھر اس پر یہ تاکید بھی ہے برابر، نہ کہنا پرائی کہانی، کہو تو

مرے نامۂ شوق کی سطر میں ہے جگہ اک جو سادہ وہ مہمل نہیں ہے
میں سمجھاؤں خدمت میں حاضر ابھی خود بتانے کو اس کے معانی کہو تو

○

ملے غیروں سے مجھ سے رنج، غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وفا دشمن جفا جو کا ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی

شبِ وعدہ وہ آجائیں، نہ آئیں، مجھ کو بلوالیں
عنایت یوں بھی اور یوں بھی، کرم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے لکھا تھا، ہم بہرِ عیادت آنے والے ہیں
عدو ہمرہ ہے اب مجھے کہ ہم یوں بھی ہے اور یوں بھی

نہ خود آئیں، نہ بلوائیں، شکایت کیوں نہ لکھ بھیجوں
عنایت کی نظر مجھ پر تو کم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تم آؤ مرگِ شادی ہے، نہ آؤ مرگِ ناکامی
نظر میں اب رہِ ملکِ عدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مرے سر پہ بھی ٹوٹا ہے تمہارے پاؤں بھی چومے
غرض پیرِ فلک کی پشت خم یوں بھی ہے اور یوں بھی

مجھے باور ہے تم جھوٹے نہیں وعدے کے سچے ہو
قسم کیوں کھاؤ، ناجائز قسم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ مسجد ہے، یہ مے خانہ، تعجب اس پہ آتا ہے
جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

یہ تیری سادگی آرائشِ زیور سے بڑھ کر ہے
خدا کے فضل سے تو تو رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

تجھے نواب بھی کہتے ہیں، شاعر بھی سمجھتے ہیں
زمانے میں ترا سائل بھرم یوں بھی ہے اور یوں بھی!

آغا شاعر

○

چلے گا نہیں مجھ پہ فقرا تمہارا
ہٹالو! کہ خنجر ہے جھوٹا تمہارا

مناؤ گے تو اب جان دے کر مناؤ گے
قیامت ہے یہ رُوٹھ جانا تمہارا

بڑے سیدھے سادے بڑے بھولے بھالے
کوئی دیکھے اس وقت چہرہ تمہارا

بجا ہے جو ساغر میں کیوں پھینکتے ہو
ہمیں دے دو ہم پی لیں جھوٹا تمہارا

یہ کیا ہے سبب آج چپ چپ ہو پیارے
بتاؤ تو کیوں جی ہے کیسا تمہارا؟

اُٹھانے پڑے خاک سے دل کے ٹکڑے
بڑا پیار تھا، پیار دیکھا تمہارا

خدا کے لئے ہاں، نہیں کچھ تو کہہ دو
کہ مُنہ تک رہی ہے تمنّا تمہارا!

علاج اس کے بیمار کا تم کرو گے؟
کہیں دل چلا ہے مسیحا، تمہارا

ہم چلا شاعرِ زار تسلیم لیجے!
بھلا ہو بھلا میرے داتا تمہارا

○

یہ کیسے بال کھولے آئے، کیوں صورت بنی غم کی
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

شکایت کس سے کیجے، ہائے! کیا اُلٹا زمانہ ہے
بڑھایا پیار جب ہم نے، محبت یار نے کم کی

جگر میں درد ہے، دل مضطرب ہے، جان بے کل ہے
مجھے اس بیخودی میں بھی خبر ہے اپنے عالم کی

نہیں ملتے نہ ملئے۔ خیر! کوئی مر نہ جائے گا
خدا کا شکر ہے! پہلے محبت آپ نے کم کی

عدو جس طرح تم کو دیکھتا ہے ہم سمجھتے ہیں
چھپاؤ لاکھ تم چھپتی نہیں ہے آنکھ محرم کی

مزہ اس میں ہی ملتا ہے، نمک چھڑکو، نمک چھڑکو
قسم لے لو نہیں عادت مرے زخموں کو مرہم کی

کہاں جانا ہے؟ تھم تھم کر چلو، ایسی بھی کیا جلدی
تم ہی تم ہو، خدا رکھے، نظر پڑتی ہے عالم کی

کوئی ایسا ہو آئینہ کہ جس میں تُو نظر آئے
زمانے بھر کا جھوٹا کیا حقیقت ساغرِ جم کی

گھٹائیں دیکھ کر بے تاب ہے بے چین ہے شاعر
ترے قربان، او مطرب! سُنا دے کوئی سرگم کی

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

○

حُسن، عشق میں ہے یا عشق، حسن میں مُضمر
جوہر آئنہ میں یا آئنہ ہے جوہر میں

عشق محشر آرا کی طُور پر گری بجلی
حُسن لن ترانی کی رہ سکا نہ چادر میں

فرطِ سوزِ الفت میں دیکھ کر سکوں دل کا
بجلیاں مچلتی ہیں بادلوں کے محشر میں

چارہ گر کو حیرت ہے ارتقائے وحشت سے
پاؤں میں جو چکر تھا آرہا ہے وُہ سر میں

ہوں وہ رند یا صوفی، مست اپنی دھن میں ہیں
جانے کتنے مے خانے بھر دئے ہیں کوثر میں

○

عشق ہی عشق ہو، عاشق ہو نہ معشوق جہاں
ایسی اک درگہ توحید مآب اَور بھی ہے

ہوش سے کاٹ یہ دن، زندہ دلی سے رکھ کام
شیب کے بعد مری جان شباب اَور بھی ہے

یار مے خانے اگر کر گئے خالی، غم کیا؟
اب بھی ابر آتا ہے اور خُم میں شراب اَور بھی ہے

گھر کیا غالب و مومن نے جہاں آنکھوں میں
اسی بستی میں کوئی خانہ خراب اَور بھی ہے

محمد علی جوہر

○

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفّی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بیٹھا ہُوا توبہ کی تو خیر منایا کر
ٹلتی نہیں یُوں جوہر اس دیس کی برساتیں

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدّعا کے بعد

تجھ سے مقابلے کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

لذّت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

دِل شاہجہانپوری

○

پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا
جو دل تری نظر سے گرا دِل نہیں رہا

نشتر چبھوئے اب نہ پشیمانیٔ نگاہ
مجھ کو تو شکوۂ خلشِ دل نہیں رہا

موجیں اُبھار کر مجھے جس سمت لے چلیں
حدِّ نگاہ تک کہیں ساحل نہیں رہا

کیا کہئے اب مآلِ محبت کی سرگذشت
یاد اس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

○

کوچہ گردی میں جوانی جائے گی
خاک ہو کر زندگانی جائے گی

مٹ نہیں سکتا ہمارے دِل کا داغ
قبر میں بھی یہ نشانی جائے گی

سچ ہے میری بات کا کیا اعتبار
سچ کہوں گا، جھوٹ جانی جائے گی

حضرتِ دِل جب بڑھاپا آئے گا
خیر مقدم کو جوانی جائے گی

شاہ بیدمؔ وارثی

○

اپنی ہستی کا اگر حُسن نمایاں ہو جائے
آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے

تم جو چاہو، تو مرے درد کا درماں ہو جائے
ورنہ مشکل ہے کہ مشکل مری آساں ہو جائے

او نمک پاش تجھے اپنی ملاحت کی قسم!
بات تو جب ہے کہ ہر زخم نمکداں ہو جائے

دینے والے مجھے دینا ہے تو اتنا دے دے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیٔ داماں ہو جائے

اس سیہ بخت کی راتیں بھی کوئی راتیں ہیں
خوابِ راحت بھی جسے خوابِ پریشاں ہو جائے

سینۂ شبلی و منصور تو پھونکا تُو نے
اس طرف بھی کرم اے جنبشِ داماں ہو جائے

آخری سانس بنے زمزمۂ ہُو اپنا
سازِ مضرابِ فنا تارِ رگِ جاں ہو جائے

تو جو اسرارِ حقیقت کہیں ظاہر کر دے
ابھی بیدمؔ رسن و دار کا ساماں ہو جائے

○

مجھے شکوہ نہیں ، برباد رکھ ! برباد رہنے دے
مگر للہ میرے دل میں اپنی یاد رہنے دے

مرے ناشاد رہنے سے اگر تجھ کو مسرت ہے
تو مَیں ناشاد ہی اچھا، مجھے ناشاد رہنے دے

تری شانِ تغافل پر مری بربادیاں صدقے
جو برباد تمنا ہو، اُسے برباد رہنے دے

نہ صحرا میں بہلتا ہے نہ کوئے یار میں ٹھہرے
کہیں تو چین سے مجھ کو دلِ ناشاد رہنے دے

کچھ اپنی گذری ہی بیدمؔ بھلی معلوم ہوتی ہے
مری بیتی سنا دے قصۂ فرہاد رہنے دے!

آغا حشر

○

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں میں
بھولنے والے! کبھی تجھ کو بھی یاد آتا ہوں میں

ایک دھندلا سا تصور ہے کہ دل بھی تھا یہاں
اب تو سینے میں فقط اک ٹیس سی پاتا ہوں میں

او وفا نا آشنا کب تک سنوں تیرا گلہ
بے وفا کہتے ہیں تجھ کو اور شرماتا ہوں میں

آرزوؤں کا شباب، اور مرگِ حسرت ہائے ہائے
جب بہار آئے گلستاں میں تو مرجھاتا ہوں میں

حشر میری شعر گوئی ہے فقط فریادِ شوق!
اپنا غم دل کی زباں میں دل کو سمجھاتا ہوں میں

○

چوری کہیں کھلے نہ نسیمِ بہار کی
خوشبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی

اللہ رکھے اس کا سلامت غرورِ حسن
آنکھوں کو جس نے دی ہے سزا انتظار کی

گلشن میں دیکھ کر مرے مستِ شباب کو
شرمائی جا رہی ہے جوانی بہار کی

اے میرے دل کے چین مرے دل کی روشنی
آ، اور صبح کر دے شبِ انتظار کی

اے حشر دیکھنا تو، یہ ہے چودھویں کا چاند
یا آسماں کے ہاتھ میں تصویر یار کی؟

وحشتؔ کلکتوی

○

ہوئے ہیں گم جس کی جستجو میں اسی کی ہم جستجو کریں گے
رکھا ہے محروم جس نے ہم کو اسی کی ہم آرزو کریں گے

گئے وہ دن جبکہ اس چمن میں ہوائے نشو و نما تھی ہم کو
خزاں کو دیکھا نہیں ہے ہم نے کہ خواہشِ رنگ و بو کریں گے

حکایتِ آرزوئے نازک زباں کیا خاک کہہ سکے گی
لبِ خموش و نگاہِ حسرت سے دل کی ہم گفتگو کریں گے

جگہ جو آنکھوں میں میں نے دی تھی تو ان سے تھی چشمِ رازداری
یہ کیا خبر تھی کہ اشک میرے مجھی کو بے آبرو کریں گے

ابھی تو گم کردہ راہ خود ہیں مئے محبت کی بیخودی میں
اگر کبھی آپ میں ہم آئے تو اسکی بھی جستجو کریں گے

اس انجمن میں کرشمۂ ساقی کفیل ہو عیشِ زندگی کی
وہ بادہ خواری میں خام ہوں گے جو فکرِ جام و سبو کریں گے

طہارتِ ظاہری سے حاصل نہ ہو سکے گی صفائے باطن
بہا کے ہم خونِ توبہ وحشتؔ اسی سے اکثر وضو کریں گے

○

درد کا میرے یقیں آپ کریں یا نہ کریں
غرض اتنی ہے کہ اس راز کا چرچا نہ کریں

لاکھ غافل سہی پر ایسے بھی ہم کور نہیں
کہ چمن دیکھ کے ذکرِ چمن آرا نہ کریں

عقل و دانش سے تو کچھ کام نہ نکلا اپنا
کب تک آخر دلِ دیوانہ کا کہنا نہ کریں

وہ نگاہیں عجب انداز سے ہیں عشوہ فروش
غمِ پنہاں کو ہمارے کہیں رسوا نہ کریں

تیرے آشفتہ سر ایسے بھی نہیں سودائی
کہ دل و دیں کیلئے زلف کا سودا نہ کریں

مَیں نے بے ہودہ توقع کی سزا پائی ہے
کچھ خیال آپ مری حسرتِ دل کا نہ کریں

میرے ارمانوں کو کاش اتنی سمجھ ہو وحشتؔ
کہ اُن آنکھوں سے مروّت کا تقاضا نہ کریں

آسی الدنی

○

قید سے پہلے بھی آزادی مری خطرہ میں تھی
آشیانہ ہی مرا صورت نمائے دام تھا

واہمہ خلاق اور آزادی کا حسن افزا سرور
ہر فریبِ رنگ کا پہلے گلستاں نام تھا

ضعف آہوں پر بھی غالب ہو چلا تھا اے اجل!
تو نہ آتی تو یہ میرا آخری پیغام تھا

دیدۂ خوں نابہ افشاں میرا اُن کے سامنے
بے خودی کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا اک جام تھا

○

ہزاروں طرح اپنا درد ہم اُس کو سناتے ہیں
مگر تصویر کو ہر حال میں تصویر پاتے ہیں

بجھا دے اے ہوائے تند! مدفن کے چراغوں کو
سیہ بختی میں یہ اک بدنما دھبہ لگاتے ہیں

مرتب کر گیا اک عشق کا قانون دنیا میں
وہ دیوانے ہیں جو مجنوں کو دیوانہ بتاتے ہیں

اسی محفل سے میں روتا ہوا آیا ہوں اے آسی
اشارے میں جہاں لاکھوں مقدر بنتے جلتے ہیں

تاجور نجیب آبادی

○

حسنِ شوخ چشم میں نام کو وفا نہیں
درد آفریں نظر درد آشنا نہیں

ننگِ عاشقی ہے وہ ننگِ زندگی ہے وہ
جس کے دل کا آئنہ تیرا آئنا نہیں

آہ اس کی بیکسی تو نہ جس کے ساتھ ہو
ہائے اس کی بندگی جس کا تو خدا نہیں

حیف وہ الم نصیب جس کا درد تو نہ ہو
اُف وہ دردِ زندگی جس کی تو دوا نہیں

دوست یا عزیز ہیں خود فریبیوں کے نام
آج آپ کے سوا کوئی آپ کا نہیں

جانتا ہوں میں کہ تو اہلِ دل کے ساتھ ہے
دل پہ جو خدا کی مار دل بھی مانتا نہیں

اپنے حسن کو ذرا تو مری نظر سے دیکھ
دوست شش جہات میں کچھ ترے سوا نہیں

بے وفا خدا سے ڈر طعنۂ وفا نہ دے
تاجور میں اور عیب کچھ ہوں بے وفا نہیں

○

محبت میں زیاں کاری مرادِ دل نہ بن جائے
یہ لاحاصل ہی عمرِ عشق کا حاصل نہ بن جائے

مجھی پر پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظر اُن کی
یہ دلداری حسابِ دوستانِ "دل" نہ بن جائے

کروں گا عمر بھر طے راہِ بے منزل محبت کی
اگر وہ آستاں اس راہ کی منزل نہ بن جائے

یہ متوالی نظر، یہ بادۂ بے جام ارے توبہ
کسی پہ بے بنی اے ساقیِ محفل نہ بن جائے

ترے انوار سے ہے نبضِ ہستی میں تڑپ پیدا
کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے

کہیں رسوا نہ ہو اب شانِ استغنا محبت کی
مری حالت تمہارے رحم کے قابل نہ بن جائے

صفی لکھنوی

جانا جانا جلدی کیا ہے، ان باتوں کو جانے دو
ٹھہرو ٹھہرو، دل تو ٹھہرے مجھ کو ہوش میں آنے دو

پاؤں نکالو خلوت سے، آئے جو قیامت آنے دو
سارے سر آپس میں ٹکرائیں اگر، ٹکرانے دو

مہرِ منوّر جامِ طلائی، ماہ کٹورا چاندی کا
چرخ کے خمخانے میں یہی ہیں، گردش میں چھلکانے دو

دورِ بہارِ حُسن تو ہو، پھر جوشِ جنوں کا قحط نہیں
کُوکے گی باغوں میں کوئل، بُور آموں میں آنے دو

بادل گرجا، بجلی چمکی، روئی شبنم، پھُول ہنسے
مرغِ سحر کو ہجر کی شب کے افسانے دُہرانے دو

ہاتھ میں ہے آئینہ و شانہ پھر بھی شکن پیشانی پہ
موجِ صبا سے تم تو نہ بگڑو زلفوں کو بل کھانے دو

کثرت سے جب نام و نشاں ہے کیا ہونگے گمنام صفیؔ
نقش دلوں پر نام ہے اپنا، نقشِ لحد مٹ جانے دو

وہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شبِ فرقت کے غم جھیلے ہوؤں کا دم نکلتا ہے

الٰہی خیر ہو اُلجھن پہ اُلجھن بڑھتی جاتی ہے
نہ میرا دم نہ اُن کے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے

قیامت ہی نہ ہو جائے، جو پردے سے نکل آؤ
تمہارے منہ چھپانے میں تو یہ عالم نکلتا ہے

شکستِ رنگِ رُخ آئینۂ بےتابیٔ دل ہے
ذرا دیکھو تو کیونکر غم زدوں کا دم نکلتا ہے

نگاہِ التفاتِ مہر اور اندازِ دل جوئی
مگر اک پہلوئے بےتابیٔ شبنم نکلتا ہے

صفیؔ کشتہ ہوں ناپرسانیوں کا اہلِ عالم کی
یہ دیکھوں کون میرا صاحبِ ماتم نکلتا ہے

ثاقبؔ لکھنوی

○

کہاں تک جفا حُسن والوں کی سہتے
جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے

وفا بھی نہ ہوتا تو اچھا تھا واعظ
گھڑی دو گھڑی تو کبھی شاد رہتے

نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی
ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے

بتاتے ہیں آنسو کہ اب دِل نہیں ہے
جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا
زمانہ ہوا مجھ کو چُپ رہتے رہتے

مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقبؔ
کنارے پہ آ ہی لگی بہتے بہتے

○

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دُعا دینے لگے

کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو
زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے

جُز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ
جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

آئنہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حُسن کا
کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

سینۂ سوزاں میں ثاقبؔ گھٹ رہا ہے وہ دُھواں
اُف کروں تو آگ دنیا کی ہوا دینے لگے

حکیم سعید احمد ناطقؔ لکھنوی

○

کبھی دامانِ دل پہ داغِ مایوسی نہیں آیا
اِدھر وعدہ کیا اُس نے، اُدھر دل کو یقیں آیا

محبت آشنا دل مذہب و ملّت کو کیا جانے
ہوئی روشن جہاں بھی شمع پروانہ وہیں آیا

دو عالم سے گزر کے بھی دلِ عاشق ہے آوارہ
ابھی تک یہ مسافر اپنی منزل پر نہیں آیا

مری جانب سے اُنکے دل میں کس شکوے پہ کینہ ہے
وہ شکوہ جو زباں پر کیا ابھی دل میں نہیں آیا

حیاتِ بیخودی کچھ ایسی نامحسوس تھی ناطقؔ
اجل آئی تو مجھ کو اپنی ہستی کا یقیں آیا

○

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے
مَیں سراپا دل ہُوں، دل میرا سراپا درد ہے

یہ سمجھ لیں پہلے آپ اے حضرتِ عیسیٰ! ذرا
کس کے دل میں درد ہے یہ اور کس کا درد ہے

جو چلا دنیا سے، وُہ رکھے ہوئے سینے پہ ہاتھ
میں سمجھتا ہوں کہ سب کے دل میں تیرا درد ہے

میرے چپ رہنے سے تو غافل ہے او ظاہر پرست
ظرف بھی اُتنا ہی میں رکھتا ہُوں جتنا درد ہے

ہر تڑپ پر قالبِ مُردہ میں آجاتی ہے رُوح
مجھ مریضِ ناتواں کی جان گویا درد ہے

بچ گئے تو انتہائے عشق میں لُطف آئے گا
اور ابھی تو ابتدا میں انتہا کا درد ہے

اپنا اپنا حال کہہ لینے دو ناطقؔ سب کو تم
جانتا ہے وُہ کہ کس کے دل میں کتنا درد ہے

ناطقؔ گلاؤٹھوی

○

ڈھونڈتی ہے اضطرابِ شوق کی دنیا مجھے
آپ نے محفل سے اُٹھوا کر کہاں رکھا مجھے

اے نگاہِ مست! اس کا نام ہے کیف سرور
آج تو نے دیکھ کر میری طرف دیکھا مجھے!

یار سے ہو کر جُدا، جورِ فلک کا غم نہیں
ہو چکی وُہ بات تھی جس بات کی پروا مجھے

ساتھ بھی چھوڑا تو کب جب سب بُرے دن کٹ گئے
زندگی تو نے کہاں آکر دیا دھوکا مجھے؟

○

کیا ارادے ہیں وحشتِ دِل کے
کس سے ملنا ہے خاک میں مل کے

اے دلِ شکوہ سنج! کیا گزری
کس لئے ہونٹ رہ گئے ہل کے؟

مٹتے جاتے ہیں راہِ عمر میں دوست
مل رہے ہیں نشان منزل کے

چھوڑ ناطقؔ فضائے بزمِ شکست
اُٹھ کے ٹکڑے سنبھال لے دِل کے

عزیزؔ لکھنوی

○

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

اُف مرے اُجڑے ہوئے گھر کی تباہی دیکھو
جس کے ہر ذرّہ پہ چھایا ہے بیاباں ہونا

حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گذرے ہیں
میرا مرنا، تیری زلفوں کا پریشاں ہونا

کچھ نہ پوچھو شبِ وعدہ مرے گھر کی رونق
اللہ اللہ وہ ساماں سے ساماں ہونا

جوش میں لے کے اک انگڑائی کسی کا کہنا
تم کو آتا ہی نہیں چاک گریباں ہونا

سُرخ ڈورے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ!
چاہیے تھا انہیں پیوستِ رگِ جاں ہونا

ہو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور
قہر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ہونا

میں کروں ضبط ادھر ان کو پسینہ آ جائے
چاہیے یوں غمِ پنہاں کو نمایاں ہونا

اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے شعلۂ طور
کس طرح تونے چھپایا ہے نمایاں ہونا

ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیزؔ
خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا

○

یہ مشورہ ہم اُٹھے ہیں چارہ جُو کرتے
اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رُو کرتے

زباں رُک گئی آخر سحر کے ہوتے ہی!
تمام رات کٹی دل سے گفتگو کرتے

کفن کو باندھے ہوئے سر سے آئے ہیں، ورنہ
ہم اور آپ سے اس طرح گفتگو کرتے

سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھیے منظر!
سُنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے!

اگر کہیں وہ دمِ واپسیں چلے آتے
ہم ایک سانس میں تفصیلِ آرزو کرتے

تمام رُوح کی لذت اسی پہ تھی موقوف
کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے

جواب حضرتِ ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے
جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے

پہنچ کے حشر کے میداں میں ہول کیوں ہے عزیزؔ
ابھی تو پہلی ہی منزل ہے جستجو کرتے!

جلیلؔ مانک پوری

○

رکھ کے دل میرا تمہیں ناحق پشیمانی ہوئی!
تم سے نادانی ہوئی یا مجھ سے نادانی ہوئی؟

اللہ اللہ پھوٹ نکلا رنگ چاہت کا مری
زہر کھایا میں نے پوشاک آپ کی دھانی ہوئی

ہم کو ہو سکتا نہیں دھوکا ہجومِ حشر میں
تیری صورت ہے ازل سے جانی پہچانی ہوئی

اے صبا! میں اور کیا دوں قبرِ مجنوں کیلئے
خاک تھوڑی سی چڑھا دینا مری چھانی ہوئی

یار کے ہاتھوں ہوا جو کچھ ہوا اے تیغِ ناز!
تیری عریانی ہوئی یا میری قربانی ہوئی!

کر گئی دیوانگی ہم کو بری ہر جرم سے
پاک دامانی سے اپنی چاک دامانی ہوئی

باڑھ دی بانکی اداؤں نے جو خنجر کو جلیلؔ!
ذبح کرنے میں مرے قاتل کو آسانی ہوئی

○

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو، زمین چلے، آسماں چلے

آنکھوں میں کون آکے الٰہی نکل گیا!
کس کی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے

اٹھا ہوں میں جو دشت سے جانے کو اے جنوں
کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

احسن مارہروی

○

ادائیں، بانکپن، انداز میں اِک آن پیدا کر
تجھے معشوق بننا ہے، تو پوری شان پیدا کر

کہاں کا وصل، کیسی آرزو، اے دل! وہ کہتے ہیں
نہ مَیں حسرت کروں پوری، نہ تُو ارمان پیدا کر

ہمارا انتخاب اچھا نہیں اے دل تو پھر تُو ہی
خیالِ یار سے بہتر کوئی مہمان پیدا کر

مجھے ہے رشک اُسکو بھی رقیب اپنا سمجھتا ہُوں
نہ دیکھے جو تجھے ایسا کوئی دربان پیدا کر

خیالِ ضبطِ اُلفت ہے تو احسن خوف پھر کیا
نہ دھڑکے دل بھی سینے میں وہ اطمینان پیدا کر

○

ساقی و واعظ میں ضد ہے، بادہ کش چکر میں ہے
توبہ لب پر اور لب ڈوبا ہُوا ساغر میں ہے

روک لے اے ضبط! جو آنسو کہ چشمِ تر میں ہے
کچھ نہیں بگڑا ہے اب تک گھر کی دولت گھر میں ہے

دب گیا تھا میرے مرنے سے جو اے محشر خرام!
کیا وہی خوابیدہ فتنہ صورتِ محشر میں ہے

جس کو تُو چاہے جلا دے جس کو چاہے مار دے
وہ بھی تیری بات میں، یہ بھی تری ٹھوکر میں ہے

دل کے مٹ جانے سے، جوشِ عشق گھٹ سکتا ہے کیا
دل سے کیا مطلب کہ یہ سودا تو میرے سر میں ہے

مانتا ہے آستاں کو تیرے کعبہ اور کون؟
یہ ہمارا ہی نشانِ سجدہ، سنگِ در میں ہے

احسنِ آوارہ قسمت کی نہ پُوچھو گردشیں
اپنے گھر بیٹھا ہُوا تقدیر کے چکر میں ہے

نوحؔ ناروی

○

کسی بے درد کو ظلم و ستم کا شوق جب ہوگا
یہ میرا ایک دل لاکھوں دلوں میں منتخب ہوگا

ہمارا اور ان کا سامنا محشر میں جب ہوگا
وہ جلسہ وہ سماں وہ معرکہ بھی کچھ عجب ہوگا

کوئی زندہ رہے دنیا میں کیا اگلی اُمیدوں پر
ابھی تو ہجر کا رونا ہے ہوگا وصل جب ہوگا

لڑکپن جا چکا اُن کا جوانی آنے والی ہے
کبھی مجھ پر جفا ہوتی تھی، لیکن قہر اب ہوگا

تمہارے وصل کی ساعت ہمیشہ ٹلتی رہتی ہے
خدا جانے کہاں ہوگا، کسے معلوم کب ہوگا؟

ابھی لذت نہیں اس کو ملی آزارِ پنہاں کی
جو ہوگا بھی تو ہوتے ہوتے دل ایذا طلب ہوگا

وہ اپنے وعدۂ دیدار سے پھرنے کو پھر جائیں
مگر یہ تو سمجھ لیں بے وفا کس کا لقب ہوگا

مجھے اظہارِ اُلفت پر یہ ان سے داد ملتی ہے
تمہارا عشق اِک دن میری ذلت کا سبب ہوگا

بھری محفل میں اُن کو چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی
جناب نوحؔ تم سا بھی نہ کوئی بے ادب ہوگا

○

آپ جن کے قریب ہوتے ہیں
وہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں

جب طبیعت کسی پہ آتی ہے
موت کے دن قریب ہوتے ہیں

مجھ سے ملنا، پھر آپ کا ملنا
آپ کس کو نصیب ہوتے ہیں

ظلم سہہ کر جو اُف نہیں کرتے
ان کے دل بھی عجیب ہوتے ہیں

عشق میں اور کچھ نہیں ملتا
سینکڑوں غم نصیب ہوتے ہیں

نوحؔ کی قدر کوئی کیا جانے
کہیں ایسے ادیب ہوتے ہیں

عبداللطیف تپش

○

جان آنکھوں میں رہی جی سے گذرنے نہ دیا
اچھی دیدار کی حسرت تھی کہ مرنے نہ دیا

کیا قیامت ہے ستمگار ! بھری محفل میں
دل چرا کر تری دزدیدہ نظر نے ، نہ دیا

مدتوں کشمکش یاس و تمنا میں رہے
غم نے جینے نہ دیا شوق نے مرنے نہ دیا

ناخدا نے مجھے دلدل میں پھنسائے رکھا
ڈوب مرنے نہ دیا ، پار اترنے نہ دیا

کوئی تو بات ہے جو غیر کے آگے اس نے
شکوہ کیسا کہ مجھے شکر بھی کرنے نہ دیا

خاک آرام کی خواہش ہو وطن سے باہر
جب نہیں چین تپش اپنے ہی گھر نے نہ دیا

○

موت آتی نہیں قرینے کی
یہ سزا مل رہی ہے جینے کی

مے سے پرہیز ! شیخ توبہ کرو !
اک یہی چیز تو ہے پینے کی

تم کو کہتا ہے آئنہ خود بیں
باتیں سنتے ہو اس کمینے کی

ہو گیا جب سے بے نقاب کوئی
شمع روشن نہ پھر کسی نے کی

چشم تر آبرو تو پیدا کر
یوں نہیں بجھتی آگ سینے کی

اہل دنیا سے کیا بدی کا گلہ
اے تپش تو نے کس سے نیکی کی

ظفر تاباںؔ

○

عمرِ ابد کا ماحصل، عشق کا دورِ ناتمام
ہائے وُہ مستیٔ سحر، ہائے وُہ بیخودیٔ شام

پہلے مآل سوچ لیں، ہمسفرانِ سُست گام!
میری سرِشت میں نہیں، خواہشِ منزل و مقام

طائرِ خستہ بال کو دام بھی کنجِ آشیاں!
مُرغِ چمن نورد کو، گوشۂ آشیاں بھی دام

اب بھی خدا پرست ہے دیر و حرم کی قید میں
ہائے نگاہِ نارسا، ہائے مذاقِ ناتمام

کیفِ نظر کی مستیاں اہلِ نظر سے پُوچھئے
جیسے کوئی پلا گیا بادۂ مشک بُو کے جام

خوبیٔ و شانِ دلبری، غمزہ و ناز ہی نہیں
حُسن میں وہ ادا بھی ہے جس کا نہیں ہے کوئی نام

○

یاد میں تیری دو عالم کو بھلانا ہے ہمیں
عمر بھر اب کہیں آنا ہے نہ جانا ہے ہمیں

کہتے ہیں: عشق کا انجام بُرا ہوتا ہے
اب تو کچھ بھی ہو محبت کو نبھانا ہے ہمیں

خلشِ عشق سے بیچین ہے دل ایک طرف
اس پہ یارب! غمِ ہستی بھی اُٹھانا ہے ہمیں

ہائے وہ آگ! جو مشکل سے جلی تھی دل میں
آج اس آگ کے شعلوں کو بجھانا ہے ہمیں

رخصتِ عرضِ تمنا نہیں ملتی، نہ ملے
قصۂ شوق نگاہوں سے سُنانا ہے ہمیں!

آپ کا نٹوں سے جو بچتے ہوئے چلتے ہیں، چلیں
دامنِ شوق کو پھولوں سے بچانا ہے ہمیں

ہائے! اس شرمِ محبت کا بُرا ہو تاباںؔ
عشق کا راز خود ان سے بھی چھپانا ہے ہمیں

عندلیب شادانی

○

کوئی ادا شناس محبت ہمیں بتائے
جو ہم کو بھول جائے وہ کیوں ہم کو یاد آئے

کس کی مجال تھی کہ حجابِ نظر اُٹھائے
وہ مسکرا کے آپ ہی دل کے قریب آئے

اک دلنشیں نگاہ میں اللہ یہ خلش
نشتر کی نوک جیسے کلیجے میں ٹوٹ جائے

کچھ ہم سے بیخودی میں ہوئیں بے حجابیاں
چشمک زنی ستاروں نے کی پھول مسکرائے

ناداں سہی پر اتنے بھی ناداں نہیں ہیں ہم
خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے

وہ جانِ آرزو کہ ہے سرمایۂ نشاط
کیوں اس کی یاد، غم کی گھٹا بن کے دل پہ چھائے

کہتے تھے تم سے چھوٹ کے کیونکر جئیں گے ہم!
جیتے ہیں تم سے چھوٹ کے تقدیر جو دکھائے

یوں ہے کہ دل میں وہ عالم، دمِ وداع
بجھتے ہوئے چراغ کی لَو جیسے تھرتھرائے

تم تو ہمیں کو کہتے تھے، یہ تم کو کیا ہوا
دیکھو! کنول کے پھولوں سے شبنم چھلک نہ جائے

اک ناتمام خواب، مکمل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

○

جہاں عہدِ تمنا ختم ہو جائے
عذابِ جاودانی زندگی ہے

رُلاتی ہے مجھے کیوں چاندنی رات
یہی اِک راز میری زندگی ہے

خلش ہو، درد ہو، کاہش ہو، کچھ ہو
فقط جینا بھی کوئی زندگی ہے

ہلاک انجامِ تکمیلِ تمنا!
بقائے آرزو ہی زندگی ہے

جگر میں ٹیس، لب ہنسنے پہ مجبور
کچھ ایسی ہی ہماری زندگی ہے

وہ چاہے جس قدر بھی مختصر ہو
محبت کی جوانی زندگی ہے

امیدیں مر چکیں، میں جی رہا ہوں
عجب بے اختیاری زندگی ہے

جوانی اور ہنگاموں سے خالی
یہ جینا ہے، یہ کوئی زندگی ہے

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہیں کی یاد میری زندگی ہے

محبت دونوں جانب سے محبت
نہ پوچھو آہ! کیسی زندگی ہے

علی اختر

○

زندگی کیا ہے، جو دل ہو تشنۂ ذوقِ وفا
یعنی یہ پردہ تو اُٹھ سکتا ہے آسانی کیساتھ

گفتگوئے صورت و معنی ہے عنوانِ حیات
کھیلتے ہیں وہ مری فطرت کی حیرانی کیساتھ

تم نے ہر ذرّے میں برپا کر دیا طوفانِ شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کیساتھ

دل کی آبادی ہے اختر دل کی بربادی کا نام
اک تعلق ہے مری ہستی کو ویرانی کے ساتھ

○

حریم کعبہ بنا دی وہ سرزمیں میں نے
ترے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

مجھی کو پردۂ ہستی میں دے رہا ہے فریب
وہ حسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے

چٹک میں غنچے کی وہ صوتِ جاں فزا تو نہیں
سُنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

رہینِ منزلِ وہم و گماں رہا اختر
اسی میں ڈھونڈ لیا جادۂ یقیں میں نے

تلوک چند محروم

○

اس کا گلا نہیں کہ دعا بے اثر گئی
اک آہ کی تھی، وہ بھی کہیں جا کے مر گئی

اے ہم نفس، نہ پوچھ جوانی کا ماجرا
موجِ نسیم تھی، اِدھر آئی، اُدھر گئی

دامِ غمِ حیات میں اُلجھا گئی اُمید
ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ احسان کر گئی

اس زندگی سے ہم کو نہ دنیا ملی، نہ دین
تقدیر کا مشاہدہ کرتے گزر گئی

انجامِ حسنِ گل پہ نظر تھی، وگرنہ کیوں
گلشن سے آہ بھر کے نسیمِ سحر گئی

بس اتنا ہوش تھا مجھے روزِ وداعِ دوست
ویرانہ تھا نظر میں جہاں تک نظر گئی

ہر موجِ آبِ سندھ ہوئی وقفِ پیچ و تاب
محروم جب وطن میں ہماری خبر گئی

○

کاوشوں سے اماں ملے نہ ملے
پھر ترا آستاں ملے نہ ملے

اب قفس ہی کو آشیاں کہتے
راحتِ آشیاں ملے نہ ملے

دل سے رہتے ہیں مشورے دن رات
ہم سخن، ہم زباں ملے نہ ملے

محوِ فریاد ہم ہیں آج کہ پھر
فرصتِ یک فغاں ملے نہ ملے

عَلَمِ آہ سر بلند ہے آج
کل ہمارا نشاں ملے نہ ملے

تُو تو بیتاب ہے مگر اے دل
ہو کے وہ مہرباں ملے نہ ملے

یہ غزل جوش[1] کو سنا محروم
پھر کوئی نکتہ داں ملے نہ ملے

[1] جناب جوش ملیح آبادی

غزل قدیم

آرزو

سراج الدین علی خان

○

آتا ہے صبح اُٹھ کر تیری برابری کو
کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشیدِ خاوری کو

دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک
کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیا گری کو

اس تُند خو صنم سے ملنے لگا ہوں جب سے
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو

اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے
بادِ صبا یہ کہنا اس دلربا پری کو

اب خواب میں ہم اُسکی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو

آزردہ

مفتی صدر الدین

○

یہ کہہ کے رخنہ ڈالیے ان کے حجاب میں
اچھے بُرے کا حال کھلے کیا نقاب میں

یا رب وہ خواب حق میں مرے خوابِ مرگ ہو
آئے وہ مستِ خواب اگر میرے خواب میں

تحقیق ہو تو جانوں کہ میں کیا ہوں، قیس کیا
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں

میں اور ذوقِ بادہ کشی؛ لے گئیں مجھے!
یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

ہیں دونوں مثلِ شیشہ، یہ سامانِ صد شکست
جیسا ہے میرے دل میں نہیں ہے حباب میں

یہ عمر اور عشق ہے آزردہ جائے شرم!
حضرت یہ باتیں پھبتی تھیں عہدِ شباب میں

آشفتہ

بھوُرے خاں

○

جامِ گدائی ہاتھ میں لے نت سانجھ سویرے پھرتے ہیں
شمس و قمر یہ دونوں بھکاری حُسن کے تیرے پھرتے ہیں!

مدت سے ہے اخترِ طالع ماہ جبیں بن گردش میں
کھول تو باہمن پوتھی اپنی کب دن میرے پھرتے ہیں

پنڈت پوچھو، ہاتھ دکھاؤ، فال کھلاؤ کوئی، پر
دن جو ہوں برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

عقل و فراست سلب ہوئے سب ہائے جنوں رے ہائے جنوں
گلیوں گلیوں لڑکے ہم کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں

یوں کاندھے پر زلفیں اس کی بل کھاتی ہیں وقتِ خرام
مارِ سیہ کو ڈالے گلے میں جیسے سپیرے پھرتے ہیں

جوگ لیا آشفتہ ہم نے دیکھ لٹک ان زُلفوں کی
گلیوں گلیوں حال پریشاں، بال بکھیرے پھرتے ہیں

آشفتہ

مرزا رضا قلی

○

یہ جوشِ غم ہے کہ سینہ میں خون ابلتا ہے
نہ رکھیو ہاتھ کلیجہ پہ میرے، جلتا ہے

نہ پوچھو دل کی حقیقت تمہارے عشق میں آہ
اسے وہ غم جو لگا ہے اسی میں گلتا ہے

یہ ہم کو اس کی جوانی نے اور ایذا دی
کہ رات دن کوئی سینے میں دل کو ملتا ہے

کسی کے کان کا دُر دیکھا تو نے آشفتہ
جو اشک آنکھوں سے موتی سا تیرے ڈھلتا ہے

آصفؔ

آصف الدولہ بہادر

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے

تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح
ایسے بیٹھے کہ پھر نہ واں سے گئے

شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم
ایسے گذرے کہ جسم و جاں سے گئے

ق

ایک دن میں نے یار سے یہ کہا
اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ سُن لے اے آصفؔ
یہی کہہ کہہ کے لاکھوں جاں سے گئے

آفتابؔ

شاہ عالم بادشاہ دہلی

بعد مجنوں کیوں نہ ہوں ہیں کارفرمائے جنوں
عشق کی سرکار سے ملبوس رُسوائی ملا

خوب سا سیدھا بنے گا دیکھ اے سروِ چمن
اس کی رعنائی سے مت تو اپنی زیبائی ملا

جل گیا پروانہ جس دم محفل آرائی کے ساتھ
خاک میں سب شمع نے دی محفل آرائی ملا

طالعِ بیدار کی منت اُٹھانے بھی نہ دی
اس سے شب ہم کو تمنا خواب میں لائی ملا

اپنی قسمت میں ازل سے تھی لکھی سرگشتگی!
گرد و باد آسا جو کارِ دشت پیمائی ملا

واہ وا! رحمت ہے اس کو اور مجھ کو آفریں
راہ میں بن کر عصا جو خارِ صحرائی ملا

دستگیری بھی نہ کی تو نے کہ جو نقشِ قدم!
خاک میں میں تیری خاطر اے توانائی ملا

سرکشی اے چرخ مت کر دیکھ پیشِ آفتابؔ
خاک میں دے گا یہ ساری تیری خود رائی ملا!

احساںؔ

منشی احسان علی شاہجہانپوری

اس کو نہ سوچیے کہ ستم یا کرم ہوا
خنجر اُٹھائیے! سرِ تسلیم خم ہوا

توڑا ہمارے دل کو بتوں نے ستم ہوا
وہ بھی انہیں کا قول انہیں کی قسم ہوا

اپنی گلی میں دیکھ کے ہم ہو رہے ہیں خوش
نقشِ امید، یار کا نقشِ قدم ہوا

کیسا مری وفا نے پشیمان کر دیا
آنکھیں بھی اُن کی جھک گئیں غصہ بھی کم ہوا

دونوں طرف ہے جب وہی دل ایک جان ایک
مجھ پر ستم ہوا، تو تمہیں پر ستم ہوا

محرومِ عیش میری طرح دوسرا کہاں
دل میں سرورِ وصل بھی آیا، تو غم ہوا

احساںؔ ضبط کرنے سے اخفائے رازِ عشق
دل سے بہت ہوا مگر آنکھوں سے کم ہوا

احسنؔ

میرزا احسن

نہ نالہ ہے دل میں نہ آہِ حزیں ہے
کوئی دم ہے یاں، سو دمِ واپسیں ہے

گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا
ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے

گیا دل جو کوچہ میں چیں جبیں کے
نہ پھر واں سے نکلا عجب سرزمیں ہے

قدم رکھ نہ اپنا مرے دل سے باہر
کہا مان میرا، یہ گھر دل نشیں ہے

نہ کھینچ آسماں پہ تو سر اپنا احسنؔ
سمجھ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

اختر

نواب واجد علی شاہ

○

چاک چاک اپنا گریباں نہ ہوا تھا، سو ہوا
وحشتِ دل کا جو ساماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

یاخدا دیر میں ساماں نہ ہوا تھا، سو ہوا
کافرِ عشق مسلماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

رخِ انور سے مَیں حیراں نہ ہوا تھا سو ہوا
کبھی اے زلف! پریشاں نہ ہوا تھا، سو ہوا

ظلم و جور اے شبِ ہجراں! نہ ہوا تھا، سو ہوا
خانۂ گور میں مہماں نہ ہوا تھا، سو ہوا

چشمِ انصاف سے طوفاں نہ ہوا تھا، سو ہوا
دلِ اختر چمنستاں نہ ہوا تھا، سو ہوا

اثر

نواب سید امداد امام

○

سُنا حالِ دل، پر کہا کچھ نہیں
مگر کان دھر کر سُنا کچھ نہیں

نہ گُل پر ہے جوبن، نہ بلبل کو جوش
چمن کی وہ اگلی ہوا کچھ نہیں

عبادت خدا کی بہ امیدِ حُور
مگر تجھ کو زاہد حیا کچھ نہیں

خدا ان سے بندوں کو اپنے بچائے
کہ نزدیک جن کے خدا کچھ نہیں

حسینوں کے انداز مت پُوچھئے
جفا ہی جفا ہے، وفا کچھ نہیں

بُتوں کی پرستش کہاں تک اثر
مگر تجھ کو خوفِ خدا کچھ نہیں

ارشدؔ

میرزا عبد الغنی گورگانی

○

الٰہی جان دی ہے مَیں نے کس کے رُوئے روشن پر
ہزاروں شمعیں پروانہ بنی ہیں میرے مدفن پر

تعجب کیا خمیدہ ہو اگر تلوار قاتل کی!
چڑھا ہے خون کس کس بے گُنہ کا اس کی گردن پر

وہ بے انصاف، اور اپنی وفا کی داد یا قسمت!
گمانِ دوستی ہے سادگی سے ہم کو دُشمن پر

عجب اس جلوۂ یکتا میں نیرنگِ تماشا ہے
نئی صورت سے چمکا خاطرِ شیخ و برہمن پر

مَیں یُوں مرہونِ منتِ تیغِ کل کا جب سے اے ارشدؔ
یقین دوستی ہونے لگا ہے مجھ کو دشمن پر

اسدؔ

میر امانی

○

پی کر شراب، اُور وہ تر جام دے گیا
وہ شوخ ہم کو بوسہ بہ پیغام دے گیا

آیا جو مے کشی کو چمن میں وُہ بادہ نوش
ہر ایک گُل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا

کھانے کو غم ہے پینے کو خوں، دیکھنے کو داغ
سب عشق کا وُہ ہم کو سرانجام دے گیا

کل لڑ گیا کہ اور یہ عاشق ہے تُو اسدؔ
آیا ہے جب وُہ یاں تو اک الزام دے گیا

اسمٰعیل

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

○

جو بھلے بُرے کی اٹکل نہ مرا شعار ہوتا
نہ جزائے خیر پاتا نہ گُناہ گار ہوتا

مئے بے خودی کا ساقی مجھے ایک جرعہ بس تھا
نہ کبھی نشہ اُترتا نہ کبھی خمار ہوتا

میں کبھی کا مر بھی رہتا، نہ غمِ فراق سہتا
اگر اپنی زندگی پر مجھے اختیار ہوتا

یہ جو عشق جانستاں ہے یہ جو بحرِ بیکراں ہے
نہ سُنا کوئی سفینہ کبھی اس سے پار ہوتا

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو کوئی تم سے کرتا، تمہیں ناگوار ہوتا

ہے اس انجمن میں یکساں عدم و وجُود میرا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا یہی کاروبار ہوتا

اسیر

مظفر علی

○

آہ کب لب پر نہیں ہے داغ کب دل میں نہیں
کون سی شب ہے کہ گرمی اپنی محفل میں نہیں

بزم کی کثرت سے اندیشہ مرے دل میں نہیں
دل میں اس کی ہے جگہ میرے جو محفل میں نہیں

پنجۂ مژگانِ تر نے یہ اُڑائیں دھجیاں!
تار باقی ایک بھی دامانِ ساحل میں نہیں!

خونِ ناحق کا ہمارے داغ مٹنے کا نہیں
تیغ میں ہوگا، اگر دامانِ قاتل میں نہیں

پردہ دارِ چہرۂ یوسف نہیں ہے ہر نقاب
حُسنِ لیلےٰ جلوہ گر ہر ایک محمل میں نہیں!

نجد کا صحرا عجب صحرائے وحشت خیز ہے
قیس کیا لیلےٰ کو بھی آرام منزل میں نہیں!

جس طرف جی چاہے گا میرا نکل جاؤں گا میں
سینکڑوں دروازے ہیں حلقے سلاسل میں نہیں

حد سے باہر پاؤں جو رکھتا ہے ہوتا ہے خراب
گھر میں جو راحت مسافر کو ہے منزل میں نہیں

ڈوبتے جاتے ہیں کیونکر لوگ حیرت ہے مجھے
قدِ آدم آب بحرِ تیغِ قاتل میں نہیں

ہم غریبوں کا خدا ہے، ناخدا درکار کیا
طالبِ ملاح کشتی دستِ ساحل میں نہیں

ہوگیا دہشت سے ایسا بسملوں کا خون خشک
ایک بھی دھبا لہو کا تیغِ قاتل میں نہیں

افسوس

میر شبیر علی

○

سمندِ گرم جویاں اس سوار کا پہنچا
غبار تا فلک اس خاکسار کا پہنچا

تو سچ بتا کہ تجھے اتنی کیوں ہے بیچینی
مگر پیام کسی بے قرار کا پہنچا

کُھلے ہے پاؤں سے اپنے وہ لالہ رُو ہر دم
یہ مرتبہ تو دلِ داغ دار کا پہنچا

ہے یاں تلک تو نزاکت گلوں کے گجرے سے
لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا

قفس سے چھٹنے کی اُمید ہی نہیں افسوس
حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

اشتیاق

ولی اللہ سرہندی

○

خیال دل کو ہے اس گُل سے آشنائی کا
نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا

کہیں وُہ کثرتِ عشاق سے گھمنڈ میں آ
ڈروں ہوں میں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا

مجھے تو رو کے تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج
غرور کیا ہُوا وہ تیری پارسائی کا

جہاں میں دل نہ لگانے کا لیوے پھر کوئی نام
بیاں کروں میں اگر تیری بے وفائی کا

نہ چھوڑا مار بھی کھا کر گزر گلی کا تری
رقیب کو مرے دعویٰ ہے بے حیائی کا

نہیں خیال میں لاتے وُہ سلطنت جم کی
غرور ہے جنہیں در کی ترے گدائی کا

خیالِ یار سے مت اشتیاق پھیر کے مُنہ
خیال کیجو کہیں اور جبہ سائی کا

آلم

صاحب میر

○

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکڑ کر
بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر

ہنگام فغاں تھا خس و پنبہ قفس و دام
تار رگِ گل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر

ب نام خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو
رہ جائیں صفوں کی صفیں حیرت سے بچھڑ کر!

یل کا تو ہیچ اٹھا بیٹھے گا اے شیخ
شا سکے نہ کچھ پاوے گا رندوں سے بگڑ کر

ا آتا ہے دکھ درد بھلانے کو الم یاں
اس سے مزا تم جو اٹھاتے بھلا لڑ کر

امانت لکھنوی

○

شبِ فرقت میں نالوں نے جہاں سر پہ اٹھایا ہے
زمیں کو زلزلہ ہے آسماں چکر میں آیا ہے

حساب آب و دانہ حشر میں ہوگا، تو کہہ دوں گا
پیا ہے عمر بھر خونِ جگر، غم میں نے کھایا ہے

شفق پھولی ہے دیکھو شام کو شہرِ بدخشاں میں
لبِ رنگیں پہ مسّی مل کے اس نے پان کھایا ہے

مری تربت پہ تارا چاندنی میں کیوں ہے نکیرو
یہ کس نے چادرِ مہتاب میں دھبّہ لگایا ہے!

نہیں بے وجہ پیہم ہچکیاں آتی ہیں فرقت میں
کسی محبوب کو تو اے امانت یاد آیا ہے!

امانی

میر امانی

○

اس کے کوچہ ستی غبار اُٹھا
کون سا وان سے خاکسار اُٹھا

عندلیبو! ابالو اب حصرا
باغ سے موسم بہار اُٹھا

ہچکیاں لے گلابیاں روئیں
بزم سے جب یہ مے گسار اُٹھا

عزمِ رخصت ہوا جب ہی اس کا
میرے دل سے وہیں قرار اُٹھا

نہیں جو قدرِ اشک عالم سے
موتیوں کا مگر وقار اُٹھا

شمع سے سوز امانی پوچھا ترا
اک دھواں اس کے دل سے یار اُٹھا

امید

قزلباش خان

○

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
در و دیوار سے اب صحبت ہے

دل ہمارا اسے کرتا ہے رات
غیر سے جو سرِ شب صحبت ہے

دردِ دل اس سے جو ہم نے نہ کہا
ایسی حالت ہوئی کب صحبت ہے

دہر میں پاسِ نفس لازم ہے
شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دستِ اغیار ہے زیرِ سرِ یار!
آج امید کہ طرفہ صحبت ہے

امیرؔ

نواب محمد یار خان

○

سرخ چشم اتنی کہیں ہوتی ہے بیداری سے
لہو اترا ہے تری آنکھوں میں خونخواری سے

وقت رخصت کے ترے اے مرے جی کے دشمن
تھام تھام آج رکھا دل کو میں کس خواری سے

بس میں آیا جو تمہارے، اسے جو چاہو سو کرو
کیا ستم آدمی سہتا نہیں لاچاری سے

کس نے نظروں میں خدا جانے اسے مل ڈالا
نرگس آج آنکھ اٹھاتی نہیں بیماری سے

کیا کہوں ولولۂ شوق کو تیرے میں امیرؔ
گھر میں جاتے ہیں پرائے تو خبرداری سے

امینؔ

خواجہ امین الدین

○

جس کا دل آپ نے لیا ہوگا
خاک میں لے ملا دیا ہوگا!

ہم کو کیا گر بہار آتی ہے
دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا

گالیاں غیر سے سناتے ہو!
ہاں میاں! تم سے اور کیا ہوگا

مل گیا ہوگا خاک میں جوں اشک
تیری آنکھوں سے جو گرا ہوگا

انجام

عمدۃ الملک امیر خان

ٹک تو دے فرصت کہ ہو لیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آزاد ہم

منہ ترا تکتے ہیں سب اقلیم حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

دل تو ہے داغِ غلامی سے تری طاؤس وار
سامنے قمری کے ہیں گو سرو ساں آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر، مانندِ شرر، جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ تمکنت
شکر ہے ناتڑپے نہ زیرِ خنجرِ فولاد ہم

انیس لکھنوی

صدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

بھلا تردد بیجا سے اس میں کیا حاصل
اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ہجر

شیخ امداد علی

○

آنکھ کھلتے ہی میسّر ہُوا دیدارِ قفس
موئے مژگاں مری قسمت سے ہوئے تارِ قفس

ہم اسیروں کے اگر تیرِ نظر کاری ہیں
ہو گئی دیوارِ چمن صورتِ دیوارِ قفس

کیے دیتی ہے بنائے قفس ناتوانی
مر گئے پر بھی نہ چھُوٹیں گے گرفتارِ قفس

ہم صفیرو! کوئی کیا جانے اسیری کا مزا
میں چمن بیچ کے ہوتا ہُوں خریدارِ قفس

رُوبصحت ہوئے زنداں سے جو مر کر نکلے
گور میں نقل مکاں کرتے ہیں بیمارِ قفس

برق لکھنوی

○

کیا کیا ہُوا نہ دامنِ دولت سے چھوٹ کر
مر مر گیا فراق میں حضرت سے چھوٹ کر

آنکھیں ترس رہی ہیں زیارت کے واسطے
دم بند ہے حضور کی خدمت سے چھوٹ کر

آتا نہیں قرار دلِ بے قرار کو
غم میں پھنسا ہُوں دامِ محبت سے چھوٹ کر

آخر تڑپ تڑپ کے گئی جانِ مضطرب
ہرگز نہ ہم بچے کسی صُورت سے چھوٹ کر

کیا برق مُنہ دکھاؤں کہ آتی ہے مجھ کو شرم
زندہ میں ہوں فراق میں حضرت سے چھوٹ کر

بسملؔ

سید امین الحسن موہانی

○

پہلے سے دیکھنا کہیں بہتر بنائیں گے
اب اپنا ایک اور مقدر بنائیں گے

بگڑے ہوئے ہیں ضد پہ ہیں، کون آکے کیا کہے
اس وقت بات بات کے دفتر بنائیں گے

دیکھیں گے اپنے دل کے تحمّل کی کیفیت
ہم ان کو اور چھیڑ کے خودسر بنائیں گے

آنے تو دو بہار کا موسم، جنوں کے دن
اپنے لئے ہم آپ ہی نشتر بنائیں گے

بسملؔ چلیں گے آج درِ یار تک ضرور
پژمردہ دل کو تیرے گلِ تر بنائیں گے

بقاؔ

شیخ بقاء اللہ

○

رہرواں کہتے ہیں جس کو، جرسِ محمل ہے
محنتِ راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے

موج ہے بیش نہیں ہستیٔ وہمی کی نمود
صفحۂ دہر پہ گویا یہ خطِ باطل ہے

کچھ تعین نہیں اس راہ میں جوں ریگِ رواں
جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے

آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی
بے یقیں جانیو اس کو کہ مرا قاتل ہے

کھول دو عقدۂ کونین بقاؔ کے
یا علیؑ تم کو یہ آساں ہے جو مشکل ہے

بہار

گلشن الدولہ

○

اٹھو گلے سے لپٹ جاؤ، پھر بکھر لینا
تمام رات پڑی ہے بناؤ کر لینا

یہ کوٹنا، یہ مرا درد، یاد کر لینا
کبھی کبھی تو کلیجہ پہ ہاتھ دھر لینا

ہمارے ساتھ ہے تیرا بھی امتحاں اے تیر!
ڑپ کے دل جو نکل جائے، تو جگر لینا

رے تو کر دے نہ سکے گا کبھی گلا میرا
بی خوشی ہو تو آنکھوں پہ ہاتھ دھر لینا

گنا ہگار پہ یارب نزولِ رحمت کر
را خزانہ جو خالی ہو مجھ سے بھر لینا

آ روز یہ کم بخت منہ کو آتا ہے
دھر جلا ہے مرا دل، ذرا خبر لینا

بیباک

سید حسین احمد شاہجہانپوری

○

ہر ایک سانس ہے تیغِ نگاہِ یار مجھے
دیا ہے شوق نے وہ لطفِ انتظار مجھے

ڈرا ہوا ہوں یہ میں زیست سے محبت میں
ہوا نہ مر کے بھی مرنے کا اعتبار مجھے

یہ مدعا ہے کہ ہو ہر بلا کا اس میں گزر
اسی لیے تو دیا ہے دلِ فگار مجھے

کمی وفا میں اگر ہو، تو وہ جتانہ کرے
صلاح دیتے ہیں کیا کیا صلاح کار مجھے

سکونِ دل کی تمنا، یہ عشق کا دعویٰ
اسی لیے وہ ستاتے ہیں بار بار مجھے

نگاہِ غیر سے دیکھا اسے تو کیا دیکھا
کہ ہے ابھی مرے مرنے کا اعتبار مجھے

یہ امتحان ہے پیرایۂ تغافل میں
ملا دے خاک میں اے آہِ شعلہ بار مجھے

اسی ادا سے کہ "او! میرے ڈھونڈنے والے
کہاں ہے تو؟" یونہی اک بار پھر پکار مجھے

وفائے عہد، دمِ نزع، اے جزاک اللہ
اب آپ جائیے! آجائے گا قرار مجھے!

سزا ملے نہ ملے جرمِ عشق پر لیکن
وہ جانتے تو ہیں اپنا گناہگار مجھے

عجیب لطف سے باتوں کا دل سے اے بیباک
ملا ہے خوب محبت میں رازدار مجھے

بیتاب عظیم آبادی

○

عقل دوڑائی بہت کچھ تو گماں تک پہنچے — کچھ حقیقت بھی ہے انساں کی کہاں تک پہنچے

عشق کے شعلے بھڑک کر رگِ جاں تک پہنچے — آگ سی آگ ہے یہ آگ جہاں تک پہنچے

لڑ گئی ان سے نظر کھچ گئے ابرو اُن کے — معرکے عشق کے اب تیر و کماں تک پہنچے

دِل سے باہر ہو ترا راز گوارا ہے کسے — یہ کوئی بات نہیں ہے کہ زباں تک پہنچے

مارے وہ نگہِ ناز تو رتبہ ہو بلند — سر ہوا اونچا مرا گر نوکِ سناں تک پہنچے

کوئی دیوانگیٔ عشق کا قصہ چھیڑے — سلسلہ اس کا خدا جانے کہاں تک پہنچے

سرخیٔ خارِ بیاباں یہ پتہ دیتی ہے — کہ ادھر سے ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

رندِ پُر کیف بہ یک گردشِ چشمِ ساقی — غایتِ دائرۂ کون و مکاں تک پہنچے

رُخ سے پردہ کو ہٹا حسنِ یقیں تک پہنچا — آخر انساں ہوں یوں عقل کہاں تک پہنچے

راہ میں اور بھی دیوانوں سے ملتے جلتے — پوچھتے پوچھتے ہم اُن کے مکاں تک پہنچے

شربتِ دید نہ ہو تیغ کا پانی ہی سہی — کوئی ٹھنڈک تو مرے قلبِ تپاں تک پہنچے

لے گئے عشق کی بازی بہ صفائی بیتاب
جان پر کھیل گئے جانِ جہاں تک پہنچے

تجلّی

میاں حاجی

○

طرب کا رنگ، رُخِ گل پہ آشکار آیا
کلی سی کھل گئی جوں ہی وہ گلعذار آیا

تڑپ کے جان نکل جائے گی ابھی صیاد
نہ کہیو باغ میں پھر موسمِ بہار آیا

ملائیں خاک میں مر مر کے، آہ! پر تو بھی
نہ بے قراریٔ دل کے تئیں قرار آیا

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم
یہ سر یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا

یہ شوق دیکھو پسِ مرگ بھی تجلّی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

تسکین

میر حسین

○

کر سکے دفن نہ اس کوچہ میں احباب مجھے
خاک میں دل کی کدورت نے دیا داب مجھے

ہجر میں پاس نہ ہے زہر نہ خنجر افسوس
نہ دئے موت کے بھی چرخ نے اسباب مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم اے ہوش
بات تو کرنے دے اس سے دلِ بیتاب مجھے

نام تسکیں پہ یہ مضمونِ تپش نازیبا،
تھا تخلص جو سزاوار تو بیتاب مجھے

تسلّی

لالہ ٹیکا رام

○

عالم اس بُت پہ مبتلا ہی رہا
ان میں فدوی بھی اک فدا ہی رہا

اُڑ گئی دوستی زمانے سے
آشنائی، نہ آشنا ہی رہا

نہ سُنی تُو نے ایک بات کبھو
ہم کو اس بات کا گلا ہی رہا

تم خفا ہی رہے تسلّی سے
اور وہ تم پہ نت فدا ہی رہا

تشنہ

محمد علی

○

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر، اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع ہے، گل بھی ہے، بلبل بھی ہے، پروانہ بھی
رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں

حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش
سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں

لامکاں میں بھی تو اک جلوہ نظر آتا ہے
بیکسی میں تو اِدھر ہوں کہ جدھر کچھ بھی نہیں

ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ
فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

تنہا

محمد عیسیٰ

○

ہم سے کرتے ہو بیاں غیروں کی یاری آن کر
رہ گئی ہے آپ کی یہ دوست داری آن کر

ہم کو آنے سے تمہاری بزم کے کیا تھا حصول
دیکھ لیتے تھے مگر صورت تمہاری آن کر

رُوٹھنے پر میرے کیا لازم تھا، ہو جانا خفا
بلکہ کرنی تھی تمہیں خاطر ہماری آن کر

طعن بدخواہاں سے تو اک دم نہ پاوے گا قرار
کی جو تیرے در پہ ہم نے بے قراری آن کر

تھا اگرچہ غش میں مجنوں لیکن آنکھیں کھل گئیں
سر پہ اس کے جس گھڑی لیلیٰ پکاری آن کر

جس جگہ کشتہ کا تیرے لاشہ تھا خوں میں پڑا
خوب سا رویا وہاں ابر بہاری آن کر

میں بھی کیا برگشتہ طالع ہوں کہ تنہا رات کو
پھر گئی، در تک مرے اس کی سواری آن کر

ثاقب

نواب شہاب الدّین خان

○

ہم توت جذب دل دکھائیں
اور پھر وُہ ہمارے گھر نہ آئیں

کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں
کچھ حال سُنو تو ہم سُنائیں

اے بخت کہاں تک بُرائی
اے چرخ! کہاں تک جفائیں

ہم سینہ سپر کیئے کھڑے ہیں
وُہ شوق سے غضب آزمائیں

جو کام ہیں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دل رُبا ادائیں

شاید کہ ہے گرم نالہ ثاقب
جلتی ہیں شرر فشاں ہوائیں

جوآن

مرزا نعیم بیگ

○

یہ ان دنوں جو ہم سے اتنی رُکھائیاں ہیں
شاید کسی نے باتیں کچھ کچھ سجھائیاں ہیں

اے عندلیب! سچ کہہ، کیا فصلِ گُل پھر آئی
فوجیں جنوں کی ہم پر کیسی چڑھ آئیاں ہیں

کس بے ادب نے تم سے گُل بازی آج کی ہے
منہ پر تمہارے چوٹیں کیا سخت آئیاں ہیں

دیوار و در کی چھاتی سُوراخ ہو گئی ہے
کیا روزنوں سے اس نے آنکھیں لڑائیاں ہیں

پیوستہ ابرو اس کی ہیں دیکھ کر یہ سمجھا
دو شاخیں ہیں کہ جھک کر ملنے کو آئیاں ہیں

جوشش

شیخ محمد روشن

○

یاں مُدّعی اپنا کسے اے یار نہ دیکھا
ہے کوئی جسے تیرا طلب گار نہ دیکھا

سوتوں کو جگایا مرے نالے نے عدم کے
پر طالع خوابیدہ کو بیدار نہ دیکھا

کل بزم میں سب پر نگہ لُطف و کرم تھی
اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا

جز چشم بُتاں میکدۂ دہر میں جوشش
ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

حزیں

میر محمد باقر

○

مری رنگیں کلامی کا ہے وہ گُل پیرہن باعث
کہ ہووے بُلبلوں کی خوش صفیری کا چمن باعث

کوئی ہوتا ہے ننگِ سینۂ خسرو سے رقیبوں کا
ہوا ناحق ہلاک اپنے کا آپی کوہ کن باعث

جو ہوتا ہے کسی سے انس سب کے وحشت آتی ہے
مری صحرا نشینی کا ہے میرا من ہرن باعث

حزیں ان شعلہ رُخساروں سے جی کو مت لگا ہرگز
ہوئی آخر کو پروانے کے جلنے کی لگن باعث

حسامیؒ

مرزا حسام الدین حیدر

○

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ، نہیں دل کو اپنے قرار ہے
کروں غم ستم کا میں کیا بیاں، مرا غم سے سینہ فگار ہے

وہ شہر دہلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح کا یہاں امن (۹)
وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا، فقط اب تو اُجڑا دیار ہے

یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہوں کیا جو ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکم وقت نے، کہا یہ تو قابلِ دار ہے

شب و روز مجھ کو ملیں جو تمہیں، وہ یوں خارِ غم سے فگار ہوں
یہ طوق قید میں جب انہیں کہیں جیسے گُل کے یہ ہار ہے

جو سلوک اور روش کرتے تھے وہی اب ہیں کتنے ذلیل و خوار
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے، بات تن پہ ان کے نہ تار ہے

یہ زمانہ ہے وہ بُرا فلک، چلو نچ کے سب سے الگ الگ
نہ رفیق کوئی کسی کا یاں، نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے

کیا حسامی ڈر تجھے حشر کا، جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا وہی تیرا حامی کار ہے

حسینؔ

سید صادق علی

○

ایسا بھی نہیں درد کے مارے نہیں دیکھے
ہم نے گل و بلبل کے اشارے نہیں دیکھے

جب میں نے کہا مرتا ہوں مُنہ پھیر کے بولے
سنتے تو ہیں، پر عشق کے مارے نہیں دیکھے

ہر سمت پھرے خاک اُڑایا کئے برسوں
پر نقشِ قدم ہم نے تمہارے نہیں دیکھے

پوشیدہ ہیں کس حد میں مری خاک کے ذرّے
پتھر میں بھی اس طرح اشارے نہیں دیکھے

تُربت میں مرے بندِ کفن کھول کے بولے
ہم نے دہنِ زخم تمہارے نہیں دیکھے

اب قبر پہ آئے ہو تو اس سمت بھی دیکھو
ہاں نیچی نگاہوں کے اشارے نہیں دیکھے

بے چین ہے دل فصلِ بہاری میں حسیںؔ کا
اب تک کسی گُل رو کے اشارے نہیں دیکھے

سارے ہندوستان کے [illegible] شاعر [illegible] (اردو)، اورنگ آباد دکن، جنوری ۱۹۳۱ء

حیاؔ

مرزا رحیم الدین

○

موت ہی چارہ سازِ فرقت ہے
رنج مرنے کا، مجھ کو راحت ہے

ہو چکا وصل، وقتِ رُخصت ہے
اے اجل! جلد آ، کہ فرصت ہے

روز کی داد کون دیوے گا
ظلم کرنا تمہاری عادت ہے

کارواں عُمر کا ہے رخت بدوش
ہر نفس بانگِ کوسِ رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے
دم نکلتا نہیں مصیبت ہے

تم بھی اپنے حیاؔ کو دیکھ آؤ
آج اس کی کچھ اور حالت ہے

حیراںؔ

میر حیدر علی

○

گر یہی وضع ہے اور ہیں یہی ہیہات نصیب
تو ہیں ہو چکی بس اس سے ملاقات نصیب

ہم لبِ گور ہوئے خوں بہ جگر اس غم سے
کہ نہ اس غنچہ دہن سے نہ ہوئی بات نصیب

صبح ہر روز اسی غم میں ہمیں ہوتی ہے شام
آہ! جاگیں گے مرے کون سی اب رات نصیب

کچھ ہمیں شکوہ نہیں جور سے تیرے ہرگز
ہم ہمیشہ سے ہیں اے جان! کچھ آفات نصیب

مسجدوں میں پھرے نت سبحہ پھراتے حیراںؔ
شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب

خاکسار

محمد یار

○

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہ کنعان عزیز
ہم نے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جان عزیز

کل مجھے قتل کر اس دشمن دیں کافر نے
بولا لوگوں سے یہ تھا مرد مسلمان عزیز

کیوں نہ وہ مصحف رو، جاں سے مجھے ہووے زیاد
کس مسلماں کو نہیں دین اور ایمان عزیز

خاکسار عرش سے بھی دیکھا ہے تیرا مزاج
آپ میں آ، ذرا اپنے تئیں پہچان عزیز

خلیق

میر مستحسن

○

اشک جو چشم خوں فشاں سے گرا
تھا ستارا کہ آسماں سے گرا

آتش گل پہ جل کباب ہوا
رات بلبل جو آشیاں سے گرا

شیشۂ دل تو چور ہو جاتا
کوئی پتھر نہ آسماں سے گرا

میں نے آنکھوں سے لے لیا اس کو
پھول جو دست باغباں سے گرا

ہنس دیا یار نے جو رات خلیق
کھا کے ٹھوکر اس آستاں سے گرا

دلیر

سید امیر حسن مارہروی

○

عزت اسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے
سب کچھ بشر میں ہے جو محبت بشر میں ہے

کیا پوچھتے ہو، جوہرِ تیغِ نگاہِ ناز
یہ اس سے تیز ہے جو تمہاری کمر میں ہے

قاصد! سوالِ وصل سُنیں اور وہ چپ رہیں
کیا کیا نہ شانِ بے خبری اس خبر میں ہے

کیا جانے کس سوال کا بھیجا ہے یہ جواب
اک تیر، اک چھری، کفِ پیغامبر میں ہے

اور ایک بار قلب کو تڑپا گئے وہ نگاہ
اتنی سکت ابھی تو ہمارے جگر میں ہے

اے دل! کسی کی یاد بھی اور اضطراب بھی
اتنا نہیں خیال کہ مہمان گھر میں ہے

گھبرائے کیوں نہ کشمکشِ نزع سے دلیر
پہلا یہ اتفاق اسے عمر بھر میں ہے

دیوانہ

رائے سرب سُکھ

○

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اسے، پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پُرفن تھے، ولے
گرمیِ بزم کہاں اس بتِ عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے، یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آبنی ہمدم، میری، خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لیے یار سب اغیار ہوئے
کیونکر دیوانہ جلا رہیے اب اس یار بغیر

راسخ

حافظ عبدالرحمٰن

○

کہاں تھے شب ؟ ادھر دیکھو ! حیا کیوں ہے نگاہوں میں
اگر منظور ہے رکھ لو مجھے جھوٹے گواہوں میں

موحّد وہ ہوں گر میں سرِ وحدت کان میں کہہ دوں
مؤذن بت کدہ میں ہوں ، برہمن خانقاہوں میں

نظر مجھ سے چرا کر ، منہ چھپا کر کہتے جاتے ہیں
کہ یہ چوری بھی لکھی جائے گی تیرے گناہوں میں

سیہ کاری مری بن جائے رشکِ گیسوئے خوباں
قیامت کو چھپا بیٹھا رہوں یارب گناہوں میں

وہی راسخ تو ہیں کل تک جو مے خانے کے درباں تھے
بنے بیٹھے ہیں حضرت چار دن سے دیں پناہوں میں

راقم

خواجہ قمرالدین

○

بات کیونکر بنے امید بر آئے کیوں کر
نالہ پر شور نہیں ، آہ شرر بار نہیں

آج آتے ہیں مرے شکووں کا لینے وہ حساب
خیر ہے ، ہاتھ میں ان کے کوئی تلوار نہیں

مجھ سے نفرت سہی ، لذت کشِ آزار تو ہوں
غیر پھر غیر ہے ، وہ خوگرِ آزار نہیں

جوشِ مستی میں چلے آئے کہاں تم راقم
یہ تو مسجد ہے چلو ، خانۂ خمار نہیں

رخشاں

نواب ضیاء الدین خان

○

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا! لیجیو سنبھال ہمیں

شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر
گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

تیرے غصّہ نے ایک دم میں کیا
مردۂ صد ہزار سال ہمیں

دل میں مضمر ہے معنیٔ باقی
کسی صورت نہیں زوال ہمیں

طالعِ بد سے نیّرِ رخشاں
اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

رسا رامپوری

○

ساقی جو دئے جائے یہ کہہ کر کہ پیے جا
تو مَیں بھی پیے جاؤں یہ کہہ کر کہ دیے جا

جانے کی جو ضد ہے تو مجھے زہر دیے جا
اتنا تو کہا مان لے اتنا تو کیے جا

کچھ اور نہ کر مجھ پہ جفائیں تو کیے جا
کچھ اور نہ لے میری دعائیں تو لیے جا

کیا لذّتِ تعزیر نے مجبور کیا ہے
آتا ہے یہی جی میں کہ تقصیر کیے جا

کم بخت رسا تیری رسائی نہیں ان تک
تو خوب سا اسلام کو بدنام کیے جا

رشکؔ

میر علی اوسط

○

جو رنج نوشتہ ہیں ہے کیونکر نہ ملے گا
لکھوائیں گے نامہ، تو کبوتر نہ ملے گا

جس رات نقاب اس مہ کامل نے اُلٹ دی
تاروں کو نشانِ مہ انور نہ ملے گا

ابرِ شب فرقت ہے بندھے آنسوؤں کا تار
اس طرح کا وقت اے مژۂ تر نہ ملے گا

کاہیدگیٔ جسم اگر یوں ہی رہے گی
ہم کو بھی ہمارا تنِ لاغر نہ ملے گا

انصاف کو سمجھو خضرِ راہِ ہدایت
اے رشکؔ اب ایسا کوئی رہبر نہ ملے گا

رشکیؔ

نواب محمد علی خاں

○

غصہ آتا ہے پیار آتا ہے
غیر کے گھر سے یار آتا ہے

مے پلائی اگر نہیں منظور
ابر کیوں بار بار آتا ہے

تیرے رونے سے اب مجھے بھی ہے خوف
دیدۂ اشک بار آتا ہے

دردِ دل کیا بیاں کروں رشکیؔ
اس کو کب اعتبار آتا ہے

زکی

نواب محمد ذکریا خان

○

اسیری میں تباہی رونقِ کاشانہ ہو جائے
قفس ہی نالوں سے جل کر چراغِ خانہ ہو جائے

تغافل، سازگارِ شوقِ اہلِ درد کیا ہوگا
ادائے دو فریب ایسا کہ دل دیوانہ ہو جائے

نہ کہنا غیر سے قاصد کہ میں مطلب نہیں سمجھا
پیامِ یار ہے بے معنیٔ بیگانہ ہو جائے

نہیں کیوں حضرت موسیٰ کی بیتابی کے ہم پیرو
کہ رازِ دل زباں پر آئے اور افسانہ ہو جائے

کہاں تک ضبطِ بیتابیٔ دلِ مسکیں! مجھے ڈر ہے
تری خوئے تحمل سے وہ بے پروانہ ہو جائے

فغاں کرتے ہوئے جا پہنچو اس کی بزمِ عشرت میں
کبھی تو اے زکی یہ شوخیٔ رندانہ ہو جائے

سجاد

میر سجاد اکبر آبادی

○

دل ہو گیا پھپھولا پیارے تمام جل کے
کیا تجھ نہال سے ہوں امیدوار پھل کے

تنہا نہ دل مرے نے زلفوں سے تاب کھایا
گلشن کے بیچ سنبل کھاتا ہے تاب بل کے

ایسے ترے جھمکتے دانتوں کو دیکھ پیارے
پانی ہو جائے موتی مارے نہ کیوں کہ جھلکے

کیا جانتا تھا مجھ کو رسوا کریں گے سب میں
یہ طفل اشک میرے آنکھوں کے بیچ پل کے

سحر بھوپالی

سینہ میں دل ہے دل میں داغ، داغ میں سوز و سازِ عشق
پردہ بہ پردہ ہے نہاں پردہ نشیں کا رازِ عشق

باندھ کے صف ہوں سب کھڑے تیغ کے ساتھ سر جھکے
آج تو قتل گاہ میں دھوم سے ہو نمازِ عشق

کوہ پہ جانِ کوہکن، دشت میں جانِ قیس لی
بل بے تری چڑھائیاں اُف رے یہ ترکتازِ عشق

نام و نشاں مٹا چکے شوقِ جفا و ذوقِ جور
جان و جگر جلا چکے سوزِ دل و گدازِ عشق

پردہ میں رہ کے الحذر گوشہ میں چھپ کے الاماں
ہم کو خبر ہے ہو گیا حُسن سے سازبازِ عشق

سر کو کٹا کے لوٹ لی دولتِ وصلِ سرمدی
تیغ کے گھاٹ قطع کی ہم نے رہِ درازِ عشق

خاص خدا کا وہ مقام دل میں خدا کے اُس کا گھر
عرش سے کچھ بلند ہے درگہِ بے نیازِ عشق

فرش زمیں پہ مصطفےٰ عرشِ بریں پہ کبریا
پہنچا ہے دیکھنا کہاں سلسلۂ درازِ عشق

سلیمان

نواب سلیمان شکوہ

ساقیا! ہے یہ جام کا عالم
جیسے ماہِ تمام کا عالم

کبک رفتار اپنی بھول گئے
دیکھو اس کے خرام کا عالم

اب خدا پھر ہمیں نہ دکھلائے
شبِ ہجراں کی شام کا عالم

تجھ پہ ہے ان دنوں میں نامِ خدا
کچھ عجب دھوم دھام کا عالم

شاؔد

مہاراجہ سرکشن پرشاد

○

بادۂ خم خانۂ توحید کا مے نوش ہوں
چُور ہوں مستی میں ایسا بیخود و مدہوش ہوں

گرد پھرنے دے مجھے ساقی، یہ میرا فرض ہے
مثلِ ساغر دور میں ہوں، بادۂ سرجوش ہوں

طرزِ خاموشی مری بتلاتی ہے اس راز کو
ہوں نواسنجِ حقیقت، لاکھ میں خاموش ہوں

دردمندِ عشق ہو کر، ضبط کا خوگر ہوں میں
صورتِ سیماب ہو کر، پیکرِ خاموش ہوں

کس کی فرقت، وصل کس کا اور ہے معشوق کون
شاؔد میں اس عالمِ تکویں کا ہم آغوش ہوں

شاؔد

حکیم سیّد محمد غازی پوری

○

بلبل کو پھر چمن میں لگا لائی بوئے گل
اے کاش ہوتی گلبدنوں میں بھی خوئے گل

دل داغ داغ اس میں خیالِ خرامِ ناز
جس طرح اڑتی پھرتی ہو گلشن میں بوئے گل

عاشق ہی جب نہیں تو خزاں ہے بہارِ حسن
بلبل کے ساتھ ساتھ گئی آبروئے گل

رازِ محبت اور دلِ غنچہ، تا بہ کے
نکلے گی بو کے پردے میں ہر آرزوئے گل

لو شاؔد سیرِ گل سے بھی نفرت ہوئی انھیں
سمجھے مگر کہ بوئے محبت ہے بوئے گل

شرر

مولوی عبدالحلیم لکھنوی

○

کیا سہل سمجھے ہو، کہیں دھبا چھٹا نہ ہو
ظالم یہ میرا خون ہے رنگِ حنا نہ ہو

یارب! مجھے ہے داغِ تمنا بہت عزیز
پہلو سے دل جدا ہو، مگر یہ جدا نہ ہو

راہیں نکالتا ہے یہی سوز و ساز کی
پہلو میں دل نہ ہو تو کوئی حوصلا نہ ہو

تم اور وفا کرو، یہ نہ مانوں گا میں کبھی
اس کو فریب دو، جو تمہیں جانتا نہ ہو

کیا کیا شرر ذلیل ہوئے، آبرو گئی!
ایسا بھی عاشقی کا کسی کو مزا نہ ہو

شفق عمادپوری

○

دل تڑپ جائے نہ کیوں سُن کر فغانِ اہلِ درد
ان سے پوچھو، جو سمجھتے ہیں زبانِ اہلِ درد

ایک سے اک بڑھ کے ہے دلچسپ، دلکش، دلستاں
حالِ دل، افسانۂ غم، داستانِ اہلِ درد

یہ تو کہئے مُنہ سے اک اُف تک کسی نے کی کبھی؟
لے چکے ہیں آپ اکثر امتحانِ اہلِ درد

ہاتھ دھولے جان سے کوئی، تو جی بھر کر سُنے
جاں ستانِ اہلِ دل ہے، داستانِ اہلِ درد

کس کے آگے دردِ دل اپنا کہو گے تم شفق
کوئی دُنیا میں نہیں اب قدردانِ اہلِ درد

شوقؔ

شیخ احمد علی قدوائی

○

روح کو آج ناز ہے اپنا وقار دیکھ کر
اُس نے چڑھائیں تیوریاں میرا قرار دیکھ کر

قصدِ گلہ نہ تھا مگر، حشر میں جوشِ شوق سے
ہاتھ مرا نہ رک سکا، دامنِ یار دیکھ کر

دیکھ کے ایک بار اُنہیں دل سے تو ہاتھ دھو چکے
دیکھیے کیا گزرتی ہے دوسری بار دیکھ کر

آتے ہیں وہ تو پہلے ہی رنج سے صاف ہو رہوں
آ کے کہیں پلٹ نہ جائیں، دل میں غبار دیکھ کر

کعبے کو جا نہ شوق ابھی، نیتِ زندگی بخیر!
ہم بھی چلیں گے تیرے ساتھ اب کی بہار دیکھ کر

وصل سے گذرے اے خدا! ہاں یہ شگون چاہیے
صبح کو ہم اُٹھا کریں روئے نگار دیکھ کر

شیداؔ

مسیح الملک حکیم اجمل خاں

○

کچھ بات ہی تھی ایسی کہ تھامے جگر گئے
ہم اور جاتے بزمِ عدو میں مگر گئے

یہ تو خبر نہیں کہ کہاں اور کدھر گئے
لیکن یہاں سے دُور کچھ اہلِ سفر گئے

ارماں جو ہم نے جمع کیے تھے شباب میں
پیری میں وہ خدا کو خبر ہے کدھر گئے

رتبہ بلند ہے مرے داغوں کا اس قدر
مَیں جانوں نہیں یہ داغ مرے تا قمر گئے

رخسار پر ہے رنگِ حیا کا فروغ آج
بوسے کا نام میں نے لیا وہ نکھر گئے

دنیا بس اس سے اور زیادہ نہیں ہے کچھ
کچھ روز ہیں گزارنے اور کچھ گزر گئے

جانے لگا ہے دل کی طرف ان کا ہاتھ اب
نالے شبِ فراق کے کچھ کام کر گئے

حسرت کا یہ مزا ہے کہ نکلے نہیں کبھی
ارماں نہیں ہیں وہ کہ شب آئے سحر گئے

بس ایک ذات حضرتِ شیداؔ کی ہے یہاں
دہلی سے رفتہ رفتہ سب اہلِ ہنر گئے

صبا

لالہ کانجی مل

○

سحر جب بسترِ راحت سے وُہ رشکِ قمر اُٹھا
غلامی اُس کی میں خورشید لے تیغ و سپر اُٹھا

ابھی تسکیں ہوئی تھی اک ذرا فریاد و زاری سے
لگا دِل مضطرب ہونے کہ پھر دردِ جگر اُٹھا

گلے پر میرے خنجر پھیرتا وہ اَور بھی لیکن
ہوئی مجھ سے خطا اتنی کہ میں فریاد کر اُٹھا

نہیں معلوم اے یارو صبا کے دل میں کیا آیا
ابھی جو بیٹھے بیٹھے وُہ یکایک آہ کر اُٹھا!

صفیر

سیّد فرزند احمد بلگرامی

○

شگفتہ ہو کے بیٹھے تھے وہ اپنے بے قراروں میں
تڑپ بجلی کی پیدا ہو گئی پھولوں کے ہاروں میں

کیا اندھیر اپنے رنج نے، ان کی کدورت نے
بجھی شمعِ محبت ہائے دو دل کے غباروں میں

شبِ فرقت کو زاہد سے سوا مر مر کے کاٹا ہے
کرے مشہور ہم کو بھی خدا شب زندہ داروں میں

یہ کس نے کشتۂ تیغِ تبسم کر دیا مجھ کو
مبارک باد کا غُل ہو رہا ہے سوگواروں میں

وہ عشرت جس کا ساماں ہے دِل میں، ہو نہیں سکتی
مری مجبوریوں کو دیکھیے ان اختیاروں میں

ہمیں وہ ڈھب جو آجاتا، تمہیں پر آزماتے ہم
دلِ عشاق تم کیا کہہ کے لیتے ہو اشاروں میں

صفیر اب بس کرو! کب تک سرِ شوریدہ زانو پر
غزل کی فکر کیونکر ہو سکے گی انتشاروں میں؟

ضیاؔ

میر ضیاء الدین

○

دل رُبا ہے مرا بڑا گُستاخ
مَیں نے اتنا نہ سمجھا تھا گستاخ

اب تو وہ شوخیاں لگا کرنے
یک بیک ایسا ہوگیا گُستاخ

ناز بے جا کبھی نہ کرتا تھا
یک بیک ایسا ہوگیا گستاخ

جاں فشانی ہم اس پہ کرتے ہیں
رام ہرگز نہ وُہ ہُوا گُستاخ

اے ضیاؔ کیجو سمجھ کے کلام
وہ صنم تو ہے بے وفا گستاخ

صنعت

شیخ کریم الدین مراد آبادی

○

وصل کی شب میں بھی ہم باہمدگر رویا کیے
مَیں جُدائی سے وہ میرے حال پر رویا کیے

اُس نے زانو غیر کا اپنے رکھا جب زیرِ سر
اپنے زانو پہ ہم اپنا رکھ کے سر رویا کیے

اُس نے آنسو غیر کے پونچھے جب اپنے ہاتھ سے
ہمنشیں! یہ ماجرا ہم دیکھ کر رویا کیے

ہو گیا مشکل مری مژگاں سے مژگاں کا ملاپ
حائل اک دریا ہُوا، ہم اس قدر رویا کیے

سُرخرو بے آبروئی میں بھی ہم صنعتؔ رہے
خشک جب آنسو ہوئے، لختِ جگر رویا کیے

طاہر

فرخ آبادی

○

اب کیا میں حسینوں سے ہم گوشہ گیر ہیں
غارت گروں نے لوٹ لیا ہے فقیر ہیں

خالق بچائے زہرہ جبینوں کی چاہ سے
سنتے ہیں دو فرشتے ابھی تک اسیر ہیں

چار آنکھیں ہم نے کی ہیں تو غصہ نہ کیجیے
سائل نہیں، فقیر نہیں، راہ گیر ہیں

در پہ تمہارے بیٹھے ہیں، سر پر ہے آفتاب
ہم خاکسار مالکِ تاج و سریر ہیں

وہ بھی تو روئیں اے اثرِ گریہ ایک دن
جن کی نگاہ میں مرے آنسو حقیر ہیں

کہہ دیں گے صاف صاف وہ دیکھیں تو آئنہ
یہ مانگ ہے لکیر ہم اس پر فقیر ہیں

نظروں سے کیا گرائیں گے طاہر عدو مجھے
فضلِ خدا سے دستِ خدا دستگیر ہیں

عاجز

عارف الدین خان

○

عرق جب اس پری کے چہرۂ پُر نور سے ٹپکے
خجل ہو گل سے شبنم، جُوں لہو ناسور سے ٹپکے

مری آنکھوں سے خوں میں اشک یُوں گرتے ہیں پلکوں پر
لہو سُولی کے اوپر جُوں سرِ منصور سے ٹپکے

اگر کیفِ سخن میرا نہالِ تاک کو پہنچے
صراحی شاخ بن جاوے، شراب انگور سے ٹپکے

اگر اس زلفِ مشک آمیز سے چینی میں بال آوے
عجب نہیں عطر و عنبر کاسۂ فغفور سے ٹپکے

کروں فریاد رو رو یار کو جب یاد کر عاجز
دمِ اسرافیل کا لوہو ہو بانگِ صور سے ٹپکے

عارف

حکیم نواب جان خان

○

ملتفت کب نگاہِ ناز نہیں
دل ہی خود نیشتر نواز نہیں

جانتا ہوں تری نگاہ کو میں
اور پھر آشنائے راز نہیں

ہائے وہ دل! کہ بے قرارِ خلش
وائے وہ سر! کہ سرفراز نہیں

آ، بتاؤں تجھے میں راز کی بات
راز یہ ہے کہ کوئی راز نہیں

اب یہ عالم ہے تیرے حسن کی خیر!
ہوش و مستی میں امتیاز نہیں

واقفِ رازِ ہر دو عالم ہوں
کیا کروں حکمِ شرحِ راز نہیں

آؤ! مسجد میں پڑھ رہیں عارف
درِ مے خانہ آج باز نہیں

عبرت

اکبر حسین موہانی

○

دل ہے، نہ نشان بے دلی کا
کیا وقت پڑا ہے بے کسی کا

دیکھا کیے راستہ کسی کا
تھا شغل یہ اپنی زندگی کا

پروائے کرم، نہ شکوۂ غم
اللہ رے دماغ! بے دلی کا

ہیں اور یہ بے نیازیِ شوق
احسان ہے جوشِ بے خودی کا

مرنا، مرنے کی آرزو میں
حاصل ہے یہ اپنی زندگی کا

آنسو بھر آئے، دل بھر آیا
گر نام بھی سن لیا خوشی کا

آخر عبرت نے جان دے دی
کچھ پاس کیا نہ بے کسی کا

قدرت

شاہ قدرت اللہ

○

...کی نیرنگی یہ برقِ خاطرِ مایوس ہے
جو شرر دل سے اُٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے

...طاقت تو کبھی کے کوچ یاں سے کر گئے
اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے

...کو اپنے ہوا داروں سے ہے کاوش مدام
ہر طپش یاں شمع کی برقِ دلِ فانوس ہے

ق

...دیں اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
کیا ہے ملکِ روم کیا ہی سرزمینِ طوس ہے

...تیر ہو، تو کیا حسرت سے کیجے زندگی
اس طرف آوازِ طبل اور ادھر صدائے کوس ہے

...سے تا شام ہوتا ہوے گلگوں کا دور
شب جو آئی تو ماہ رویوں سے کنار و بوس ہے

...ری عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے

...ئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف
جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے

...ں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

...تو ان سے کر جاہ و حشمت دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت افسوس ہے

...ی پردہ کے یہ سب سمجھے تو ہیں الاپ
گر صدائے بانگ ہے در نغمۂ ناقوس ہے

کل تو قدرت پائے غم رکھے تھی تسبیح ریا
آج رہن جام ہے، یہ خرقۂ سالوس ہے

قلقؔ

آفتاب الدولہ لکھنوی

○

ادا سے دیکھ لو، جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

وہ ظلم کرتے ہیں مجھ پر، تو لوگ کہتے ہیں
خدا برے سے نہ ڈالے معاملہ دل کا

پھرا جو کوچۂ قاتل سے کوئی پوچھیں گے
سنا ہے لٹ گیا رستے میں قافلہ دل کا

ہزار فصلِ گل آئے جنوں! وہ جوش کہاں
گیا شباب کے ہمراہ ولولہ دل کا

بہار آتے ہی کنجِ قفس نصیب ہوا
ہزار حیف کہ نکلا نہ حوصلہ دل کا

الٰہی خیر ہو! کچھ آج رنگ بے ڈھب ہے
ٹپک رہا ہے کئی دن سے آبلہ دل کا

خدا کے ہاتھ ہے اب اپنا اے قلق انصاف
بتوں سے حشر میں ہوگا مقابلہ دل کا

فدوی لاہوری

○

ٹلتے ہیں کوئی، ہاتھ چلے یا زباں چلے
ہم داد خواہ ساتھ ہیں اس کے، جہاں چلے

کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیر آہ سے
یہ، یہ ہی تیر ہے کہ سدا بے کماں چلے

سر پہ تو دھر کے نعش ہماری کو تا مزار
ہر اک قدم پہ روتے ہوئے خونفشاں چلے

لائے تھے سر پہ دھر کے کس اخلاص سے ہمیں
بس آنکھ اوجھل ہوتے ہی اے دوستاں چلے

یاروں نے اپنی راہ لی فدوی ہمیں رہے
وہ چیز اب کہاں ہے کہ پوچھے کہاں چلے

فراق

ثناء اللہ

○

غیر کے دل میں نہ جا کیجیے گا
میری آنکھوں میں رہا کیجیے گا

کاسۂ چشم کو لے در پہ ترے
بے نوا یا نہ صدا کیجیے گا

زائران حرم و دیر کبھو
میرے حق میں بھی دعا کیجیے گا

وائے اس اپنی سیہ بختی پہ
خواہشِ زلفِ رسا کیجیے گا

فقیر

میر شمس الدین

○

درد مندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے
تیری مجلس میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے

ہے غرض دید سے، یاں کام تکلف سے نہیں
خواہ اِدھر بیٹھ گئے، خواہ اُدھر بیٹھ گئے

دیکھا ہووے گا مرے اشک کا طوفاں تم نے
لاکھ دیوار گرے، سینکڑوں گھر بیٹھ گئے

کس نظرباز نے اس باز کو بخشی پرواز
سینکڑوں مرغِ ہوا پھاند کے پر بیٹھ گئے

کم ہے آواز ترے کوچہ کے باشندوں کی
نالہ کرنے سے گلے ان کے مگر بیٹھ گئے

مفت اُٹھنے کے نہیں یار کے کوچے سے فقیر
جب کہ بستر کو جما، کھول کمر بیٹھ گئے

قدر

سید غلام حسین بلگرامی

○

ہوئے کارواں سے جدا جو ہم، رہِ عاشقی میں فنا ہوئے
جو گرے تو نقشِ قدم بنے جو اُٹھے تو بانگِ درا ہوئے

جو ہوائے زلف بکھر گئی، نظر ان کی صاف بدل گئی
جو اسیرِ حلقۂ ناز تھے، وہ قتیلِ تیغِ ادا ہوئے

ہُوا بعدِ وصل عجب مزا کہ خموش بیٹھے جدا جدا
ہمہ تن میں صبر و سکوں ہُوا، ہمہ تن وہ شرم و حیا ہوئے

اُٹھے ہم جو خوابِ خیال سے لگے تکنے دیدۂ حال سے
کہ وہ کب اُٹھے، وہ کدھر گئے، ابھی پاس تھے، ابھی کیا ہوئے

جو نگہ ہے چشمِ سیاہ میں، وہی برقِ طور ہے راہ میں
تری آنکھ پر جو فدا ہوئے، وہ شہیدِ راہِ خدا ہوئے

بنے قدر ایسے غبار ہم، ہوئے گردشوں میں وہ خوار ہم
کہ مثالِ دائرۂ فلک، جو اُٹھے تو بے سروپا ہوئے

عشق عظیم آبادی

○

ہم نے تو خاک بھی دیکھا نہ اثر رونے میں
عمر کیوں کھوتے ہو، اے دیدۂ تر رونے میں

رات کب آئے تم اور کب گئے، معلوم نہیں
جان! اتنی نہ رہی ہم کو خبر رونے میں

جب تلک اشک تھمیں، بیٹھ! اگر آیا ہے
تیری صورت نہیں آتی ہے نظر رونے میں

تجھ کو اے دیدۂ تر شغل ہے رونا لیکن
ڈوبا جاتا ہے یہاں دل کا نگر رونے میں

عالمِ عشق میں مجنوں بھی بڑا گاڑھا تھا
یار مجنوں سے بھی ہم گاڑھے ہیں پر رونے میں

عظیم

مرزا عظیم بیگ

○

کل چشم خوں فشاں سے گلزار پیرہن تھا
دامن کا تھا جو تختہ، یک تختۂ چمن تھا

کیجو عظیم کو بھی یا رب غریقِ رحمت
آوارۂ جنوں سا اک صاحبِ سخن تھا

اور معنی بند ایسا، ہندی زباں کا صاحب
ہندوستان سے لے کر مشہور تا دکن تھا

اک دن جو گھر سے نکلا خطِ شعاع آسا
بکھرا ہوا بدن پر ہر تارِ پیرہن تھا

دیکھا جو دفن کرتے جوں شمع پر ہو فانوس
تربت میں دور تن سے بالشت بھر کفن تھا

گستاخ

کرامت اللہ خاں رامپوری

○

ساغر میں شکلِ دخترِ رز کچھ بدل گئی
خم سے نکل کے نور کے سانچے میں ڈھل گئی

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو مے کدے سے تو دنیا بدل گئی

کہتی ہے نیم وا یہ چمن کی کلی کلی
فریادِ عندلیب کلیجہ مسل گئی

ساقی ادھر اٹھا تھا ادھر ہاتھ اٹھ گئے
بوتل سے کاگ اڑا تھا کہ رندوں میں چل گئی

انگڑائی لے کے اور بھی وہ سوئے چین سے
پھولوں کی پنکھیا جو نسیم آ کے جھل گئی

دامن میں دخترِ رز نے لگایا ضرور داغ
جس پارسا کی گود میں جا کر مچل گئی

گھبرا کے بولے نامۂ گستاخ تو نہیں
جب ان کے پاس کوئی ہماری غزل گئی

کمال

شاہ کمال الدین

○

جوں قدم یار نے گھر سے مرے در پہ رکھا
سر رکھا زانو پہ میں، ہاتھ جگر پر رکھا

ہم کو صیاد نے رکھا جو قفس میں تو آہ
ست شفقت کبھی ظالم نے نہ سر پہ رکھا

نگ رہ اس کی گلی کا جو کوئی ہاتھ آیا!
ل گل میں نے اٹھا کر اسے سر پر رکھا

ٹھے بیٹھے تجھے کون آگیا یاد آج کمال!
نے رومال جو لے دیدۂ تر پہ رکھا

گویاؔ

نواب فقیر محمد خان

○

اس کو غفلت پیشہ کہہ آتے ہیں ہم
بھول جانا یاد دلواتے ہیں ہم

ضعف سے رہتا ہے اب پاؤں پہ سر
آپ اپنی ٹھوکریں کھاتے ہیں ہم

دل نہیں اس بت کی الفت چھوڑتا
ناسمجھ کو لاکھ سمجھاتے ہیں ہم

ہے جنازہ اس لیے بھاری مرا
حسرتیں دل کی لیے جاتے ہیں ہم

بارِ عصیاں سر پہ ہے گویاؔ بہت
کیا اٹھائیں سر، جھکے جاتے ہیں ہم

مائلؔ

مرزا محمد یار بیگ

○

اختر سے تھے گر موتی اس کان کے بالے کے
اک چاند بھی جھمکے تھا جھرمٹ میں دوشالے کے

فانوس میں کب دیکھا یوں شمع کے شعلے کو
جھمکے ہے بدن اس کا جوں کرتے ہیں والے

جوں کان میں ہے تیرے یہ موتیوں کا بالا
کب گرد ستارے ہیں یوں چاند کے ہالے کے

وہ زلف جو ڈس جاوے تو ناگ سے بچے کا
بچتے ہیں کہیں مائلؔ کاٹے ہوئے کالے کے

محب

شیخ ولی اللہ

○

اس بت نے گلابی جو اُٹھا مُنہ سے لگائی
شیشے میں عجب آن سے جھمکے تھی خدائی

عالم میں نشے کے شب مہتاب نے تیرے!
خورشید سے مکھڑے نے طلسمات دکھائی

گو غیر سے ملنے کی قسم کھاتے ہو پیارے
چھپتی نہیں وہ بات جو ہو دل سے بنائی

واللہ! ہمیں عشق کی سب بھولی ہوئی چال
کافر تری رفتار نے پھر یاد دلائی!

ہر دم تو بھرا شیشہ جھکاتا ہے نشہ میں
ڈرتا ہُوں کہ تیری نہ مڑک جائے کلائی

آئینہ نمد پوش ہُوا عشق میں تیرے
چار ابروؤں کی لے کے فقیرانہ صفائی

ہم جھوٹ کہیں تو نہ ہو دیدار خُدا کا
ہے روز قیامت، تری اک شب کی جُدائی

عاشق کو محب سلطنت ہر دو جہاں ہے
گر یار کے کوچہ کی میسّر ہو گدائی!

محنت

مرزا حسین علی

○

ناصح! یہ نصیحت نہ سُنا، مَیں نہیں سُنتا
بک بک کے مرا مغز نہ کھا، میں نہیں سُنتا

احوال مرا دھیان سے سُنتا تھا، و لیکن
کچھ بات جو سمجھا، تو کہا، مَیں نہیں سُنتا

اُس بت نے جو غیروں پہ کیا لُطف تو یارو!
مجھ سے نہ کہو بہر خُدا، مَیں نہیں سُنتا

کچھ ذکر میں ذکر اپنا میں لایا تو وہ بولا
بس بات کو اتنا نہ بڑھا مَیں نہیں سُنتا

شکوے ہی کرتا ہے جو کوئی اس سے مرا ذکر
تو کہتا ہے ہر اک کا گلہ مَیں نہیں سُنتا

محنت مجھے ہے یہ ضعف کہ کچھ اپنی حقیقت
کہتا ہے وُہ مجھ سے، تو ذرا میں نہیں سُنتا

محوی

مولوی محمد حسین لکھنوی

○

صلائے عام ساقی ہے کہ آؤ باصفا کر دوں
فنا کی مے پلا کر مست و مدہوشِ بقا کر دوں

تمنائے وصالِ یار ہے تفریحِ روحانی!
جو قابو ہو تو اپنی جان و دل تم پر فدا کر دوں

مری رنگیں بیانی منحصر ہے ذکرِ جاناں پر
مضامیں معرفت کے جس طرح چاہوں ادا کر دوں

ستم ہے، سر جھکا کر، مسکرا کر یار کا کہنا!
ملے خونِ دلِ عاشق تو میں ترکِ حنا کر دوں

خیالِ غیر سے نفرت دلِ عاشق کو لازم ہے
محبت ان کی کہتی ہے کہ ترکِ ماسوا کر دوں

صدائے نالۂ پیہم، نوائے صور ہے گویا
کہو تو میں ابھی ہنگامۂ محشر بپا کر دوں

تمہیں آئینۂ وحدت میں دیکھو شانِ محبوبی
میں اے محوی یہ عقدہ راز کا کس طرح وا کر دوں

مروّت

صغیر علی

○

کیوں تُو نے وا کیا تھا بندِ قبا چمن میں
اُڑتی پھرے ہے بلبل گل سے خفا چمن میں

ہر سمت اب صبا جو پھرتی ہے خاک اُڑاتی
بلبل کے پر پڑے ہیں کیا جا بجا چمن میں

نرگس کی آنکھ تجھ پر پڑتی ہے بے طرح سی
مت وقتِ شام جانا بہرِ خدا چمن میں

جُوں لالہ داغِ دل یاں پھر جل اُٹھا ہے شاید
جاتا ہے سیر کرنے وہ بے وفا چمن میں

جب پنا گل نے پھاڑا بلبل تُو نے مروّت
کیوں اپنے غم کا قصہ تو نے کہا چمن میں

مضطر

حکیم اسد علی خان

○

تیری نگاہِ ناز جو ناوک اثر نہ ہو
تکلیفِ چارہ سازیٔ زخمِ جگر نہ ہو

مجھ سے بھی کچھ سوا ہے انہیں میری آرزو
یہ شوق وہ نہیں جو ادھر ہو، اُدھر نہ ہو

میں اور مجھ کو وعدۂ دیدار کی امید
وہ چاہتا ہوں آج کہ جو عمر بھر نہ ہو

اے برقِ حسنِ یار ذرا چشم التفات
یوں جل بجھوں کہ مجھ کو بھی میری خبر نہ ہو

کعبہ میں ہے نشاں نہ کہیں دیر میں پتہ
تیری گلی میں مضطر آشفتہ سر نہ ہو

معروف

مرزا الٰہی بخش

○

آہ! وہ کون تھا خدا مارا
جس نے اس سے مجھے لگا مارا

ایک ہے تو بھی بد بلا اے چشم!
دل کو پھر زلف میں پھنسا مارا

کیا غضب تھی وہ جنبشِ ابرو
صاف جس نے کہ نیچا مارا

بعدِ مدت ملے تھے کل ان سے
آج لوگوں نے پھر لڑا مارا!

وصل کی شب بھی میں نہ سویا آہ
شبِ ہجراں کے خوف کا مارا

مقتولؔ

مرزا ابراہیم بیگ

○

بتاں جب کہ زلفِ دوتا باندھتے ہیں
گرہ میں دلِ مبتلا باندھتے ہیں

نہیں بنتی بلبل سے اپنی چمن میں
ہم اب آشیانہ جدا باندھتے ہیں

جفا کھینچیں گے پر نہ ہاریں گے جی کو
یہ ہم تم سے شرطِ وفا باندھتے ہیں

ق

گرہ دے کے سر پر جو بالوں کا جوڑا
یہ نازک بدن خوش ادا باندھتے ہیں

ہر اک تار میں اس کے دل ہائے عشاق
ہم جمع کر کے ملا باندھتے ہیں!

میاں حالِ مقتولؔ دیکھا نہیں کیا
کمر آپ کس پر چلا باندھتے ہیں!

ہمتؔ

میر قمر الدین

○

مدعی اس سے سخن سازیہ سالوسی ہے
پھر تمنا کو یہاں مژدۂ مایوسی ہے

میری ہی طرح جگر خوں ہے ترا مدت سے
اے حنا! کس کی تجھے خواہشِ پابوسی ہے

آہ اے کثرتِ داغِ غمِ خوباں! کہ مدام
صفحۂ سینہ پُر از جلوۂ طاؤسی ہے

تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھ کو ہمتؔ
ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تو اک خو سی ہے

منتظر

میاں نور الاسلام

○

امید ہے کہ مجھ کو خدا آدمی کرے
پر آدمی کرے تو بھلا آدمی کرے

اس طرح وہ فریب سے دل لے گئے مرا
جس طرح آدمی سے دغا آدمی کرے

بھاویں نہیں کچھ اس کے نکلتی ہے اپنی جان
کیا ایسے بے دغا سے وفا آدمی کرے

مارا ہے کوہ کن نے سر اپنے پہ تیشہ آہ
دل کو لگی ہو چوٹ تو کیا آدمی کرے

گر کچھ کہا بگڑ کے میں، بس اس نے ہنس دیا
کیا ایسے آدمی کا گلا آدمی کرے!

گزرا میں ایسی چاہ سے یا چند ہم نشیں!
بیٹھا کسی کے سر کو لگا آدمی کرے

ہے عشق بد مرض کوئی جاتا ہے منتظر
کیا خاک اس مرض کی دوا آدمی کرے

منیر

سید اسمٰعیل حسین شکوہ آبادی

○

آمد تصورِ بتِ بیداد گر کی ہے
دل کی بھی لوٹ خانہ خرابی جگر کی ہے

تقدیر کی کجی ہو کہ ٹیڑھا ہو آسماں
یہ سب عنایت آپ کی ترچھی نظر کی ہے

اک بار تیر مار کے اب تک خبر نہ لی
یارب نگاہ مست یہ کس بے خبر کی ہے

یہ رنگ و بو کہاں گلِ تر کو نصیب تھا
اتری ہوئی قبا کسی رشک قمر کی ہے

پھر بھی کبھی نگاہِ کرم ہوگی اس طرف
امید آج تک اسی پہلی نظر کی ہے

مہر

مرزا حاتم علی

○

گریباں ہاتھ میں ہے پاؤں میں صحرا کا دامن ہے
بس اب پاؤں ہیں اپنے اور سرِ خارِ مغیلاں ہے

ہوائے وحشتِ ہم کو لے اُڑتی ہے بستی سے
ہمارا عنصرِ خاکی مگر ریگِ بیاباں ہے

سبق کو دیکھتا ہوں رات بھر اور پھر اُلجھتا ہوں
مطوّل، مختصر، وہ شرحِ شعرِ زلفِ پیچاں ہے

جلاتا ہے یہ پروانوں کو وصفِ شعلہ رویاں ہے
زبانِ خامہ بھی اب تو زبانِ شمعِ سوزاں ہے

نہ کیوں ہر طرز میں پڑھتا غزل اس ماہ کے آگے
مرا استادِ کامل مہرِ ناسخ سا سخنداں ہے

ناظم

نواب محمد یوسف علی خان والیٔ رامپور

○

مَیں نے کہا کہ دعویٔ الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

تاثیرِ آہ و زاریٔ شبہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبولِ دُعائے سحر غلط

سوزِ جگر سے ہونٹ پہ بتخالہ افترا
شورِ فغاں سے جنبشِ دیوار و در غلط

اں سینے سے نمائشِ داغِ دروں دروغ
ہاں آنکھ سے تراوشِ خونِ جگر غلط

آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجیے
عشقِ مجاز و چشمِ حقیقت نگر غلط

بوس و کنار کیلئے یہ سب فریب ہیں
اظہارِ پاکبازی و ذوقِ نظر غلط

کہنا ادا کو تیغ، خوشامد کی بات ہے
سینے کو اپنے اس کی سمجھنا سپر غلط

شمع میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سوز دی
جانِ عزیز پیشکش نامہ بر غلط

پوچھو تو کوئی مر کے بھی کرتا ہے کچھ کلام
کہتے ہو جان دی ہے سرِ رہگزر غلط

ہم پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا
مرنے کی اپنے روز اڑائی خبر غلط

آیت نہیں حدیث نہیں جس کو مانیے
ہے نظم و نثرِ اہلِ سخن سر بسر غلط

یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا
یہ کیوں کہا کہ دعویٔ الفت مگر غلط

نثار

محمد امان

○

کیا جانے پھلکاری اس گل کی پھبن کا تھا
جو تختۂ دامن تھا، تختہ وہ چمن کا تھا

ہم آگو ہی سمجھے تھے تم گھر کو سدھاروگے
جوں صبح گجر باجا، ہاتھا وہیں ٹھنکا تھا

مینا میں نہ ہو جلوہ وہ بادۂ گلگوں کا
جامہ میں جو کچھ یارو! رنگ اسکے بدن کا تھا

نرگس کو کیا ایسا بیمار ان آنکھوں نے
ڈھلکا ہی نظر آیا گردن کا جو منکا تھا

ندرت

شعیب احمد میرٹھی

○

نالۂ دل کی صدا، دیوار میں ہے در میں ہے
صور یا محشر میں ہوگا، یا ہمارے گھر میں ہے

یوں تو مرنے کو مروں گا میں، مگر مٹی مری
یا فلک کے ہاتھ میں، یا آپ کی ٹھوکر میں ہے

میں پریشاں ہو کے نکلوں گا، تو اُن کی بزم سے
میری بربادی کا ساماں ہے، تو اُنکے گھر میں ہے

وہ اگر دیکھیں تو اب حالت سنبھلتی ہے مری
وہ اگر پوچھیں تو، اب مجھ کو شفا دم بھر میں ہے

یہ نہیں موقع ہنسی کا، تم نظر بدلے رہو
اب قضا میری، اسی بگڑے ہوئے تیور میں ہے

دے دے چلو میں اکٹھی کر کے اے ساقی مجھے
کچھ ابھی تو خم میں ہے، شیشے میں ہے، ساغر میں ہے

نقد جاں لینے کو مقتل میں قضا ندرت مری
بن کے دلہن رونما آئینۂ خنجر میں ہے

نظرؔ

نوبت رائے لکھنوی

کاروبارِ عشق کی کثرت کبھی ایسی نہ تھی
دل نہ تھا تو تنگیٔ فرصت کبھی ایسی نہ تھی

یاس سے ویرانیٔ حسرت کبھی ایسی نہ تھی
دل میں سناٹا نہ تھا، وحشت کبھی ایسی نہ تھی

ان کے وعدہ پر ہمیں جینا پڑا ہے حشر تک
ورنہ طولانی شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی

دیکھ ڈالے زندگی میں وصل و فرقت کے طلسم
غم کبھی ایسا نہ تھا راحت کبھی ایسی نہ تھی

آپ نے بیمار پرسی کی تو جینا ہے وبال
ورنہ مرنے کی مجھے حسرت کبھی ایسی نہ تھی

بامزہ ہے کس قدر انکار اُن کا وصل میں
تجھ میں اے خونِ جگر لذت کبھی ایسی نہ تھی

دل کو کیا سمجھا دیا نومیدیٔ جاوید نے
پردہ دارِ غم شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی

زندگی کی کش مکش سے مر کے پائی کچھ نجات
اس سے پہلے اے نظرؔ فرصت کبھی ایسی نہ تھی

نواؔ

ظہور اللہ بدایونی

اب اشک تو کہاں ہے جو چاہوں ٹپک پڑے
آنکھوں سے وقتِ گریہ مگر خوں ٹپک پڑے

پہنچی جو کُنہ تک جھلک تیرے دانتوں کی گوش تک
خجلت سے آب ہو دُرِ مکنوں ٹپک پڑے

طغیانِ سرشک کا تو یہاں تک ہے چشم سے
اک قطرہ آب کا ہو، تو جیحوں ٹپک پڑے

ڈوبا ہے بحرِ شعر میں ایسا نواؔ کہ اب
دے طبع کو فشار تو مضموں ٹپک پڑے

نیاز

شاہ نیاز احمد بریلوی

○

عشق میں تیرے کوہِ غم سر پہ لیا، جو ہو سو ہو
عیش و نشاطِ زندگی چھوڑ دیا، جو ہو سو ہو

عشق کے مدرسے ہو، عشق کے مے کدہ میں آ
جام فنا و بے خودی اب تو پیا، جو ہو سو ہو

لاگ کی آگ لگ اٹھی، پنبہ طرح سا جل گیا
رختِ وجودِ جان و تن، کچھ نہ بچا، جو ہو سو ہو

ہجر کی سب مصیبتیں عرض کیں اس کے روبرو
ناز و ادا سے مسکرا کہنے لگا، جو ہو سو ہو

دنیا کے نیک و بد سے کام ہم کو نیازؔ کچھ نہیں
آپ سے جو گذر گیا، پھر اسے کیا، جو ہو سو ہو

واقف

شاہ واقف

○

روزِ خزاں چمن میں جو دیکھا ہزار کے
اک مشت پر پڑے تھے تلے شاخسار کے

یاران ہم نشین و رفیقانِ دوست دار
سب آشنا ہیں زندگیِ مستعار کے

جب مُند گئی یہ آنکھ تو اے دوست بعدِ مرگ
پھٹکے ہے پاس کون کسی کے مزار کے

جو نقش پا ہے سو رہے پھر نہ اُٹھ سکے
واقفؔ کی طرح ہائے گرے کوئے یار کے

وحید الہ آبادی

آئینے پہ جلوۂ دیدار کے دکھلانے کو
پھونک دے برقِ تجلی مرے کاشانے کو

دیکھیے! کون سی جا، یار کا ملتا ہے پتہ
کوئی کعبے کو چلا ہے، کوئی بت خانے کو

تیری فرقت میں تصور ہے یہ بے دردی کا
خواب ہم جانتے ہیں نیند کے آجانے کو

بعد میرے جو ہوا دشت میں مجنوں کا گزر
رو دیا دیکھ کے خالی مرے ویرانے کو

کام آجاتی ہے ہم بزمی بھی روشن دل کی
شمع ہم رنگ بنا لیتی ہے پروانے کو

آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اُداس
کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

اے جنوں تنگ ہوئی وسعتِ صحرا تجھ سے
اب کہاں جائے طبیعت کوئی بہلانے کو

گل پہ بلبل تھا کہیں شمع پہ پروانہ تھا
ہم نے ہر رنگ میں دیکھا ترے پروانے کو

وا شدِ دل نہ ہوئی، غنچۂ خاطر نہ کھلا
کون سے باغ میں آئے تھے ہوا کھانے کو

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دُور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

وفا

حکیم عبدالہادی خان رامپوری

پھر رگِ شعلۂ جاں سوز میں نشتر گزرا
نالہ کیوں آبلۂ دل سے اُلجھ کر گزرا

میں ہوں دلداریٔ افسونِ وفا پر نازاں
جو رقیبوں پہ نہ گزرا تھا، وہ مجھ پہ گزرا

کیا محیطِ بے رنگ میں طوفاں آیا
جوشِ رنگ انجمنِ ناز سے باہر گزرا

تشنۂ حسرتِ جاوید ہوں میں کیا جانوں
کیوں گلے سے میرے تلخابۂ کوثر گزرا

آؤ! میرے دلِ افسردہ کی تسکین دیکھو
جاؤ! اس کشمکشِ ناز سے میں در گزرا

لٹ گئی جان تو امید کے پہلو ڈھونڈے
مٹ گئی راہ تو اندیشۂ رہبر گزرا

اس تکلف سے کٹی عمرِ گراں مایہ وفا
ایک دم سینکڑوں برسوں کے برابر گزرا

ولاؔ

مظہر علی خان

○

ہرگز نہ گریں اس سے اشکِ اثر آلودہ
ہووے نہ کبھی خوں سے جو چشم تر آلودہ

ازبسکہ کلیجے کے ٹکڑے ہوئے گرتے ہیں
آنکھوں سے مرے آنسو لختِ جگر آلودہ

واں رشکِ چمن اس نے گھر اپنا کیا ہے یاں
رشکِ جگری سے ہے دیوار و در آلودہ

اِک پل میں گذر جاوے نہ چرخ بریں سے بھی
ہوتی ہے بڑی ظالم، آہ اثر آلودہ

بخش اپنے ولاؔ کو بھی از راہِ کرم یارب
ہرچند گنہ سے ہے وہ سر بسر آلودہ

ہادیؔ

میر محمد جواد

○

رہ رہ کے سخن کہنا ہر بار بہت تحفہ
ہیں لب تو میاں لب ہی گفتار بہت تحفہ

ہر پاؤں کی ٹھوکر میں جو دل پڑے تڑپے ہیں
پھر ان دنوں سیکھے ہو رفتار بہت تحفہ

خورشید کا یوں چہرہ زرتار تو ہے لیکن
ہے سر پہ تری سادی دستار بہت تحفہ

اک بوسہ پہ دل ٹھہرا تس پہ وہ نہیں لیتا
اک سہل سی قیمت پہ تکرار بہت تحفہ

ہم مر چکے، پر اُس نے دل کی نہ خبر پوچھی
ہم کو بھی ملا ہے یاں دلدار بہت تحفہ

ہاشمی

میر ہاشمی

○

مرا سو بار اس تک نامۂ پُر آرزو پہنچا
پہ اُدھر سے جواب صاف پہنچا جب کبھو پہنچا

کیا افشا تمہیں نے راز عشق اے دیدۂ گریاں
بہ گوش خلق ورنہ کس طرح بے گفتگو پہنچا!

دماغ آشفتہ ہوتا ہے صبا! نکہت سے سنبل کی!
مشامِ آرزو میں تو کسی کاکل کی بو پہنچا

ابھی چھوٹا ہے موجِ اشک کی زنجیر سے تو ہی
کہ پھر گوشِ دلِ دیوانہ تک آوازۂ ہُو پہنچا

یہ دعوے سب کے باطل تھے میں ہاشمی ہو گے
اگر حاکم تلک وہ شیخ بار آوے تو کو پہنچا

ہجر

نواب ناظم علی خان شاہجہانپوری

○

دیکھا انہیں تو اپنی طبیعت سنبھل گئی
آنکھوں میں ہو کے دل کی تمنا نکل گئی

میں اور تم سے وصل کی خواہش خفا نہ ہو
اک بات بیخودی میں زباں سے نکل گئی

تم نے کرم کیا، یہ تمہارا کرم ہوا
تم نے نکال دی، مری حسرت نکل گئی

انصافِ جورِ یار یہیں ہو، تو خوب ہے
پھر لطف کیا، جو بات قیامت پہ ٹل گئی

یا کوئی جان بوجھ کے انجان بن گیا
یا پھر یہی ہوا، مری صورت بدل گئی

اگلا سا میں نہیں ہوں کہ تم! تو تمہیں کہو
کس کا مزاج، کس کی طبیعت بدل گئی

شرما کے پوچھنا وہ کسی کا شب وصال
اے ہجر! اب تو دل کی تمنا نکل گئی؟

ہوس

نواب مرزا محمد تقی

○

یہی کہتی تھی لیلیٰ پردہ نشیں، نہیں کھاتی ادب سے خدا کی قسم
غم قیس سوا مجھے کچھ نہیں غم، اسی کشتۂ ناز و ادا کی قسم

رکا پایا جو لیلےٰ نے مجنوں کا جی، کہا کیوں ہو خفا مرے سر کی ہی
کہ نہ میں نے کسی سے ہے بات بھی کی، مجھے میری ہی شرم و حیا کی قسم

مرے گریہ سے جاوے ہے صبر و سکوں مرے اشکوں سے ٹپکے ہے قطرۂ خوں
ارے چین نہیں مجھے پیارے کبھوں، مجھے اس تری مہر و وفا کی قسم

شب ہجر میں اشکوں کا خون بہا، اسے دیکھ کے رنگ شفق کا اڑا
نہیں اس میں مبالغہ ایک ذرا مجھے تیرے ہی رنگِ حنا کی قسم

ترے کشتۂ غم کا ہے حال بتر، یہی کہیو جو جانا ہو تیرا ادھر
تجھے قاصدِ موجِ نسیمِ سحر، شبِ ہجر کی میری بکا کی قسم

کبھی کہتا تھا قیس غزالوں سے جا، کہو ناقہ ادھر سے کدھر کو گیا
کبھی کہتا تھا تو ہی بتا دے صبا! تجھے لیلےٰ کی زلفِ دوتا کی قسم

کبھی ساغرِ وصل نہ میں نے پیا، کبھی چاک جگر کو نہ میں نے سیا
غم و رنج و تعب کو عزیز کیا، مجھے عشق کے جور و جفا کی قسم

نہ تو پائی ہوس کبھی پھولوں کی بو، نہ تو بیٹھا ہوں میں کبھی بر لب جو
نہ تو بے کلی دل کی گئی ہے کبھو، مجھے پیارے کی اپنے وفا کی قسم

مُتغزّلینِ جدید

فیض احمد فیض

○

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

ق

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر اُونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا ساقی کا مے کا خم کا پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

○

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم

حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

○

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

○

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

○

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

○

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

اختر شیرانی

آرزوِ وصل کی رکھتی ہے پریشاں کیا کیا
کیا بتاؤں کہ مرے دل میں ہیں ارماں کیا کیا

غم عزیزوں کا حسینوں کی جدائی دیکھی
دیکھیں دکھلائے ابھی گردشِ دوراں کیا کیا

ان کی خوشبو ہے فضاؤں میں پریشاں ہر سُو
ناز کرتی ہے ہوائے چمنستاں کیا کیا

دشتِ غربت میں رُلاتے ہیں ہمیں یاد آکر
اے وطن تیرے گل و سنبل و ریحاں کیا کیا

اب وہ باتیں نہ وہ راتیں نہ ملاقاتیں ہیں
محفلیں خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا

ہے بہارِ گل و لالہ مرے اشکوں کی نمود
میری آنکھوں نے کھلائے ہیں گلستاں کیا کیا

ہے کرم اُن کے ستم کا کہ کرم بھی ہے ستم
شکوے سُن سُن کے وہ ہوتے ہیں پشیماں کیا کیا

گیسو بکھرے ہیں مرے دوش پہ کیسے کیسے
میری آنکھوں میں ہیں آباد شبستاں کیا کیا

وقتِ امداد ہے اے ہمتِ گستاخیِ شوق
شوق انگیز ہیں اُن کے لبِ خنداں کیا کیا

سیرِ گل بھی ہے ہمیں باعثِ وحشت اخترؔ
ان کی الفت میں ہوئے چاک گریباں کیا کیا

تمناؤں کو زندہ آرزوؤں کو جواں کر لوں
یہ شرمیلی نظر کہہ دے تو کچھ گستاخیاں کر لوں

بہار آئی ہے بلبل دردِ دل کہتی ہے پھولوں سے
کہو تو میں بھی اپنا دردِ دل تم سے بیاں کر لوں

ہزاروں شوخ ارماں لے رہے ہیں چٹکیاں دل میں
حیا ان کی اجازت دے تو کچھ بیباکیاں کر لوں

کوئی صورت تو ہو دنیائے فانی میں بہلنے کی
ٹھہر جا اے جوانی ماتمِ عمرِ رواں کر لوں

چمن میں ہیں بہم پروانہ و شمع و گل و بلبل
اجازت ہو تو میں بھی حالِ دل اپنا بیاں کر لوں

کسے معلوم کب کس وقت کس پر گر پڑے بجلی
ابھی سے میں چمن میں چل کر آباد آشیاں کر لوں

بر آئیں حسرتیں کیا کیا اگر موت اتنی فرصت دے
کہ اک بار اور زندہ شیوۂ عشقِ جواں کر لوں

مجھے دونوں جہاں میں ایک وہ مل جائیں گر اخترؔ
تو اپنی حسرتوں کو بے نیازِ دو جہاں کر لوں

○

وہ کہتے ہیں رنجش کی باتیں بھلا دیں
محبت کریں خوش رہیں مسکرا دیں

غرور اور ہمارا غرورِ محبت
مہ و مہر کو ان کے در پر جھکا دیں

جوانی ہو گر جاودانی تو یا رب
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں

شبِ وصل کی بے خودی چھا رہی ہے
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

بہاریں سمٹ آئیں کھل جائیں کلیاں
جو ہم تم چمن میں کبھی مسکرا دیں

عبادت ہے اک بیخودی سے عبارت
حرم کو مئے مشکبو سے بسا دیں

وہ آئیں گے آج اے بہارِ محبت
ستاروں کے بستر پہ کلیاں بچھا دیں

بناتا ہے منہ تلخیٔ مے سے زاہد
تجھے باغِ رضواں سے کوثر منگا دیں

تم افسانۂ قیس کیا پوچھتے ہو
ادھر آؤ ہم تم کو لیلیٰ بنا دیں

وہ سرمستیاں بخش اے رشکِ شیریں
کہ خسرو کو خوابِ عدم سے جگا دیں

انھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشقِ رسوا کو اختر دعا دیں

○

کون آیا ہے مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ؟
زلف برہم زدہ و چشم حجاب آلودہ

آہ یہ زلف ہے یا ابرِ سیہ مے خانہ
آہ یہ آنکھ ہے یا جامِ شراب آلودہ

کس نے پہلو میں بٹھایا یہ مجھے شرما کر
کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ

کس کے ملبوس سے آتی ہے حنا کی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ

کس کو شکوہ ہے مرے عشق سے رسوائی کا
کس کا لہجہ ہے بایں لطف عتاب آلودہ

پھر ہم آغوشی کے موسم نے بکھیرے گیسو
پھر فضائیں نظر آتی ہیں سحاب آلودہ

حسرتِ بوسہ پہ اختر یہ خیال آتا ہے
کیوں مرے لب سے ہوں وہ برگِ گلاب آلودہ

○

نہ ساز و مطرب نہ جام و ساقی نہ وہ بہارِ چمن ہے باقی
نگاہِ شمعِ سحر کے پردے پہ نقشِ انجمن ہے باقی

زمانہ گزرا وہ یاسمن بو جدا ہوئی ہم کنار ہو کر
مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی

بھلا چکی دل سے شامِ غربت ہر ایک نقشہ ہر ایک صورت
ہماری آنکھوں میں لیکن اب تک فروغِ صبحِ وطن ہے باقی

زمانہ بدلا مٹی جوانی نہ وہ محبت نہ زندگانی
بس ایک بھولی سی یاد ہے جو برنگِ داغِ کہن ہے باقی

مٹا دیئے بے ستون چرخِ کہن نے شیریں لقا ہزاروں
مگر محبت کے لب پہ اب بھی ترانۂ کوہکن ہے باقی

حباب آسا محیطِ ہستی میں جو ہے مٹنے کو بن رہا ہے
ہے انقلاب اک نمود ایسی جو زیرِ چرخِ کہن ہے باقی

غمِ زمانہ کی سختیوں سے ہوئی ہے پامال طبعِ اختر
نہ وہ نشاطِ کہن ہے باقی نہ وہ مذاقِ سخن ہے باقی

○

جھوم کر بدلی اٹھی اور چھا گئی
ساری دنیا پر جوانی آ گئی

آہ وہ اس کی نگاہِ مے فروش
جب بھی اٹھی مستیاں برسا گئی

گیسوئے مشکیں میں وہ روئے حسیں
ابر میں بجلی سی اک لہرا گئی

عالمِ مستی کی توبہ الاماں!
پارسائی نشہ بن کر چھا گئی

آہ اس کی بے نیازی کی نظر
آرزو کیا پھول سی کمہلا گئی

سازِ دل کو گدگدایا عشق نے
موت کو لے کر جوانی آ گئی

پارسائی کی جوانمردی نہ پوچھ
توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی

اختر اس جانِ تمنا کی ادا
جب کبھی یاد آ گئی تڑپا گئی

تاثیر

○

حضورِ یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
معاملاتِ من و تو نکل ہی آتے ہیں

ہزار ضبطِ سخن ہو، ہزار ضبطِ نظر
مقامِ جنبشِ ابرو نکل ہی آتے ہیں

حنائے ناخنِ پا ہو کہ حلقۂ سرِ زلف
چھپاؤ بھی تو یہ جادو نکل ہی آتے ہیں

جنابِ شیخ وضو کے لیے سہی لیکن
کسی بہانے لبِ جو نکل ہی آتے ہیں

متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

○

لطف و وفا نہیں کہ وہ بیداد گر نہیں
خاموش ہوں کہ میری فغاں بے اثر نہیں

تیرے بغیر تلخیٔ کام و دہن حرام
دردِ جگر ہے لذتِ دردِ جگر نہیں

سجدوں سے نامراد ہے جلووں سے ناامید
وہ رہگزر کہ اب جو تری رہگزر نہیں

تم کیا گئے کہ سارا زمانہ چلا گیا
وہ رات دن نہیں ہیں وہ شام و سحر نہیں

ہر ہر روش معاملۂ حسن و عاشقی
ہر ہر قدم فروغِ جمالِ نظر نہیں

بے باک چال، چال سے بیباک تر نظر
اب حسن تو بہت ہے مگر فتنہ گر نہیں

زخموں سے چُور قافلے، پُرخار راستے
اس میں ترا قصور تو اے راہبر نہیں

دنیائے چشم و گوش تو برباد ہو گئی
اب کچھ بغیر معرکۂ خیر و شر نہیں

○

وہ ملے تو بے تکلف، نہ ملے تو بے ارادہ
نہ طریقِ آشنائی، نہ رسومِ جام و بادہ

تری نیم کش نگاہیں، ترا زیرِ لب تبسم
یونہی اک ادائے مستی، یونہی اک فریبِ سادہ

وہ کچھ اس طرح سے آئے مجھے اس طرح سے دیکھا
مری آرزو سے کم تر، مری تاب سے زیادہ

یہ دلیلِ خوش دلی ہے، مرے واسطے نہیں ہے
وہ دہن کہ ہے شگفتہ، وہ جبیں کہ ہے کشادہ

وہ قدم قدم پہ لغزش، وہ نگاہ مستِ بادہ
یہ طرازِ زلفِ سرکش، یہ کلاہِ کج نہادہ

○

حسن کے رازِ نہاں شرحِ بیاں تک پہنچے
آنکھ سے دل میں گئے، دل سے زباں تک پہنچے

دل نے آنکھوں سے کہی، آنکھوں نے دل سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

عشق پہلے ہی قدم پر ہے یقیں سے واصل
انتہا عقل کی یہ ہے کہ گماں تک پہنچے

کعبہ و دیر میں تو لوگ ہیں آتے جاتے
وہ نہ لوٹے جو درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

آنکھ سے آنکھ کہے، دل سے ہوں دل کی باتیں
وائے وہ عرضِ تمنا جو زباں تک پہنچے

○

لبالب جام پھر ساقی نے واپس لے لیا مجھ سے
نہ جانے کیا کہا میں نے، نہ جانے کیا ہوا مجھ سے

مری توبہ، مجھے باور، وہ کافر ہے وہ کافر ہے
خفا تو بھی ہوا جاتا ہے اے میرے خدا مجھ سے

چھپا پھرتا ہوں اب تک تیری آنکھوں سے مگر کب تک
یہ کہہ ڈالیں گی اک دن میرے دل کا مدعا مجھ سے

مجھے معلوم ہے تابش سب کچھ جانتا ہوں میں
ارے اب پی بھی جا کیوں بن رہا ہے پارسا مجھ سے

○

میری وفائیں یاد کرو گے
روؤ گے فریاد کرو گے

مجھ کو تو برباد کیا ہے
اور کسے برباد کرو گے؟

ہم بھی ہنسیں گے تم پر اک دن
تم بھی کبھی فریاد کرو گے

محفل کی محفل ہے غمگیں
کس کس کا دل شاد کرو گے

دشمن تک کو بھول گئے ہو
مجھ کو تم کیا یاد کرو گے

ختم ہوئی دشنام طرازی
یا کچھ اور ارشاد کرو گے

جا کر بھی ناشاد کیا تھا
آ کر بھی ناشاد کرو گے

چھوڑو بھی تابش کی باتیں
کب تک اس کو یاد کرو گے

عبدالمجید سالکؔ

○

ہمنفسو۔ اُجڑ گئیں مہر و وفا کی بستیاں
پوچھ رہے ہیں اہلِ دل مہر و وفا کو کیا ہُوا

عشق ہے بے گداز کیوں حسن ہے بے نیاز کیوں
میری وفا کہاں گئی ان کی جفا کو کیا ہُوا

یہ تو بجا کہ اب وہ کیف جامِ شراب میں نہیں
ساقیِ مے کے غمزۂ ہوش رُبا کو کیا ہُوا

اب نہیں جنتِ مشام کوچۂ یار کی شمیم
نکہتِ زلف کیا ہوئی بادِ صبا کو کیا ہُوا

تھم گیا دورۂ حیات رُک گئی نبضِ کائنات
عشق و جنوں کی گرمیِ ہمہمہ زا کو کیا ہُوا

نالۂ شب سے نارسا آہِ سحر سے بے اثر
میرا خدا کہاں گیا میرے خدا کو کیا ہُوا

○

نہ تھی امید نہ وعدے پہ اعتبار کیا
غضب ہے پھر بھی ترا ہم نے انتظار کیا

اٹھا دے اب تو نقاب اے عروسِ آزادی
ہزار سال ترا ہم نے انتظار کیا

شفق نے پھول بکھیرے خزاں کی وادی میں
سحر نے دامنِ مشرق کو لالہ زار کیا

وداعِ عشق ہے اب رخصت اے غمِ جاناں
کہ پھر مجھے غمِ دوراں نے بے قرار کیا

خرد نے سائے میں جس کے پناہ لی صدیوں
جنوں نے آج اسی دامن کو تار تار کیا

چھپا رکھا تھا جسے محتسب نے ردوں میں
وہ راز بزم میں رندوں نے آشکار کیا

دماغ تو کسی قیمت پہ بک نہ سکتے تھے
متاعِ دل ہی کو نذرِ جمالِ یار کیا

نظر میں پھر گئی سالکؔ جہانِ نو کی نمود
غمِ زمانہ نے جب مجھ کو اشکبار کیا

○

نہ محتسب کی نہ جور و جفا کی بات کرو
مئے کہن کی نگارِ جواں کی بات کرو

کسی کی تابشِ رخسار کا کہو قصہ
کسی کے گیسوئے عنبر فشاں کی بات کرو

ضیا ہے شاہد و شمع و شراب سے اس کی
فروغِ محفلِ روحانیاں کی بات کرو

جو مدعا ہو کسی قبلۂ مراد کا ذکر
تو آستانۂ پیرِ مغاں کی بات کرو

نہیں ہوا جو طلوع آفتاب تو فی الحال
قمر کی بات کرو کہکشاں کی بات کرو

رہے گا مشغلۂ یادِ رفتگاں کب تک
گزر رہا ہے جو اس کارواں کی بات کرو

یہ قید و صید کے اندیشہ ہائے بے جا کیا
چمن کی فکر کرو آشیاں کی بات کرو

یہی جہان ہے ہنگامہ زارِ سود و زیاں
اسی کے سود اسی کے زیاں کی بات کرو

اب اس چمن میں نہ صیاد ہے نہ گلچیں ہے
کرو تو اب تم باغباں کی بات کرو

خدا کے ذکر کا موقع نہیں یہاں سالک
دیارِ ہند میں حسنِ بتاں کی بات کرو[1]

○

خرد میں مبتلا ہے سالکِ دیوانہ برسوں سے
نہیں آیا وہ مے خانے میں بیباکانہ برسوں سے

میسر جس سے آجاتی تھی ساقی کی قدم بوسی
مقدر میں نہیں وہ لغزشِ مستانہ برسوں سے

بیادِ چشمِ یار اک نعرۂ مستانہ اے ساقی
کہ ہاؤ ہو سے خالی ہے ترا میخانہ برسوں سے

مجھے کچھ عشق و الفت کے سوا بھی یاد ہے اے دل
سنائے جا رہا ہے ایک ہی افسانہ برسوں سے

کسی کو تو مشرف کر دے اے ذوقِ جبیں سائی
تقاضا کر رہے ہیں کعبہ و بت خانہ برسوں سے

نئی شمعیں جلاؤ عاشقی کی انجمن والو!
کہ سونا ہے شبستانِ دلِ پروانہ برسوں سے

کوئی جوہر شناس آئے تو جانے قدر سالک کی
پڑا ہے خاک پر یہ گوہرِ یکدانہ برسوں سے

[1] مشاعرۂ دہلی میں پڑھی گئی

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

جوانو! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے
تمہیں ہوگے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہوں گے

جئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زلفِ جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبینِ دہر پر چھٹکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے

نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوعِ مہر کا جلوہ
سحر ہو جائے گی شامِ غریباں ہم نہیں ہوں گے

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں جب ہوں گی آساں ہم نہیں ہوں گے

کہیں ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے بعد ہی خونِ شہیداں رنگ لائے گا
یہی سرخی بنے گی زیبِ عنواں ہم نہیں ہوں گے

غم کے ہاتھوں مرے دل پر جو سماں گزرا ہے
حادثہ ایسا زمانے میں کہاں گزرا ہے

زندگی کا ہے خلاصہ وہی اک لمحۂ شوق
جو تری یاد میں اے جانِ جہاں گزرا ہے

حالِ دل غم سے یہ ہے جیسے کسی صحرا سے
ابھی اک قافلۂ نوحہ گراں گزرا ہے

بزمِ دوشیں کو کرو یاد کہ اس کا ہر رند
رونقِ بارگہِ پیرِ مغاں گزرا ہے

پا بگل جو تھے وہ آزردہ نظر آتے ہیں
شاید اس راہ سے وہ سروِ رواں گزرا ہے

نگرانیٔ دل و دیدہ ہوئی ہے ورنہ
کوئی مُحِب سے مری جانب نگراں گزرا ہے

حالِ دل سن کے وہ آزردہ ہیں شاید ان کو
اس حکایت پہ شکایت کا گماں گزرا ہے

وہ گل افشانیٔ گفتار کا پیکر سالک
آج کوچے سے ترے اشک فشاں گزرا ہے

عابد علی عابد

○

آئی سحر قریب تو میں نے پڑھی غزل
جلنے لگے ستاروں کے بجھتے ہوئے کنول

بے تاب ہے جنوں کہ غزل خوانیاں کروں
خاموش ہے خرد کہ نہیں بات کا محل

کیسے ڈرے ڈرے ہیں بجھائے غمِ روزگار نے
کچھ اور جگمگائے غمِ یار کے محل

راہوں میں جوئے خوں ہے رواں مثلِ موج مے
ساقی یقیں نہ ہو تو ذرا میرے ساتھ چل

اے التفاتِ یار مجھے سوچنے تو دے
مرنے کا ہے مقام کہ جینے کا ہے محل؟

اب ترکِ دوستی ہی تقاضا ہے وقت کا
اے یارِ چارہ ساز مری آگ میں نہ جل

کچھ بجلیوں کا شور ہے کچھ آندھیوں کا زور
دل ہے مقام پر تو ذرا بام پر نکل

ہم رند خاک وخوں میں اٹے ہاتھ بھی کٹے
نکلے نہ اے بہار ترے گیسوؤں کے بل

فرمانِ شحنہ یار کی پروا نہیں مجھے
ایمائے عاشقاں ہو تو عابد پڑھے غزل

○

مے ہو ساغر میں کہ خوں رات گزر جائے گی
دل کو غم ہو کہ سکوں رات گزر جائے گی

دیکھنا یہ ہے کہ انداز سحر کیا ہوں گے
یوں تو اربابِ جنوں رات گزر جائے گی

نہ رکا ہے نہ رکے قافلۂ لیل و نہار
رات کم ہو کہ فزوں رات گزر جائے گی

میں ترا محرمِ اسرار ہوں اے صبحِ بہار
جا کے پھولوں سے کہوں رات گزر جائیگی

مژدۂ صبح مبارک تمہیں اے دیدہ ورو!
میں جیوں یا نہ جیوں رات گزر جائے گی

رات بھر میں نے سجائے سرِ مژگاں تارے
مجھ کو تھا وہم کہ یوں رات گزر جائے گی

صبح اٹھ کر تجھے رہرو سے لپٹنا ہوگا
رہبرِ تیرہ دروں رات گزر جائے گی

○

یہ کیا طلسم ہے دنیا پہ بار گزری ہے
وہ زندگی جو سرِ رہگذار گزری ہے

کہیں سحر کا اُجالا ہوا ہے ہم نفسو!
کہ موجِ برق سرِ شاخسار گزری ہے

رہا ہے یہ سرِ شوریدہ مثلِ شعلہ بلند
اگرچہ مجھ پہ قیامت ہزار گزری ہے

یہ حادثہ بھی ہوا ہے کہ عشقِ یار کی یاد
دیارِ قلب سے بیگانہ وار گزری ہے

گلوں کی خوں شدگی سے سراغ ملتا ہے
کہیں چمن سے نسیمِ بہار گزری ہے

مقیمِ کوچۂ دلدار کو پتہ بھی نہیں
کہ حشر سے زندگی مستعار گزری ہے

انھیں کو عرضِ وفا کا تھا اشتیاق بہت
انھیں کو عرضِ وفا ناگوار گزری ہے

کبھی ہجومِ غمِ روزگار دیکھا ہے
کبھی مصیبتِ ہجرانِ یار گزری ہے

حریمِ شوق مہکتا ہے آج تک عابدؔ
یہاں سے نکہتِ گیسوئے یار گزری ہے

○

دل ہے آئینۂ حیرت سے دوچار آج کی رات
غمِ دوراں میں ہے عکسِ غمِ یار آج کی رات

کوئی منصور سے جا کر یہ کہو ہم نفسو!
ہوں بہ تعزیرِ خموشی سرِ دار آج کی رات

عزم کے محور پر ہیں ٹھہرے ہوئے افلاک و نجوم
میری محفل میں نہیں وقت کو بار آج کی رات

نہ مکاں آج ہے ثابت نہ زماں ہے سیّار
نہ خزاں شعبدہ آرا، نہ بہار آج کی رات

کبھی فردوسِ گل و لالہ تھی جو کشتِ خیال
اس سے بے ساختہ اُگتے ہیں شرار آج کی رات

بوئے خوں آتی ہے صحرائے تمنا سے مجھے
کھیلتا ہوں دلِ وحشی کا شکار آج کی رات

تجھے معلوم ہے عابدؔ کہ بیاضِ دل پر
ناخنِ غم نے کیے نقش و نگار آج کی رات

○

کاروانِ گل و ریحاں گزرے — صورتِ برق درخشاں گزرے

کیا بتاؤں کہ مری آنکھوں سے — کس قدر خواب پریشاں گزرے

محتسب کے بنتا رہا ہیں شکلِ حباب — دائیں بائیں سے طوفاں گزرے

گردشِ جام نہیں رک سکتی — جو بھی اے گردشِ دوراں گزرے

صبحِ محشر ہے بلا سے ظاہر — کسی صورت شبِ ہجراں گزرے

کوئی برسا نہ سرِ کشتِ وفا — کتنے بادل گہر افشاں گزرے

ابنِ آدم کو نہ آیا کوئی راس — کبھی آذر، کبھی یزداں گزرے

غمِ ہستی کے بیابانوں سے — کچھ ہمیں تھے کہ غزل خواں گزرے

اے غمِ یار تری راہوں سے — عمر بھر سوختہ ساماں گزرے

وہ جو پروانے جلے رات کی رات — منزلِ عشق سے آساں گزرے

غم کے تاریک افق پر عابد — کچھ ستارے سرِ مژگاں گزرے

○

غمِ دوراں غمِ جاناں کا نشاں ہے کہ جو تھا — وصفِ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا

لذتِ عرضِ وفا راحتِ جاں ہے کہ جو تھی — دل تپاں، اشک رواں، شوق جواں ہے کہ جو تھا

شرع و آئین کی تعزیر کے با وصفِ شباب — لب و رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا

میرے پاؤں سے ہیں الجھے ہوئے ریشم کے تار — ہمدمو! یہ تو وہی سنگِ گراں ہے کہ جو تھا

عشق کی طرزِ تکلم وہی چپ ہے کہ جو تھی — لبِ خوش گوئے ہوس ہجو بیاں ہے کہ جو تھا

راہرو دشت میں فریاد کناں ہیں کہ جو تھے — خندہ زن قافلۂ راہبراں ہے کہ جو تھا

مغبچے خوش ہیں کہ بزم ان کی ہے ساقی ہے نگار — برسرِ کار وہی پیرِ مغاں ہے کہ جو تھا

جلوۂ یار سے کیا شکوۂ بے جا کیجے! — شوقِ دیدار کا عالم وہ کہاں ہے کہ جو تھا

حلقۂ وعظ سے اب تک ہے گریزاں دنیا! — حلقۂ زلف مدارِ دو جہاں ہے کہ جو تھا

میرے ہنسنے پہ خفا تھے مرے رونے پہ ہنسے — وہی رنگِ ستم عشوہ گراں ہے کہ جو تھا

سنگِ طفلاں سے ذرا بچ کے رہے قدِ بلند — یہ وہی کارگہِ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

دوستو ہم نفسو! سنتے ہو عابد کی غزل! — یہ وہی شعلہ نوا سوختہ جاں ہے کہ جو تھا

حفیظ ہوشیارپوری

○

ایسی بھی کیا جلدی پیارے، جانے ملیں پھر یا نہ ملیں ہم
کون کہے گا پھر یہ فسانہ، بیٹھ بھی جاؤ، سن لو کوئی دم

وصل کی شیرینی میں پنہاں، ہجر کی تلخی بھی ہے کم کم
تم سے ملنے کی بھی خوشی ہے، تم سے جدا ہونے کا بھی غم

حسن و عشق جدا ہوتے ہیں جانے کیا طوفان اٹھے گا
حسن کی آنکھیں بھی ہیں پُرنم، عشق کی آنکھیں بھی ہیں پُرنم

میری وفا تو نادانی تھی تم نے مگر یہ کیا ٹھانی تھی
کاش نہ کرتے مجھ سے محبت، کاش نہ ہوتا دل کا یہ عالم

پروانے کی خاک پریشاں، شمع کی لو بھی لرزاں لرزاں
محفل کی محفل ہے ویراں، کون کرے اب کس کا ماتم

کچھ بھی پھر ان آنکھوں نے اکثر یہ عالم بھی دیکھا
عشق کی دنیا نازِ سراپا، حسن کی دنیا عجزِ مجسم

شہد شکن ہونٹوں کی لرزش، عشرتِ باقی کا گہوارہ
دائرۂ امکانِ تمنا، نرم لچکتی باہوں کے خم

اپنے اپنے دل کے ہاتھوں دونوں ہی برباد ہوئے ہیں
میں ہوں اور وفا کا رونا، وہ ہیں اور جفا کا ماتم

ناکامی سی ناکامی ہے، محرومی سی محرومی ہے
دل کا منانا سعیِ مسلسل، ان کو بھلانا کوششِ پیہم

عہدِ وفا ہے اور بھی محکم، تیری جدائی کے میں قرباں
تیری جدائی کے میں قرباں، عہدِ وفا ہے اور بھی محکم

○

کچھ اس طرح سے نظر سے گزر گیا کوئی
کہ دل کو غم کا سزاوار کر گیا کوئی

دلِ ستم زدہ کو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں
خود اپنے حسن سے یوں بے خبر گیا کوئی

وہ ایک جلوۂ صد رنگ، اک ہجومِ بہار
نجانے کون تھا جانے کدھر گیا کوئی

نظر کہ تشنۂ دیدار تھی رہی محروم
نظر اٹھائی تو دل میں اتر گیا کوئی

نگاہِ شوق کی محرومیوں سے ناواقف
نگاہِ شوق پہ الزام دھر گیا کوئی

اب ان کے حسن میں حسنِ نظر بھی شامل ہے
کچھ اور میری نظر سے سنور گیا کوئی

کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن تھی
ہزار بار اٹھا سوئے در گیا کوئی

نصیبِ اہلِ وفا یہ سکونِ دل تو نہ تھا
ضرور نالۂ دل بے اثر گیا کوئی

اٹھا پھر آج مرے دل میں رشک کا طوفان
پھر ان کی راہ سے باچشمِ تر گیا کوئی

یہ کہہ کے یاد کریں گے حفیظ دوست مجھے
وفا کی رسم کو پائندہ کر گیا کوئی

○

راز سربستہ محبت کے زباں تک پہنچے
بات بڑھ کر یہ خدا جانے کہاں تک پہنچے

کیا تصرف ہے ترے حسن کا اللہ اللہ
جلوے آنکھوں سے اتر کر دل و جاں تک پہنچے

تری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا
سرحدِ عقل سے گزرے تو یہاں تک پہنچے

حیرتِ عشق مری حسن کا آئینہ ہے
دیکھنے والے کہاں سے ہیں کہاں تک پہنچے

کھل گیا آج نگاہیں ہیں نگاہیں اپنی
جلوے ہی جلوے نظر آئے جہاں تک پہنچے

وہی اس گوشۂ داماں کی حقیقت جانے
جو مرے دیدۂ خوننابہ فشاں تک پہنچے

ابتدا میں جنھیں ہم ننگِ وفا سمجھے تھے
ہوتے ہوتے وہ گلے حسنِ بیاں تک پہنچے

آہ وہ حرفِ تمنا کہ نہ لب تک آئے
ہائے وہ بات کہ اک اک کی زباں تک پہنچے

کس کا دل ہے کہ سنے قصۂ فرقت میرا
کون ہے جو مرے اندوہِ نہاں تک پہنچے

خلش انگیز تھا کیا کیا تری مژگاں کا خیال
ٹوٹ کر دل میں یہ نشتر رگِ جاں تک پہنچے

نہ پتہ سنگِ نشاں کا نہ خبر رہبر کی
جستجو میں ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

نہ غبارِ رہِ منزل ہے نہ آوازِ جرس
کون مجھ رہروِ گم کردہ نشاں تک پہنچے

صاف توہین ہے یہ دردِ محبت کی حفیظ
حسن کا راز ہو اور میری زباں تک پہنچے

○

پھر سے آرائشِ ہستی کے جو ساماں ہوں گے
تیرے جلووں ہی سے آباد شبستاں ہوں گے

عشق کی منزلِ اول پہ ٹھہرنے والو!
اس سے آگے بھی کئی دشت و بیاباں ہوں گے

تو جہاں جائے گی غارت گرِ ہستی بن کر
ہم بھی اب ساتھ ترے گردشِ دوراں ہوں گے

کس قدر سخت ہے یہ ترک و طلب کی منزل
اب کبھی ان سے ملے بھی تو پشیماں ہوں گے

تیرے جلووں سے جو محروم رہے ہیں اب تک
وہی آخر ترے جلووں کے نگہباں ہوں گے

اب تو مجبور ہیں پر حشر کا دن آنے دے
تجھ سے انصاف طلب روئے گریزاں ہوں گے

جب کبھی ہم نے کیا عشق پشیمان ہوئے
زندگی ہے تو ابھی اور پشیماں ہوں گے

کوئی بھی غم ہو، غمِ دل کہ غمِ دہر حفیظ
ہم بہرحال بہر رنگ غزل خواں ہوں گے

○

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

میں اکثر سوچتا ہوں پھول کب تک
شریکِ گریۂ شبنم نہ ہوں گے

ذرا دیر آشنا چشمِ کرم ہے
ستم ہی عشق میں پیہم نہ ہوں گے

دلوں کی اُلجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

زمانے بھر کے غم یا اک ترا غم
یہ غم ہوگا تو کتنے غم نہ ہوں گے

کہوں بیدرد کیوں اہلِ جہاں کو
وہ میرے حال سے محرم نہ ہوں گے

ہمارے دل میں سیلِ گریہ ہوگا
اگر با دیدۂ پُرنم نہ ہوں گے

اگر تو اتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

حفیظؔ اُن سے میں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

○

کہاں کہاں نہ تصور نے دام پھیلائے
حدودِ شام و سحر سے نکل کے دیکھ آئے

نہیں پیام، رہِ نامہ و پیام تو ہے
ابھی صبا سے کہو اُن کے دل کو بہلائے

غرورِ جادہ شناسی بجا سہی لیکن
سراغِ منزلِ مقصود بھی کوئی پائے

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ راہبر یہ کہے
چلے تھے جانے کہاں سے کہاں نکل آئے

گزر گیا کوئی درماندہ راہ یہ کہتا
اب اس فضا میں کوئی قافلے نہ ٹھہرائے

نجانے ان کے مقدر میں کیوں ہے تیرہ شبی
وہ ہم نوا جو سحر کو قریب تر لائے

کوئی فریبِ نظر ہے کہ تابناک فضا
کسے خبر کہ یہاں کتنے چاند گہنائے

غمِ زمانہ تری ظلمتیں ہی کیا کم تھیں
کہ بڑھ چلے ہیں اب اُن گیسوؤں کے بھی سائے

بہت بلند ہے اس سے مرا مقامِ غزل
اگرچہ میں نے محبت کے گیت بھی گائے

حفیظؔ اپنا مقدر، حفیظؔ اپنا نصیب
گرے تھے پھول مگر ہم نے زخم ہی کھائے

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

○

شجر شجر نگراں ہے کلی کلی بیدار
نہ جانے کس کی نگاہوں کو ڈھونڈتی ہے بہار

کبھی فغاں بھی نشاط و طرب کا افسانہ
کبھی ہنسی بھی تڑپتے ہوئے دلوں کی پکار

نہ جانے کس کے نشاطِ قدم سے ہیں محروم
کہ ایک عمر سے سُونے پڑے ہیں راہگزار

ہزار بار کسی چشمِ آشنا کے طفیل
اُجڑ اُجڑ کے بسے ہیں محبتوں کے دیار

عجیب حال ہے بیتابیِ محبت کا
شبِ وصال کی راحت میں ڈھونڈتی ہے قرار

یہ برقِ حسن اور اس پر تری غمزے حجاب
یہ سیلِ عشق اور اس پر نظر نظر کا شمار

ابھی چمن کو میسر نہیں ہے رنگِ چمن
بہار ڈھونڈ رہی ہے ابھی سراغِ بہار

ہے ان کی پرسشِ درد و الم میں بھی پنہاں
وہ اک کسک کہ سمجھتے نہیں جسے غمخوار

○

ہزار گردشِ شام و سحر سے گزرے ہیں
وہ قافلے جو تری رہ گزر سے گزرے ہیں

ابھی ہوس کو میسر نہیں دلوں کا گداز
ابھی یہ لوگ مقامِ نظر سے گزرے ہیں

ہر ایک نقش پہ تھا تیرے نقشِ پا کا گماں
قدم قدم پہ تری رہگزر سے گزرے ہیں

نہ جانے کون سی منزل پہ جا کے رُک جائیں
نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں

رحیلِ شوق سے لرزاں تھا زندگی کا شعور
نہ جانے کس لیے ہم بے خبر سے گزرے ہیں

کچھ اور پھیل گئیں درد کی کٹھن راہیں
غمِ فراق کے مارے جدھر سے گزرے ہیں

جہاں سرور میسر تھا جام و مے کے بغیر
وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں

○

یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکیبا نہ کر سکو

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لازوال
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

شاید تمہیں بھی چین نہ آئے مرے بغیر
شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو

کیا جانے پھر ستم بھی میسر ہو یا نہ ہو
کیا جانے یہ کرم بھی کرو یا نہ کر سکو

اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو جستجو
میرے سوا کسی کی تمنا نہ کر سکو

○

وہ حسن کو جلوہ گر کریں گے
آرائشِ بام و در کریں گے

ہنس ہنس کے کریں گے چارہ سازی
سامانِ دل و نظر کریں گے

ہم بھی سرِ راہ منتظر ہیں
دیکھیں کب ادھر نظر کریں گے

افسانۂ غم طویل ہے دوست
اس بات کو مختصر کریں گے

ہے شامِ فراق سخت تاریک
اس شام کی اب سحر کریں گے

افسردہ ہیں زندگی کے تیور
کب تک یونہی ہم بسر کریں گے

آئے گا تبسم ان لبوں پر
آنسو بھی کبھی اثر کریں گے

نظر میں ڈھل کے ابھرتے ہیں دل کے افسانے
یہ اور بات ہے دنیا نظر نہ پہچانے

وہ بزم دیکھی ہے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع بھی جلتے رہے ہیں پروانے

یہ کیا بہار کا جوبن یہ کیا نشاط کا رنگ
فسردہ میکدے والے اداس میخانے

مرے ندیم! تری چشمِ التفات کی خیر
بگڑ بگڑ کے سنورتے گئے ہیں افسانے

یہ کس کی چشمِ فسوں ساز کا کرشمہ ہے
کہ ٹوٹ کر بھی سلامت ہیں دل کے بتخانے

نگاہِ ناز میں دل سوزیٔ نیاز کہاں
یہ آشنائے نظر ہیں دلوں کے بیگانے

○

یہ آج آئے ہیں کس اجنبی سے دیس میں ہم
تڑپ گئی ہے نظر چشمِ آشنا کے لیے

وہ ہاتھ جن سے تھا گل چاک دامنِ افلاک
وہ ہاتھ آج اٹھانے پڑے دعا کے لیے

یہ میں نے مانا جدائی مرا مقدر ہے
مگر یہ بات نہ منہ سے کہو خدا کے لیے

یہ راہرو تھے کبھی راہِ زندگی کا سراغ
یہ راہرو کہ بھٹکتے ہیں رہنما کے لیے

چراغ حسن حسرت

○

یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

ناکامِ تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

○

جب سے تیرا کرم ہے بندہ نواز
سوز ہے سوز اور نہ ساز ہے ساز

میں ہوں اور میری بے پر و بالی
دل ہے اور دل کی جرأتِ پرواز

حسن کی برہمی معاذ اللہ
گیسوؤں کے بکھرنے کا انداز

زلفِ برہم جھکی ہوئی نظریں
گردنِ ناز میں کمندِ نیاز

قدِ بالا و دامنِ کوتاہ
منزلِ عشق کے نشیب و فراز

اللہ اللہ فسونِ نغمۂ عشق
سارا عالم ہے گوش بر آواز

قطع ہونے لگا ہے رشتۂ زیست
اے غمِ یار تیری عمر دراز!

○

اس طرح کر گیا دل کو مرے ویراں کوئی
نہ تمنا کوئی باقی ہے نہ ارماں کوئی

ہر کلی میں ہے ترے حسنِ دل آرا کی نمود
اب کے دامن ہی بچے گا نہ گریباں کوئی

مے چکاں لب، نظر آوارہ، نگاہیں گستاخ
یوں مرے پہلو سے اٹھتا ہے غزل خواں کوئی

زلف برہم ہے دلِ آشفتہ صبا آوارہ
خوابِ ہستی سا نہیں خوابِ پریشاں کوئی

نغمۂ درد سے ہو جاتا ہے عالم معمور
اس طرح چھیڑتا ہے تارِ رگِ جاں کوئی

○

محبت کس قدر یاس آفریں معلوم ہوتی ہے
ترے ہونٹوں کی ہر جنبش نہیں معلوم ہوتی ہے

یہ کس کے آستاں پر مجھ کو ذوقِ سجدہ لے آیا
کہ آج اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہے

محبت تیرے جلوے کتنے رنگا رنگ جلوے ہیں
کہیں محسوس ہوتی ہے کہیں معلوم ہوتی ہے

جوانی مٹ گئی لیکن خلشِ دردِ محبت کی
جہاں معلوم ہوتی تھی وہیں معلوم ہوتی ہے

امیدِ وصل نے دھوکے دیے ہیں اس قدر حسرت
کہ اس کافر کی ہاں بھی اب نہیں معلوم ہوتی ہے

○

آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں
زلف کی، رخسار کی باتیں کریں

زلفِ عنبر بار کے قصے سنائیں
طرۂ طرار کی باتیں کریں

پھول برسائیں بساطِ عیش پر
روزِ وصلِ یار کی باتیں کریں

نقدِ جاں لے کر چلیں اس بزم میں
مصر کے بازار کی باتیں کریں

اُن کے کوچے میں جو گزری ہے کہیں
سایۂ دیوار کی باتیں کریں

آخری ساعت شبِ رخصت کی ہے
آؤ اب تو پیار کی باتیں کریں

○

دل بلا سے نثار ہو جائے
آپ کو اعتبار ہو جائے

قہر تو بار بار ہوتا ہے
لطف بھی ایک بار ہو جائے

زندگی چارہ سازِ غم نہ سہی
موت ہی غمگسار ہو جائے

یا خزاں جائے اور بہار آئے
یا خزاں ہی بہار ہو جائے

دل یہ مانا کہ اختیار نہیں
اور اگر اختیار ہو جائے

احسان دانش

○

عشق نے حسن کو تن ہی نہیں من بیچ دیا
مصلحت کرتی رہی لاکھ جتن بیچ دیا

عشق نے حسن کی اک نیم نگاہی کے عوض
تاج و اورنگِ سلاطینِ زمن بیچ دیا

آج کل بارگہِ حسن ہے اور اہلِ ہوس
عشق نے سلسلۂ دار و رسن بیچ دیا

ان تک آتی نہیں خورشید کے رشتوں کی کمند
جن دھندلکوں نے ستاروں کا کفن بیچ دیا

جورِ صیاد کی کس منہ سے شکایت کیجے
اس چمن نے بھی تو ہر وصفِ چمن بیچ دیا

کوئی دیوانوں سے پوچھے یہ خموشی کیسی
کیا کہیں نعرۂ بت خانہ شکن بیچ دیا

صرف نغمے ہی نہیں لے بھی بدلنی ہوگی
باغبانوں نے سنا ہے کہ چمن بیچ دیا

دل اُمڈ آیا ہے احسان بھر آئے آنسو
جب سنا ہے کسی فنکار نے فن بیچ دیا

○

اب کہو کارواں کدھر کو چلے
راستے کھو گئے چراغ جلے

آنسوؤں میں نہا گئیں خوشیاں
رو پڑے کر جب وہ آ لگے ہیں گلے

کارواں میں شورِ منزل تھا
آئی منزل تو سب نے ہاتھ ملے

عشق عنم کو عبور کر نہ سکا
راستے کارواں کے ساتھ چلے

ہم پہ گزری ہیں ہجر کی راتیں
ہم جہنم میں رہتے مگر نہ جلے

تھے محبت کی ابتدا کے قصور
وہ تبسم جو آنسوؤں میں ڈھلے

آشیانوں پہ ظلمتیں برسیں
برق کے جس قدر چراغ جلے

وقت کی قدر میکدے والو
رات ڈھلنے کو ہے شراب ڈھلے

نغمہ ہائے حیات گائے کون
ساز اُترے ہوئے ہیں خشک گلے

خاک سے سینکڑوں اُگے خورشید
ہے اندھیرا مگر چراغ تلے

چاند ساکت ہے رُک گئے تارے
اب وہ آئیں تو غم کی رات ڈھلے

میکدے کا تو ذکر بھی ہے گناہ
اب حیاتِ حرم پڑی ہے گلے

پرسشِ حال کا جواب تھا کیا
ہنس پڑے ہم کہ جلد بات ٹلے

صبحِ نو کے گجر کو کیا معلوم
گھٹ گئے کتنے زمزموں کے گلے

○

جو ترے آستاں سے لوٹ آئے
جنتِ دو جہاں سے لوٹ آئے

بندگی کے مقام سے آگاہ
سرحدِ لامکاں سے لوٹ آئے

ماہ و انجم کے ساتھ تھے ہم بھی
ہم مگر درمیاں سے لوٹ آئے

لگ گیا جی قفس میں جن جن کا
بارہا آشیاں سے لوٹ آئے

اب تو کعبے میں روشنی کر دو
اب تو کوئے بتاں سے لوٹ آئے

جن گلوں کو جہاں سے نسبت تھی
حلقۂ گلستاں سے لوٹ آئے

آ رہی ہے اک آشنا آواز
بے خودی ہم کہاں سے لوٹ آئے

ہائے جو گردِ راہ ہیں اب تک
وائے جو کارواں سے لوٹ آئے

دیر و کعبہ سے ان کے دیوانے
ناخوش و سرگراں سے لوٹ آئے

کاش احساں وہ خلدِ رعنائی
ارضِ ہندوستاں سے لوٹ آئے

○

جب جوانی کی دھوپ ڈھلتی ہے — خود سری سر جھکا کے چلتی ہے

یاس میں ان کے لطف کی امید — ظلمتوں میں کرن مچلتی ہے

اُف وہ معذوریٔ نگاہ کہ جب — زندگی بندگی میں ڈھلتی ہے

دل سلگتا نہ ہو بہاروں کا — اشکِ شبنم سے لو نکلتی ہے

لامکاں کے لیے عروسِ حیات — موت کے بھیس میں نکلتی ہے

تجربہ ہے کہ دشمنی اکثر — دوستی کے لہو سے پلتی ہے

ہوشیار اے وفا کے دیوانے — یہ وفا آنسوؤں میں ڈھلتی ہے

تھک گیا چاند سو چلے تارے — اب تو آؤ کہ رات ڈھلتی ہے

شامِ غم میں خیال ہے اُن کا — اور جنگل میں آگ جلتی ہے

یاس لے ڈوبتی ہے کشتی کو — آس ساحل پہ ہاتھ ملتی ہے

بعض اوقات دل کی دنیا بھی — آنکھ کے فیصلوں پہ چلتی ہے

مسجدوں میں سکوت کیا معنی — میکدوں میں شراب ڈھلتی ہے

عشرتِ بے ثبات کی لو میں — جسم ہنستا ہے روح جلتی ہے

دورِ حاضر کی دوستی احساں
کس قدر جلد رخ بدلتی ہے

○

نظر فریبِ قضا کھا گئی تو کیا ہوگا
حیات موت سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا

بزعمِ ہوش تجلی کی جستجو بے سود
جنوں کی زد پہ خزاں آ گئی تو کیا ہوگا

نئی سحر کے بہت لوگ منتظر ہیں مگر
نئی سحر بھی جو کجلا گئی تو کیا ہوگا

نہ رہنماؤں کی مجلس میں لے چلو مجھ کو
میں بے ادب ہوں ہنسی آ گئی تو کیا ہوگا

غمِ حیات بیشک ہے خودکشی آساں
مگر جو موت بھی شرما گئی تو کیا ہوگا

شبابِ لالہ و گل کو پکارنے والو
خزاں سرشت بہار آ گئی تو کیا ہوگا

خوشی چھنی ہے تو غم کا بھی اعتماد نہ کر
جو روح غم سے بھی اکتا گئی تو کیا ہوگا

یہ فکر کر کہ ان آسودگی کے دھوکوں میں
تری خودی کو بھی موت آ گئی تو کیا ہوگا

وہ داستاں جو مصائب میں دفن ہے اب تک
زبانِ خلق پہ گر آ گئی تو کیا ہوگا

لرز رہے ہیں جگر جس سے کوہساروں کے
اگر وہ لہر یہاں آ گئی تو کیا ہوگا

وہ موت جس کی ہم احسانؔ سن رہے ہیں خبر
رموزِ زیست بھی سمجھا گئی تو کیا ہوگا

○

پرسشِ غم کا شکریہ! کیا تجھے آگہی نہیں
تیرے بغیر زندگی درد ہے زندگی نہیں

دور تھا اک گزر گیا، نشہ تھا اک اتر گیا
اب وہ مقام ہے جہاں شکوۂ بے رخی نہیں

تیرے سوا کروں پسند کیا تری کائنات میں
دونوں جہاں کی نعمتیں قیمتِ بندگی نہیں

عشرتِ خلد کے لیے زاہدِ کج نظر جھکے
مشربِ عشق میں تو یہ جرم ہے بندگی نہیں

لاکھ زمانہ ظلم ڈھائے، وقت نہ وہ خدا دکھائے
جب مجھے ہو یقیں کہ تو حاصلِ زندگی نہیں

دل کی شگفتگی کے ساتھ راحتِ میکدہ گئی
فرصتِ میکشی تو ہے، حسرتِ میکشی نہیں

ایک وہ رات تھی کہ جب تھا مرے گھر وہ مہتاب
ایک یہ رات ہے کہ اب چاند ہے چاندنی نہیں

زخم پہ زخم کھا کے جی، اپنے لہو کے گھونٹ پی
آہ نہ کر لبوں کو سی، عشق ہے دل لگی نہیں

دیکھ کے خشک و زرد پھول دل ہے کچھ اس طرح ملول
جیسے تری خزاں کے بعد دورِ بہار ہی نہیں

ساغر نظامی

○

دشت میں قیس نہیں، کوہ پہ فرہاد نہیں
ہے وہی عشق کی دنیا، مگر آباد نہیں

ڈھونڈنے کو تجھے او میرے نہ ملنے والے
وہ چلا ہے، جسے اپنا بھی پتہ یاد نہیں

روحِ بلبل نے خزاں بن کے اُجاڑا گلشن
پھول کہتے رہے ہم بھول ہیں، صیاد نہیں

حُسن سے چوک ہوئی، اس کی ہے تاریخ گواہ
عشق سے بھول ہوئی ہو، یہ مجھے یاد نہیں

بر لبِ ماہ پہ مضرابِ فغاں رکھ دی تھی
میں نے اک نغمہ سنایا تھا، تمھیں یاد نہیں

لاؤ! اک سجدہ کروں عالمِ بدمستی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

○

نغمے ہوا نے چھیڑے فطرت کی بانسری میں
پیدا ہوئیں زبانیں جنگل کی خامشی میں

اس وقت کی اداسی ہے دیکھنے کے قابل
جب کوئی رو رہا ہو افسردہ چاندنی میں

کچھ تو لطیف ہوتیں گھڑیاں مصیبتوں کی
تم ایک دن تو ملتے دو دن کی زندگی میں

ہنگامۂ تبسم ہے میری ہر خموشی
تم مسکرا رہے ہو دل کی شگفتگی میں

خالی پڑے ہوئے ہیں پھولوں کے سب صحیفے
رازِ چمن نہاں ہے کلیوں کی خامشی میں

○

نظر میں، روح میں، دل میں سمائے جاتے ہیں
ہر ایک عالمِ امکاں پہ چھائے جاتے ہیں

جو اُٹھ سکے تھے نہ خود حسن کے اُٹھانے سے
وہ پردہ ہائے دوئی اب اُٹھائے جاتے ہیں

جو گر سکے تھے نہ خود عشق کے گرانے سے
وہ سب حجابِ محبت گرائے جاتے ہیں

چھپا چھپا کے جنھیں مصلحت نے رکھا تھا
وہ جلوے اب سرِ محفل دکھائے جاتے ہیں

سنبھل کے اے نگہِ شوق! بزمِ دوست ہے یہ
یہاں خرابِ نظر آزمائے جاتے ہیں

نہ پوچھ کارگہِ عشق کا طلسم نہ پوچھ
قدم قدم پہ تماشے دکھائے جاتے ہیں

پتہ نہیں کہیں ان کا اور ان کے دیوانے
تصورات کی محفل سجائے جاتے ہیں

یہاں کی لغزشِ پا اب یہ حال ہے ساقی
کہ سر سے تا بہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

یہ میکدہ ہے ترا مدرسہ نہیں واعظ!
یہاں شراب سے انساں بنائے جاتے ہیں

یہ قصرِ حسن ہے آتش کدہ محبت کا
بجائے شمع یہاں دل جلائے جاتے ہیں

تمام عالمِ محسوس کانپ اُٹھتا ہے
جب آنکھ سے کہیں آنسو بہائے جاتے ہیں

ہمارا حال تو دیکھا، ہمارا ظرف بھی دیکھ
نگاہ اُٹھتی نہیں غم اُٹھائے جاتے ہیں

تلاش لازمۂ عاشقی نہیں ساغر
نہ ڈھونڈنے پہ بھی وہ ہم میں پائے جاتے ہیں

○

کافر گیسو والوں کی رات بسر یوں ہوتی ہے
حسن حفاظت کرتا ہے اور جوانی سوتی ہے

مجھ میں تجھ میں فرق نہیں، مجھ میں تجھ میں فرق ہے یہ
تو دنیا پر ہنستا ہے، دنیا مجھ پر روتی ہے

اس معمور خزانے سے ضبط ذرا ہشیار رہے
دل کی ہر گہرائی میں ایک اچھوتا موتی ہے

صبر و سکوں دو دریا ہیں، بھرتے بھرتے بھرتے ہیں
تسکینِ دل کی بارش ہے، ہوتے ہوتے ہوتی ہے

جینے میں کیا راحت تھی، مرنے میں تکلیف ہے کیا
جب دنیا کیوں ہنستی تھی؟ اب دنیا کیوں روتی ہے؟

دل کی تو تشخیص ہوئی، مہ پارہ گروں سے پوچھوں گا
دل جب دھک دھک کرتا ہے، وہ حالت کیا ہوتی ہے

ساون آئے، پھول کھلے، اک افسردہ یہ بول اُٹھا
جس میں دل کھل جاتے ہیں، وہ برکھا کب ہوتی ہے

ذرے اور تارے مل کر جادو روز جگاتے ہیں
فطرت کی بیداری میں ساری دنیا سوتی ہے

رات کے آنسو اے ساغر پھولوں میں بھر جاتے ہیں
صبح چمن اس پانی سے کلیوں کا منہ دھوتی ہے

○

ساون کی رُت آ پہنچی کالے بادل چھائیں گے
کلیاں رنگ میں بھیگیں گی پھولوں میں رس آئیں گے

ہاں! وہ ملنے آئیں گے، رحم بھی کچھ فرمائیں گے
حسن مگر چٹکی لے گا، پھر قاتل بن جائیں گے

تارے کھوئے دھندلکے میں شام ہوئی رات آ پہنچی
پریم کے سونے مندر میں آخر وہ کب آئیں گے

ہستی کی بدمستی کیا، ہستی خود اک مستی ہے
موت اسی دن آئے گی ہوش میں جس دن آئیں گے

میری آنکھیں کچھ بھی نہیں تیرے جلوے! جلوے ہیں
تو جب سامنے آئے گا، پردے سے پڑ جائیں گے

تارے کتنے ہی چھٹکیں، جگنو کتنے ہی چمکیں
شمع کی زردی کہتی ہے، رات گئے وہ آئیں گے

○

راتوں کو تصوّر ہے اُن کا اور چپکے چپکے رونا ہے
اے صبح کے تارے تو ہی بتا! انجام مرا کیا ہونا ہے

ان نورس آنکھوں والوں کا کیا ہنسنا ہے کیا رونا ہے
برسے ہوئے سچے موتی ہیں بہتا ہوا خالص سونا ہے

دل کو کھویا، خود بھی کھوئے، دنیا کھوئی، دین بھی کھویا
یہ گم شدگی ہے تو اک دن اے دوست! تجھے بھی کھونا ہے

تمیزِ کمال و نقص اٹھا یہ تو روش ہے دنیا کی
میں چندن ہوں تو کندن ہے، میں مٹی ہوں، تو سونا ہے

تو یہ نہ سمجھ اللہ! اگر ہے تسکین ترے دیوانوں کو
وحشت میں ہمارا ہنس پڑنا در اصل ہمارا رونا ہے

ماتم ہے مری آوازِ شکستِ سازِ دلِ صد پارہ کا
ساغرؔ میرا نغمہ بھی دیپک کے سروں میں رونا ہے

اختر انصاری

○

کسی سے لڑائیں نظر اور جھیلیں محبت کے غم اتنی فرصت کہاں
اٹھائیں کسی ماہ پیکر حسینہ کے جور و ستم اتنی فرصت کہاں

زمانے کی بے رحمیوں کے تصدق دماغِ نشاط و الم ہی نہیں
دل اپنا کرے آرزوئے جفا یا امیدِ کرم اتنی فرصت کہاں

ڈبو دیں مئے ناب کی مستیوں میں فلاکت کی نکبت کے احساس کو
بنائیں کسی عامیانہ سے کوزے ہی کو جامِ جم اتنی فرصت کہاں

ہوں آزادِ افکار لیکن تفکر میں ڈوبے ہوئے سے رہیں رات دن
طبیعت کی بے وجہ افسردگی کے مزے لوٹیں ہم اتنی فرصت کہاں

نہ ماضی ہمارا نہ مستقبل اپنا کچھ اس طور سے صرفِ امروز ہیں
غمِ دوش یا فکرِ فردا میں اختر کریں سر کو خم اتنی فرصت کہاں

○

کوئی مآلِ محبت مجھے بتاؤ نہیں
میں خواب دیکھ رہا ہوں مجھے جگاؤ نہیں

کسی کی یاد ہے ان کی مہک سے وابستہ
مجھے یہ پھول خدا کے لیے سنگھاؤ نہیں

محبت اور جوانی کے تذکرے نہ کرو
کسی ستائے ہوئے کو بہت ستاؤ نہیں

یہ کہہ رہا ہے محبت کی کاوشوں سے دل
یہ میرے ہنسنے کے دن ہیں مجھے رلاؤ نہیں

اجڑ کے پھر نہیں بستا جہانِ دل اختر
بہارِ باغ کو اس پر دلیل لاؤ نہیں

○

بہار آئی زمانہ ہوا خراباتی
ہمارے دل میں بھی اک لہر کاش آ جاتی

ہوا بھی سرد ہے بھیگی ہے رات بھی لیکن
سلگ رہی ہے کسی آگ سے مری چھاتی

مرے پڑوس میں یہ ذکر ہے کئی دن سے
صدا جو آتی تھی رونے کی اب نہیں آتی

لگا کے سینے سے شادابیوں کو سو جاتا
مجھے بہارِ جوانی میں موت آ جاتی

بجا رہا ہے کوئی رات میں ستار اختر
دھڑک رہی ہے مری آرزوؤں کی چھاتی

○

حلاوتیں نہ ہمیں مل سکیں تکلّم کی
سمیٹ لائے فقط بجلیاں تبسّم کی

متاعِ صبر کو اشکوں کی نذر کر بیٹھے
ہمارے پاس جو دولت تھی ہم نے یوں گم کی

اُڑا لی رونقِ گلزارِ دل کے زخموں نے
بہار چھین لی داغوں نے بزمِ انجم کی

مغنّیہ! یہ تری وجد بار موسیقی
ہے بازگشت مری روح کے ترنّم کی

خمارِ چشم سے پھوٹی لبوں تک آ پہنچی
لبوں سے چہرے پہ پھیلی ضیا تبسّم کی

پلا رہی ہیں نظر کو شرابِ دل افروز
یہ رُخ پہ بکھری ہوئی مستیاں تکلّم کی

ہم اس اُداس خموشی پہ مرتے ہیں اختر
نثار جس پہ ہیں رعنائیاں تکلّم کی

○

صاف ظاہر ہے نگاہوں سے کہ ہم مرتے ہیں
منہ سے کہتے ہوئے یہ بات مگر ڈرتے ہیں

ایک تصویرِ محبت ہے جوانی — گویا
جس میں رنگوں کے عوض خونِ جگر بھرتے ہیں

عشرتِ رفتہ نے جا کر نہ کیا یاد ہمیں
عشرتِ رفتہ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں

آسماں سے کبھی دیکھی نہ گئی، اپنی خوشی
اب یہ حالت ہے کہ ہم ہنستے ہوئے ڈرتے ہیں

شعر کہتے ہو بہت خوب تم اختر لیکن
اچھے شاعر یہ سنا ہے کہ جواں مرتے ہیں

○

خزاں میں آگ لگاؤ بہار کے دن ہیں　　نئے شگوفے کھلاؤ بہار کے دن ہیں

الٹ دو تختۂ خزاں کی تباہ کاری کا　　بساطِ عیش بچھاؤ بہار کے دن ہیں

عذارِ گل کی دہک سے جلا کے کانٹوں کو　　لگی دلوں کی بجھاؤ بہار کے دن ہیں

ملا کے قطرۂ شبنم میں رنگ و نکہتِ گل　　کوئی شراب بناؤ بہار کے دن ہیں

بھرے کٹورے چمن کے یہ درس دیتے ہیں　　چھلکتے جام لنڈھاؤ بہار کے دن ہیں

اب احتیاط پسندی ہے بے حسی نامشکور　　متاعِ ضبط لٹاؤ بہار کے دن ہیں

شرارِ گل سے زمانے میں شعلے بھڑکاؤ　　حسین فتنے جگاؤ بہار کے دن ہیں

جنونِ شوق کی بے اعتدالیوں کے خلاف　　کوئی دلیل نہ لاؤ بہار کے دن ہیں

پرانی شمعیں بجھا دیں صبا کے جھونکوں نے　　نئے چراغ جلاؤ بہار کے دن ہیں

لچک رہی ہے وفورِ ثمر سے شاخِ حیات　　یہ بار ہنس کے اٹھاؤ بہار کے دن ہیں

جنابِ اختر جاں دادۂ رخِ گل کو
امامِ وقت بناؤ بہار کے دن ہیں

شاد عارفی

○

بقولِ غالب ہوا کیا ہے "جو حشر دہقان کے لہو کا"
نشیمنوں سے وہی تعلق ہے آج کل نظمِ شعلہ خو کا

ہجومِ حرماں میں کوئی موقع نہیں مغنیِ خوش گلو کا
تمہیں مبارک ۔ مگر مرے ہاں نہیں ہے مصرف خم و سبو کا

وہاں بہاروں سے باغبانوں کی سازشیں بار ور نہ ہوں گی
جہاں خزاں نے اٹھا دیا ہو سوال کانٹوں کی آبرو کا

یہ اگلے وقتوں کے رہنما ۔ ان کی مصلحت پر نگاہ رکھیے
پٹے ہوئے راستوں پہ چل کر فریب دیتے ہیں جستجو کا

ہم ان کے وعدوں پہ ٹوپیاں کیوں اچھال دیں جو بے سیاست
ہوا کے جھونکے قدم کی آہٹ پہ رخ بدلتے ہیں گفتگو کا

کسی کے ظاہر سے اس کے باطن پہ جائزہ سہل بھی نہیں ہے
شراب کی تلخیوں سے پہلے سوال آتا ہے رنگ و بو کا

چمن میں پودوں کے سوکھ جانے کی شکوہ سنجی کو طنز کہہ کر
کہاں گھٹا ہے گلا دبا دیتے عندلیبانِ خوش گلو کا

جو بن بلائے تمہاری محفل میں آ گئے ہیں ان کو گیا کہوں میں
وہ اس میں عزت سمجھ رہے ہیں تو ایسی عزت پہ میں نے تھوکا

جو ان شاعر تو شاد ان وحشتوں سے دامن بچا چلے ہیں
مگر ضعیفوں میں اب بھی چرچا ہے چاک دامانی و رفو کا

○

بنا پائی نہ ذرے کو نگینا
تو پھر مصرف ترا اے چشمِ بینا

سرہانے کوئی رکھ جاتا ہے مینا
خدا کا نام لینا اور پینا

نظر ہے اور تماشائے بد و نیک
بُری اچھی کبھی پڑتی ہے پینا

پسیجا ہے بتوں کا دل ہمیں پر
یہیں پتھر کو آیا ہے پسینا

نگینہ ہے دلِ برباد الفت
مگر جب ٹوٹ جائے وہ نگینا

حجاب آلودہ رخسارِ جوانی
دیا پھولوں کو شبنم نے پسینا

جہاں اندھے ادب کے پاسباں ہوں
وہاں کیا "عرضِ جوہر" کا قرینا

کہاں ہیں تجربہ کارانِ خلوت
دھڑکتا ہے مرا دل اس کا سینا

مرا مسلک ہے صلح و آشتی شاد
کمینہ ہے جو رکھے مجھ سے کینا

○

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں
سمجھ سکو تو ٹھکانے کی بات کرتا ہوں

سحر کو شمع جلانے کی بات کرتا ہوں
یہ غافلوں کو جگانے کی بات کرتا ہوں

روش روش پہ بچھا دو ببول کے کانٹے
چمن سے لطف اٹھانے کی بات کرتا ہوں

وہ باغبان جو پودوں سے بیر رکھتا ہے
یہ آپ ہی کے زمانے کی بات کرتا ہوں

شراب سرخ کی موجوں سے مدعا ہوگا
اگر میں خون بہانے کی بات کرتا ہوں

وہ صرف اپنے لیے جام کر رہے ہیں طلب
میں ہر کسی کو پلانے کی بات کرتا ہوں

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

اس انجمن سے اٹھا ہوں کھری کھری کہہ کر
پھر انجمن میں نہ آنے کی بات کرتا ہوں

دبی زباں سے گزارش ہے ناگوار اگر
تو کیا سوال اٹھانے کی بات کرتا ہوں

نقاب بڑھ کے زمانہ نہ اٹھ سکے گی گرہیں
گلوں سے اوس اٹھانے کی بات کرتا ہوں

لگے ہوؤں کو نئی ٹھوکر دے رہا ہوں شاد
منجھے ہوؤں کو سکھانے کی بات کرتا ہوں

○

موج کو آپ کنارا سمجھیں
ہم کو اس باب میں ہارا سمجھیں

آپ جیسے خون کو پارا سمجھیں
وہ سمجھتے ہیں اشارا سمجھیں

بے اصولی کو وہ پیارا سمجھیں
بزم سے مجھ کو سدھارا سمجھیں

یہ سمجھنا کوئی توہین نہیں
غلطی کر کے دوبارا سمجھیں

غالباً یہ تو نہ ممکن ہوگا
ہم تباہی کو نظارا سمجھیں

ہو کے آزاد ہوا اندازہ
جیتنے والے کو ہارا سمجھیں

فرصتِ عشق میسر ہی کہاں
اب کسے عشق کا مارا سمجھیں

اس سے پہلے کہ اجڑ جائے چمن
باغبانوں کو خدارا سمجھیں

حکم یہ ہے ستم آرا نہ کہیں
اور دل میں ستم آرا سمجھیں

آگیا وقت کہ وہ گھبرا کر
پھول کو سرخ ستارا سمجھیں

واسطہ اُن سے پڑا ہے اے شاد
نفع سوچیں نہ خسارا سمجھیں

○

اپنی تقدیر کو پیٹے جو پریشاں ہے کوئی
آپ کے بس میں علاجِ غمِ دوراں ہے کوئی

ٹوکئے اس کو جو اس وقت غزل خواں ہے کوئی
جیل میں عشق لڑانے کا بھی امکاں ہے کوئی

اپنی مرضی سے تو اُگتے نہیں خود رَو پودے
ہم غریبوں کا بہرحال نگہباں ہے کوئی

زرد چہروں نے تبسم کو کیا ہے رُسوا
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

گُل رُخسار فسردہ — نہ جبینِ عرق آلودہ
آپ کس طرح یہ کہتے ہیں پشیماں ہے کوئی

جا بسن کر جو بشاشی تھی، اُٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

حرص دربان کو آقا کا مصاحب مانے
"ضمیر" آقا کو سمجھتا ہے کہ درباں ہے کوئی

ضبطِ اظہارِ وفا کوئی بڑی بات نہیں
ضبطِ بہتانِ خطا سہل ہے آساں ہے کوئی

مجھ سے کافر کے یہاں شادؔ مکمل سرقہ
عکسِ شہر بڑا صاحبِ ایماں ہے کوئی

○

یہ سجدہ ہے کہ تجدیدِ وفا ہے
اسے اللہ بہتر جانتا ہے

تمھیں رہبر سمجھنا پڑ گیا ہے
ہماری بیکسی کی انتہا ہے

ہماری جبہ اُنوں پر وہ ہنسا ہے
ہنسا۔ لیکن پسینہ آ گیا ہے

میں اپنے لفظ واپس لے رہا ہوں
یہ رہزن تھا۔ میں سمجھا رہنما ہے

برابر ہیں فغانِ درد و نغمہ
یہ آزادی نہیں تو اور کیا ہے

بہ ہر حالت بتوں کو پوجتے ہیں
بہ ہر صورت۔ ہمارا بھی خدا ہے

یہی ہے شادؔ میں سب سے بڑا عیب
وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے

نہال سیوہاروی

○

اک شخص جواں خاک بسر یاد تو ہوگا
وہ اپنی نگاہوں کا اثر یاد تو ہوگا

وہ دھوم زمانے میں مرے جوشِ جنوں کی
وہ غلغلۂ شام و سحر یاد تو ہوگا

بھولے تو نہ ہوگے وہ تجلی کی حکایت
وہ تذکرۂ داغِ جگر یاد تو ہوگا

ہر گام پہ وہ حسن کی پُر ہوش نگاہیں
وہ عشق کا بدمست سفر یاد تو ہوگا

ہر لحظہ وہ دنیائے محبت میں تغیّر
ہر سانس میں وہ رنگِ دگر یاد تو ہوگا

وہ دل کو ترے حسنِ خود آرا سے تعلق
وہ خاک سے پیمانِ نظر یاد تو ہوگا

وہ کارگہِ دہر سے اک بے خبری سی
وہ طعنۂ ہر اہلِ خبر یاد تو ہوگا

وہ دیدہ کہ تھا روکشِ آرائشِ گیتی
پہروں طرفِ راہگزر یاد تو ہوگا

وہ عشق کے جذبات کا بھرپور تلاطم
طوفان کی موجوں میں گذر یاد تو ہوگا

گم کردہ سکوں پا کے مجھے اپنی گلی میں
کہنا وہ تجاہل سے کدھر یاد تو ہوگا

بھولی تو نہ ہوگی مری الفت کی حقیقت
مدت کا فسانہ ہے مگر یاد تو ہوگا

○

ہے کدھر وہ سلسلۂ کرم، ہے کہاں وہ ساقیٔ نیک خو
کہ جہانِ میکدہ تشنگی سے پکارتا ہے سبو سبو

ہوں ازل سے راہروِ طلب، یہ ندائے غیب ہے روز و شب
ابھی اور چل، ابھی اور چل، یہی جستجو، یہی جستجو

تری حکمتوں کی خبر کہاں، جو ہو پردہ در وہ نظر کہاں
ہیں ہزار ناظرِ گلستاں، نہیں ایک محرمِ رنگ و بو

ہوں حدیں تمام خیال کی، نہ ہو شرح تیرے جمال کی
جو ازل سے تا بہ ابد رہے یہی تذکرہ، یہی گفتگو

مری چار دن کی یہ زندگی اسی ذوق و شوق میں کٹ گئی
کبھی یہ حکایتِ آرزو، کبھی وہ حکایتِ آرزو

ترا جلوہ رونقِ بحر و بر، تو ہر ایک خوب سے خوب تر
کبھی اپنی سمت نگاہ کر، کہ فروغِ بزمِ جہاں ہے تو

ترے ولولے ہیں اگر جواں، ہو برنگِ سیلِ رواں دواں
کہ ہے ننگِ ہمتِ آدمی روشِ قناعتِ آب جو

ستم زمانہ سے تجھ کو رم، ہیں فدائے لذتِ ہر الم
تجھے آشیاں کی تلاش ہے، مجھے بجلیوں کی ہے جستجو

○

دھوم کتنی ہے یہ عالم جسے طوفانوں کی
ایک ہلکی سی تڑپ ہے مرے ارمانوں کی

یہی بے لوث محبت یہی غمخواریِ خلق
اور معراج کسے کہتے ہیں انسانوں کی

اے مری ہمتِ مردانہ تری عمر دراز
توڑ ڈالی ہے کلائی کئی طوفانوں کی

آج کچھ لوگ وہاں جمع ہیں باچشمِ پُرآب
کل جو دنیا تھی چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

کس قدر عام ہے اس دہر میں احساسِ حیات
رگِ ہر سنگ میں اک لہر ہے طوفانوں کی

نام ہے کیا اسی ہنگامے کا آغازِ شباب
ایک آندھی سی چلی آتی ہے ارمانوں کی

بات کب سنتے ہیں دنیا کی ترے دیوانے
نہ سنے بات یہ دنیا ترے دیوانوں کی

جس قدر عشق سے ہوتی ہے فزوں وسعتِ فکر
عقل رکھتی ہے بنا ایسے نئے زندانوں کی

اپنی موت اپنی تباہی کی طرف کیا دیکھیں
کہ نگاہیں طرفِ شمع ہیں پروانوں کی

ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام
سیر کرتے رہے نادیدہ گلستانوں کی

ماسوا اس کے نہیں اور کچھ افسانۂ ہند
ایک تاریخ ہے اُجڑے ہوئے کاشانوں کی

○

عبث ہے گرمِ تلاشِ اثر فغاں کے لیے
فغاں ہے سینۂ سوزاں کے امتحاں کے لیے

اُڑا لیے ہیں کچھ اربابِ گلستاں نے تو کیا
ہزار شیوۂ نو ہیں مری فغاں کے لیے

زمین کوچۂ جاناں سے آ رہی ہے صدا
بلندیاں نہیں مخصوص آسماں کے لیے

ہے ختم حوصلہ مندی وجودِ آدم پر
ستیزہ کار ہے فتحِ عجم جہاں کے لیے

چمن کی سرد ہواؤں نے دی مجھے تسکین
میں دل گرفتہ ہوا جب سکونِ جاں کے لیے

الٰہی محفلِ انجم میں جلوہ گر ہے کون
یہ چاندنی نے کیا کھیت کس جہاں کے لیے

ہے سخت بے ادبی گر کہے فسانۂ عشق
ہر ایک بات مناسب نہیں زباں کے لیے

اندھیری رات، بھٹکی ہمتیں، کوئی منزل
سلامتی کی دعا مانگ کارواں کے لیے

سجائی نگرِ درخشاں نے میری بزمِ نجوم
تھی منتظر یہ زمیں نازِ آسماں کے لیے

○

بہار کا روپ بھی نگاہوں میں اک فریبِ بہار سا ہے
حیات میں دلکشی نہیں ہے حیات میں انتشار سا ہے

زمانہ کیا دیکھئے دکھائے، نہ جانے کیا انقلاب آئے
فلک کے تیور میں خشمگیں ہے، زمیں کے دل میں غبار سا ہے

کمالِ دیوانگی تو جب ہے رہے نہ احساسِ جیب و دامن
اگر ہے احساسِ جیب و دامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے

کچھ آج ایسی ہی جی پہ گذری، دبی ہوئی تھی جو چوٹ ابھری
جسے سنبھالے ہوئے تھا دل میں وہ نالہ بے اختیار سا ہے

ابھی امیدِ وفا نہ توڑو، سیاستِ دلبری نہ چھوڑو
کبھی جو فردوسِ رنگ و بو تھا وہ ایک اجڑا دیار سا ہے

نہالؔ کو بے پیے ہے مستی، ہے مفت الزامِ مے پرستی
ہے عام اس شہر میں روایت یہ شخص کچھ بادہ خوار سا ہے

○

زندگی زہر کا اک جام ہوئی جاتی ہے
کیا سے کیا یہ مے گلفام ہوئی جاتی ہے

کچھ گذاری ہے غمِ عشق و محبت میں حیات
کچھ بسر در غمِ ایام ہوئی جاتی ہے

پھیلتا جاتا ہے یہ عالمِ ہمہ تن عالمِ درد
خلشِ غم خلشِ عام ہوئی جاتی ہے

آ چلا پیرِ مغاں وقتِ چراغانِ حیات
زرد سے مہرِ مبیں، شام ہوئی جاتی ہے

ہوسِ سیر و تماشا ہے کہ ہوتی نہیں ختم
زندگی ہے کہ سبک گام ہوئی جاتی ہے

کن حقائق پہ نظر اب ہے کہ یہ بزمِ وجود
اک صنم خانۂ اوہام ہوئی جاتی ہے

صحبتِ پیرِ مغاں میں یہ کھلی عظمتِ عشق
عقل بھی دُردِ تہِ جام ہوئی جاتی ہے

المدد! المدد اے نیرِ اقبال و عروج
تیرہ بختوں کی سحر شام ہوئی جاتی ہے

العجب! العجب اے ہمتِ مردانہ کہ تو
تماشائی گردشِ ایام ہوئی جاتی ہے

تم جو آئے ہو تو شکلِ در و دیوار ہے اور
کتنی رنگین مری شام ہوئی جاتی ہے

کیوں نہ وجد آئے تری نکتہ طرازی پہ نہالؔ
غزل اک نغمۂ الہام ہوئی جاتی ہے

اسرار الحق مجاز

○

شوق کے ہاتھوں اے دلِ مضطر کیا ہونا ہے کیا ہوگا
عشق تو رسوا ہو ہی چکا ہے حسن بھی کیا رسوا ہوگا

حسن کی بزمِ خاص میں جا کر اس سے زیادہ کیا ہوگا
کوئی نیا پیماں باندھیں گے کوئی نیا وعدہ ہوگا

چارہ گری سر آنکھوں پر اس چارہ گری سے کیا حاصل
درد کہ اپنی آپ دوا ہے تم سے اچھا کیا ہوگا

واعظِ سادہ لوح سے کہہ دو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں
اس دنیا میں کیا رکھا ہے اس دنیا میں کیا ہوگا

○

مری وفا کا ترا لطف بھی جواب نہیں
مرے شباب کی قیمت ترا شباب نہیں

یہ ماہتاب نہیں ہے کہ آفتاب نہیں
بجھی ہے حسن، مگر عشق کا جواب نہیں

مری نگاہ میں جلوے ہیں جلوے ہی جلوے
یہاں حجاب نہیں ہے یہاں نقاب نہیں

جنوں بھی حد سے سوا شوق بھی ہے حد سے سوا
یہ بات کیا ہے کہ میں موردِ عتاب نہیں

یہاں تو حسن کا دل بھی ہے غم سے صد پارہ
میں کامیاب نہیں وہ بھی کامیاب نہیں

یہاں تو رات کی بیداریاں مسلم ہیں
مگر وہاں بھی حسین انکھڑیوں میں خواب نہیں

نہ پوچھیے مری دنیا کو میری دنیا میں
خود آفتاب بھی ذرہ ہے آفتاب نہیں

سبھی ہیں میکدۂ دہر میں خرد والے
کوئی خراب نہیں ہے کوئی خراب نہیں

مجاز کس کو میں سمجھاؤں کوئی کیا سمجھے
کہ کامیابِ محبت بھی کامیاب نہیں

برباد تمنا پہ عتاب اور زیادہ
ہاں میری محبت کا جواب اور زیادہ

روئیں نہ ابھی اہل نظر حال پہ میرے
ہونا ہے ابھی مجھ کو خراب اور زیادہ

آوارہ و مجنوں ہی پہ موقوف نہیں کچھ
ملنے ہیں ابھی مجھ کو خطاب اور زیادہ

اٹھیں گے ابھی اور بھی طوفاں مرے دل سے
دیکھوں گا ابھی عشق کے خواب اور زیادہ

ٹپکے گا لہو اور مرے دیدۂ تر سے
دھڑکے گا دلِ خانہ خراب اور زیادہ

ہوگی مری باتوں سے انھیں اور بھی حیرت
آئے گا انھیں مجھ سے حجاب اور زیادہ

اے مطربِ بیباک کوئی اور بھی نغمہ
اے ساقیٔ فیاض شراب اور زیادہ

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

○

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے
اس سعیِ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیٔ وحشت کی قسم حیرت کی قسم حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسم پا بھی گئے

رودادِ غمِ الفت ان سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
ایک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گزری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

○

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکرِ بیش و کم نہیں ہے

مری بربادیوں کا ہم نشینو!
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پُرنم نہیں ہے

بایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجازؔ اک بادہ کش تو ہے یقیناً
جو ہم سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے

مُعین احسن جذبی

○

شریکِ محفلِ دار و رسن کچھ اور بھی ہیں
ستم گرو ابھی اہلِ کفن کچھ اور بھی ہیں

رواں دواں یوں ہی اے ننھی بوندیوں کے ابر
کہ اس دیار میں اُجڑے چمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنوں کے پاؤں
ابھی مناظرِ دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے مری واماندگی کو غیرت آئے
ابھی منازلِ رنج و محن کچھ اور بھی ہیں

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

ابھی تو ہیں دلِ شاعر میں سینکڑوں ناسُور
ابھی تو معجزہ ہائے سخن کچھ اور بھی ہیں

دلِ گداز نے آنکھوں کو دے دیے آنسو
یہ جانتے ہوئے غم کے چلن کچھ اور بھی ہیں

○

ہم دہر کے اس ویرانے میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارا کرتے ہیں

کیا تجھ کو پتہ کیا تجھ کو خبر دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی ہم تجھ کو جس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

کیا جانیے کب یہ پاپ کٹے کیا جانیے وہ دن کب آئے
جس دن کے لیے ہم اے جذبی کیا کچھ نہ گوارا کرتے ہیں

○

بیتے ہوئے دنوں کی حلاوت کہاں سے لائیں
اک میٹھے میٹھے درد کی راحت کہاں سے لائیں

ڈھونڈیں کہاں وہ نالۂ شب تاب کا جمال
آہِ سحر گہی کی صباحت کہاں سے لائیں

سمجھائیں کیسے دل کی نزاکت کا ماجرا
خاموشیٔ نظر کی خطابت کہاں سے لائیں

ترکِ تعلقات کا ہو جس سے احتمال
بے باکیوں میں اتنی صداقت کہاں سے لائیں

افسردگیٔ ضبطِ الم آج بھی سہی —
لیکن نشاطِ ضبطِ مسرت کہاں سے لائیں

آسودگیٔ لطف و عنایت کے ساتھ ساتھ
دل میں دبی دبی سی قیامت کہاں سے لائیں

وہ جوشِ اضطراب پہ کچھ سوچنے کے بعد
حیرت کہاں سے لائیں ندامت کہاں سے لائیں

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
نا آزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

ہے آج بھی نگاہِ محبت کی آرزو
پر ایسی اک نگاہ کی قیمت کہاں سے لائیں

سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات
تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

○

ملے مجھ کو غم سے فرصت تو سناؤں وہ فسانہ
کہ ٹپک پڑے نظر سے مئے عشرتِ شبانہ

یہی زندگی مصیبت، یہی زندگی مسرت
یہی زندگی حقیقت، یہی زندگی فسانہ

کبھی درد کی تمنا کبھی کوششِ مداوا
کبھی بجلیوں کی خواہش، کبھی فکرِ آشیانہ

مرے قہقہوں کی زد پر کبھی گردشیں جہاں کی
مرے آنسوؤں کی رو میں کبھی تلخیٔ زمانہ

مری رفعتوں سے لرزاں کبھی مہر و ماہ و انجم
مری پستیوں سے خائف کبھی اوجِ خسروانہ

کبھی میں ہوں تجھ سے نالاں کبھی مجھ سے تو پریشاں
کبھی میں ترا ہدف ہوں کبھی تو مرا نشانہ

جسے پا سکا نہ زاہد جسے چھو سکا نہ صوفی
وہی تار چھیڑتا ہے مرا سوزِ شاعرانہ

○

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا اب خواہشِ دنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے اس کو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

○

جسے آج نغمہ سمجھتی ہے دنیا
وہی نغمہ کل تک فغاں ہو نہ جائے

جسے سازِ دوراں پہ گانا نہ آیا
وہ مطرب کہیں نوحہ خواں ہو نہ جائے

بچا کر جسے رکھ لیا ہے جبیں میں
وہ سجدہ بھی نذرِ بتاں ہو نہ جائے

نہ کلیاں ہی چٹکیں نہ تارے ہی چمکیں
مرا غم غمِ دو جہاں ہو نہ جائے

احمد ندیم قاسمی

○

افق نہاں ہے تو حدِ نظر کا ذکر کریں
ستارے ڈوب رہے ہیں سحر کا ذکر کریں

فضا کا ذکر کریں بحر و بر کا ذکر کریں
بہت بلند ہے فردوسِ گہر کا ذکر کریں

صدف کو سامنے پا کر گہر کا ذکر کریں
نظر کے ساتھ ہی حسنِ نظر کا ذکر کریں

خزاں کو بوئے گل و نسترن سے چھلکا دیں
اگر بہار نہیں برگ و بر کا ذکر کریں

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے
حضورِ فلسفۂ خیر و شر کا ذکر کریں

فرار کا یہ نیا روپ ہے اگر ہم لوگ
چراغ توڑ کے نورِ قمر کا ذکر کریں

ستارے کون چنے گا بدستِ زخم آلود
چلو غبارِ سرِ رہگزر کا ذکر کریں

اگر نہایتِ بیچارگی ہے چارہ گری
تو کس امید پہ زخمِ جگر کا ذکر کریں

تمام عمر کٹے چاک دامنی کے سبب
بعزمِ بخیہ گری بخیہ گر کا ذکر کریں

مرے ندیم مری ذات کو سمجھ کر آپ
مرے کلام کے نقص و اثر کا ذکر کریں

○

مرے سبو میں مری زیست کا لہو تو نہیں
کہیں مزاجِ زمانہ بہانہ جُو تو نہیں

ندی کی رَو میں رواں ہے جو ایک برگِ گلاب
کہیں شباب کا ایوانِ رنگ و بُو تو نہیں

مچل مچل کے ابھرتی ہے جب چراغ کی لَو
میں سوچتا ہوں کہ ان روزنوں میں تُو تو نہیں

یہ سب درست شبِ ہجر کی سحر تو ہوئی
مگر شفق میں مرا خونِ آرزو تو نہیں

افق کی سمت تو قرنوں سے چل رہا تھا ندیم
کہیں یہ راہنما مجھ سا راہ جُو تو نہیں

○

میں کب سے گوشِ بر آواز ہوں پکارو بھی
زمین پر یہ ستارے کبھی اُتارو بھی

مری غیور اُمنگو شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

سفینہ محوِ سفر ہے تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں تم سدھارو بھی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اُداس نقش گرو! اب مجھے نکھارو بھی

بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ خیال
بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی

مری تلاش کی معراج ہو تمھیں لیکن
نقاب اُٹھاؤ نشانِ سفر ابھارو بھی

یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم تم اس بوجھ کو سہارو بھی

○

بگاڑ ہو کہ بناؤ عجیب تیرے سبھاؤ
نگاہوں میں ہیں بلائے تو ابروؤں میں تناؤ

گجر بجا ہے سہانا مگر کرو نہ بہانہ
جھکا قمر نہ دکھاؤ بجھا چراغ جلاؤ

اگر گھنا ہو اندھیرا اگر ہو دور سویرا
تو یہ اصول ہے میرا کہ دل کے دیپ جلاؤ

اُجڑ رہے ہیں گھرانے بدل رہے ہیں زمانے
لپک رہے ہیں دوانے اُتار ہو کہ چڑھاؤ

خدا کے لب پہ ہنسی ہے خدائی جھوم رہی ہے
تمھاری بات چلی ہے مری حسین خطاؤ

اِدھر شباب کا مس ہے اُدھر شراب کا رس ہے
قدم قدم پہ قفس ہے ندیم دیکھتے جاؤ

○

پھر بھیانک تیرگی میں آگئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں
آنکھ کیا کھولی چمن مرجھا گئے

کون تھے آخر جو منزل کے قریب
آئنے کی چادریں پھیلا گئے

کس تجلی کا دیا ہم کو فریب
کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے

اُن کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے

اک پہیلی کا ہمیں دے کر جواب
اک پہیلی بن کے ہر سو چھا گئے

پھر وہی اختر شماری کا نظام
ہم تو اس تکرار سے اُکتا گئے

رہنماؤ رات ابھی باقی سہی
آج سیارے اگر ٹکرا گئے

جن کو ہم سمجھا کیے ابرِ بہار
وہ بگولے کتنے گلشن کھا گئے

کیا رسا نکلی دعائے اجتہاد
لیجیے! اگلے زمانے آگئے

آدمی کے ارتقا کا مدعا
وہ چھپاتے ہی رہے ہم پا گئے

اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر
آفتاب ابھرا تو بادل چھا گئے

○

بہار جب بھی چمن میں دیئے جلاتی ہے
ہجومِ گل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے

بفیضِ لذتِ تخلیق خون ہو کے کلی
خود اپنے زخم کے پردے میں مسکراتی ہے

وفورِ رنگ میں کھلنے لگی ہے کیوں شبنم
عروسِ گل کو اگر آئنہ دکھاتی ہے

یہ شب ہے یا شفق افشانیوں سے گھبرا کر
نگارِ شام حیا سے لٹیں گراتی ہے

یہ کائنات کا آہنگ ہے کہ سحرِ حیات
چٹک کلی کی ستاروں کو گدگداتی ہے

یہ رودِ آب یہ تارے یہ شہرِ لالہ و گل
ابھی وہ آنکھ نہ جھپکے اور رات جاتی ہے

عبدالحمید عدمؔ

○

میکدہ تھا چاندنی تھی میں نہ تھا
اک مجسّم بے خودی تھی میں نہ تھا

عشق جب دم توڑتا تھا تم نہ تھے
موت جب سر دُھن رہی تھی میں نہ تھا

طور پر چھیڑا تھا جس نے آپ کو
وہ مری دیوانگی تھی میں نہ تھا

وہ حسیں بیٹھا تھا جب میرے قریب
لذّتِ ہمسائگی تھی میں نہ تھا

میکدے کے موڑ پر رُکتی ہوئی
مدّتوں کی تشنگی تھی میں نہ تھا

میں اور اس غنچہ دہن کی آرزو
آرزو کی سادگی تھی میں نہ تھا

گیسوؤں کے سائے میں آرام کش
سر برہنہ زندگی تھی میں نہ تھا

دیر و کعبہ میں عدمؔ حیرت فروش
دو جہاں کی بدظنی تھی میں نہ تھا

○

عہدِ مستی ہے لوگ کہتے ہیں
مے پرستی ہے لوگ کہتے ہیں

غمِ ہستی خریدنے والو!
موت سستی ہے لوگ کہتے ہیں

ہم جہاں جی رہے ہیں مر مر کر
بزمِ ہستی ہے لوگ کہتے ہیں

ضبطِ توبہ پہ آ رہی ہے ہنسی
تنگ دستی ہے لوگ کہتے ہیں

شاید اک بار اُجڑ کے پھر نہ بسے
دل کی بستی ہے لوگ کہتے ہیں

کیا کریں مہ وشوں سے پیار عدمؔ
بت پرستی ہے لوگ کہتے ہیں

○

اُن مست انکھڑیوں کو کنول کہہ گیا ہوں میں
محسوس ہو رہا ہے غزل کہہ گیا ہوں میں

ساقی! تری نگاہ کو کتنے غرور سے
ہر حادثے کا ردِ عمل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے اس حرفِ تلخ کو
سمجھا نہیں تو زہرِ اجل کہہ گیا ہوں میں

کہتے ہیں زندگی جسے مرگِ ناگہاں
اُس اتفاق کو بھی اٹل کہہ گیا ہوں میں

قسمت کی الجھنوں کو عدم کس گریز سے
اُس گیسوئے دراز کا بل کہہ گیا ہوں میں

○

غمِ محبت ستا رہا ہے، غمِ زمانہ مسل رہا ہے
مگر مرے دن گزر رہے ہیں مگر مرا وقت ٹل رہا ہے

وہ ابر آیا وہ رنگ برسے وہ کیف جاگا وہ جام کھنکے
چمن میں یہ کون آگیا ہے تمام موسم بدل رہا ہے

مری جوانی کے گرم لمحوں میں ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو تمام ماحول جل رہا ہے

یہ بھینی بھینی سی مست خوشبو یہ ہلکی ہلکی سی دلنشیں بُو
یہیں کہیں تیری زلف کے پاس ایک پروانہ جل رہا ہے

نہ دیکھ او مہ جبیں مری سمت اتنی مستی بھری نظر سے
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے شراب کا دور چل رہا ہے

عدم خرابات کی سحر ہے کہ بارگاہِ رموزِ مستی
اِدھر بھی سورج نکل رہا ہے اُدھر بھی سورج نکل رہا ہے

○

یہ کیسی سرگوشیٔ ازل سازِ دل کے پردے ہلا رہی ہے
مری سماعت کھنک رہی ہے کہ تیری آواز آ رہی ہے

حوادثِ روزگار میری خوشی سے کیا انتقام لیں گے
کہ زندگی وہ حسین ضد ہے کہ بے سبب مسکرا رہی ہے

ترا تبسم فروغِ ہستی تری نظر اعتبارِ مستی
بہار اقرار کر رہی ہے شراب ایمان لا رہی ہے

فسانہ خواں دیکھنا شبِ زندگی کا انجام تو نہیں ہے
کہ شمع کے ساتھ رفتہ رفتہ مجھے بھی کچھ نیند آ رہی ہے

اگر کوئی خاص چیز ہوتی تو خیر دامن بھگو بھی لیتے
شراب سے تو بہت پرانے مذاق کی باس آ رہی ہے

خرد کے ٹوٹے ہوئے ستارے عدم کہاں تک چراغ بنتے
جنوں کی روش روش ہی آخر دلوں کو رستے دکھا رہی ہے

○

پھولوں کی ٹہنیوں پہ نشیمن بنائیے
بجلی گرے تو جشنِ چراغاں منائیے

کلیوں کے انگ انگ میں میٹھا سا درد ہے
بیمار نکہتوں کو ذرا گدگدائیے

کب سے سلگ رہی ہے جوانی کی گرم رات
زلفیں بکھیر کر مرے پہلو میں آئیے

بہکی ہوئی سیاہ گھٹاؤں کے ساتھ ساتھ
جی چاہتا ہے شام ابد تک تو جائیے

ناسازیٔ حیات بھی ہے اک نشاطِ تلخ
حالات کی روش پہ ذرا مسکرائیے

سن کر جسے حواس میں ٹھنڈک سی آ بسے
ایسی کوئی اداس کہانی سنائیے

رستے میں ہر قدم پہ خرابات ہے عدم
یہ حال ہو تو کس طرح دامن بچائیے

سیف الدین سیف

○

دلوں کو توڑنے والو تمھیں کسی سے کیا
ملو تو آنکھ چرا لو تمھیں کسی سے کیا

ہماری لغزشِ پا کا خیال کیوں ہے تمھیں؟
تم اپنی چال سنبھالو تمھیں کسی سے کیا

چمک کے اور بڑھا دو مری سیہ بختی
کسی کے گھر کے اجالو تمھیں کسی سے کیا

نظر بچا کے گزر جاؤ میری تربت سے
کسی پہ خاک نہ ڈالو تمھیں کسی سے کیا

مجھے خود اپنی نظر میں بنا کے بیگانہ
جہاں کو اپنا بنا لو تمھیں کسی سے کیا

قریبِ نزع بھی کیوں چین لے سکے کوئی
نقاب رخ سے اٹھا لو تمھیں کسی سے کیا

○

غمِ خزاں کی تلافی بہار میں بھی نہیں
کہ اب نگاہ ترے انتظار میں بھی نہیں

تری نگاہ سے بدلی ہے کس طرح دنیا
جو دل کشی تھی خزاں میں بہار میں بھی نہیں

بھڑک اٹھی ہے کچھ اس طرح آتشِ ہستی
قرار سایۂ دامانِ یار میں بھی نہیں

عجب سکون کا عالم ہے یاس کا عالم
یہ دل کشی تو غمِ انتظار میں بھی نہیں

ہلاکِ جبرِ مسلسل یہی سمجھتے ہیں
نظامِ دہر ترے اختیار میں بھی نہیں

○

قریب موت کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ
قضا سے آنکھ لڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

تھکی تھکی سی فضائیں بجھے بجھے تارے
بڑی اداس گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

نہیں امید کہ ہم آج کی سحر دیکھیں
یہ رات ہم پہ کڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

ابھی نہ جاؤ کہ تاروں کا دل دھڑکتا ہے
تمام رات پڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

عروس شام ابھی گیسوؤں کے سائے میں
کنیز بن کے کھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

پھر اس کے بعد کبھی ہم نہ تم کو روکیں گے
لبوں پہ سانس اڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

دم فراق میں جی بھر کے تم کو دیکھ تو لوں
یہ فیصلے کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

○

راہ آسان ہو گئی ہو گی
جان پہچان ہو گئی ہو گی

موت سے تیرے دردمندوں کی
مشکل آسان ہو گئی ہو گی

پھر پلٹ کر نگہ نہیں آئی
تجھ پہ قربان ہو گئی ہو گی

تیری زلفوں کو چھیڑتی تھی صبا
خود پریشان ہو گئی ہو گی

ان سے بھی چھین لو گے یاد اپنی
جن کا ایمان ہو گئی ہو گی

دل کی تسکین پوچھتے ہیں آپ
ہاں مری جان! ہو گئی ہو گی

مرنے والوں پہ سیفؔ حیرت کیوں
موت آسان ہو گئی ہو گی

○

بڑے خطرے میں ہے حسنِ گلستاں ہم نہ کہتے تھے
چمن تک آگئی دیوارِ زنداں ہم نہ کہتے تھے

بھرے بازار میں جنسِ وفا بے آبرو ہو گی
اٹھے گا اعتبارِ کوئے جاناں ہم نہ کہتے تھے

اسی محفل اسی بزمِ وفا کے گوشے گوشے میں
لٹے گی مستیٔ چشمِ غزالاں ہم نہ کہتے تھے

اسی رستے میں آخر وہ کڑی منزل بھی آئے گی
جہاں دم توڑ دے گی یادِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

خزاں کی آہٹوں پر کانپتی ہیں پتیاں گل کی
بکھرنے کو ہے اب زلفِ بہاراں ہم نہ کہتے تھے

دلِ فطرت شناس آخر کہیں یونہی دھڑکتا ہے
فریبِ حسن ہے جشنِ چراغاں ہم نہ کہتے تھے

○

ہر اک چلن میں اسی مہرباں سے ملتی ہے
زمیں ضرور کہیں آسماں سے ملتی ہے

سرودِ عشق میں نغماتِ حسن شامل ہیں
تری خبر بھی مری داستاں سے ملتی ہے

ہمیں تو شعلۂ خرمن فروز بھی نہ ملا
تری نظر کو تجلی کہاں سے ملتی ہے

خیالِ منزلِ مقصد سے منزلوں آگے
نگاہ گردِ پسِ کارواں سے ملتی ہے

تری نگاہ سے آخر عطا ہوئی دل کو
وہ اک خلش کہ غمِ دو جہاں سے ملتی ہے

چلے ہیں سیفؔ وہاں ہم علاجِ غم کے لیے
دلوں کو درد کی دولت جہاں سے ملتی ہے

ظہیر کاشمیری

○

اب صاحبِ دوراں آتے ہیں، اب فاتحِ میداں آتے ہیں
وہ شیر تو شیرِ قالیں تھے، اب شیرِ نیستاں آتے ہیں

آہنگِ تفنگ و تیر ہیں ہم، گاتے ہیں سرودِ آزادی
ہنگامہ وار و گیر ہیں ہم، سرمست و غزل خواں آتے ہیں

جو تند بگولوں سے اُلجھے، وہ عزمِ سفر کی بات کرے
اس منزلِ نو کے رستے میں کتنے ہی بیاباں آتے ہیں

تسلیم کہ ساحل والوں نے، اک سیلِ خراماں روک دیا
ساحل کا نشاں تک مٹ جائے کچھ ایسے بھی طوفاں آتے ہیں

ہم ایسے امن پسندوں کو الحاد کا طعنہ دیتے ہیں
اس بزم میں خنجر در داماں جتنے بھی مسلماں آتے ہیں

پھولوں پہ مسرت ناچے گی، کلیوں پہ اُجالا برسے گا
ہم لوگ برنگِ نورِ سحر اے صبحِ گلستاں آتے ہیں

قاتل بھی ظہیر اب دامن کے دھبوں کو چھپاتا پھرتا ہے
اس دیکھ سے دل کے چہروں پر ہم خونِ شہیداں آتے ہیں

○

وہ حکایت جو بایں ہوش تجھے یاد نہیں
تیرے اپنے ہی تغافل کی تو روداد نہیں

آج بھی کاہشِ بے نام وہی ہے کہ جو تھی
دل کی دنیا ترے آنے سے بھی آباد نہیں

حسن تنہائی سے گھبرائے تو اتنا کہہ دو
عشق پابستۂ زنجیر ہے آزاد نہیں

وہ ملاقات کہ جو وجہِ شکستِ دل تھی
اب نگاہِ غلط انداز کو بھی یاد نہیں

کون سا دل ترے جلووں سے نہیں صاعقہ بار
کون سی بزم تری یاد سے آباد نہیں

ہم نہ سوچیں گے کبھی کوہ کنی کی تدبیر
قسمتِ عشق اگر تیشۂ فرہاد نہیں

تیری ہر بات میں ہے عذرِ جفا کا پہلو
تیری محفل میں کوئی صورتِ فریاد نہیں

○

شبِ مہتاب بھی اپنی، بھری برسات بھی اپنی
تمہارے دم قدم سے زندگی بھی زندگی اپنی

یہاں پابندیٔ ناز و جنوں کی بات ہے ورنہ
جمالِ یار سے کچھ کم نہیں تابندگی اپنی

مجھے شادابیٔ صحنِ چمن سے خوف آتا ہے
یہی انداز تھے جب لٹ گئی تھی زندگی اپنی

تمہارا غم اِسے آشوبِ صرصر سے بچائے گا
ہواؤں سے بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگی اپنی

مگر تم بھی تو اک بوئے گریزاں کی طرح نکلے
گزرنے کو گزر جاتی بہارِ دوستی اپنی

ظہیرؔ، اس چشمکِ اوّل پہ یوں محسوس ہوتا ہے
بڑی مدت سے ہے جیسے کسی سے دوستی اپنی

○

جب کبھی تذکرۂ شعلہ رُخاں ہوتا ہے
دامنِ دل پہ سلگنے کا گماں ہوتا ہے

ہم چمن پوشوں میں اس طرح رہے آشفتہ
جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے

دلِ بیاباں میں الاؤ کی طرح جلتے ہیں
خیمہ زن قافلۂ گشتہ سراں ہوتا ہے

اس کی ہر تان سے ملتا ہے ستاروں کو گداز
عشق کہتے ہیں جسے نغمۂ جاں ہوتا ہے

دلِ مرحومِ تمنا پہ دہکتے ہوئے داغ
جیسے تربت پہ چراغوں کا سماں ہوتا ہے

دعوتِ جلوۂ شب تاب پہ مسرور نہ ہو
یہ بھی اک وعدۂ زرّیں گراں ہوتا ہے

حسن کا عکس بھی تسکینِ دل و جاں ہے ظہیرؔ
حسن پر سایۂ صاحب نظراں ہوتا ہے

○

ابھی تو کاہشِ بوئے بہار باقی ہے
ابھی تجسّسِ دامانِ یار باقی ہے

تڑپ تڑپ کے شبِ ہجر کاٹنے والے
ستارہ ہائے سحر کا شمار باقی ہے

تمہارے ساتھ غمِ دوستی گزر ہی گیا
تمہارے بعد غمِ روزگار باقی ہے

ابھی سے تذکرۂ دل پہ وہ بگڑ بیٹھے
ابھی تو قصۂ منصور و دار باقی ہے

ظہیر اب بھی امیرانِ شہر کے سر میں
شرابِ نیم شبی کا خمار باقی ہے

○

شورشِ نالہ و فریاد ابھی باقی ہے
طمطراقِ دلِ برباد ابھی باقی ہے

غنچے غنچے میں ابھی تک ہیں قفس پوشیدہ
برگِ گل میں کفِ صیاد ابھی باقی ہے

زخمِ سر آج بھی ہے درد پرستوں کا علاج
عظمتِ تیشۂ فرہاد ابھی باقی ہے

دلِ پرخوں سے کہو حیلۂ مرہم نہ کرے
شہر میں اک ستم ایجاد ابھی باقی ہے

ابھی خونابۂ محشر سے گزرنا ہوگا
چشمِ تر! — اک نئی افتاد ابھی باقی ہے

بزم میں شعلۂ لب سوز جلانے والو!
شہرتِ نغمۂ آزاد ابھی باقی ہے

دلِ مرحوم کی خاموش فضاؤں میں ظہیر
اک سلگتی ہوئی فریاد ابھی باقی ہے

قتیلؔ شفائی

○

انگڑائی پر انگڑائی لیتی ہے رات جدائی کی
تم کیا سمجھو، تم کیا جانو بات مری تنہائی کی

کون سیاہی گھول رہا تھا وقت کے بہتے دریا میں
دیکھی ہے میں نے آنکھ جھکی پھر آج کسی ہرجائی کی

ٹوٹ گئے سیّال نگینے پھوٹ بہے رخساروں پر
دیکھو میرا ساتھ نہ دینا بات ہے یہ رسوائی کی

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

آپ کے ہوتے دنیا والے میرے دل پر راج کریں؟
آپ سے مجھ کو شکوہ ہے خود آپ نے بے پروائی کی

اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

○

پہلے تو اپنے دل کی رضا جان جائیے
پھر جو نگاہِ یار کہے مان جائیے

پا بوسیٔ جمال بھی حسنِ طلب سہی
جوشِ طلب میں تا بگریبان جائیے

شاید حضور سے کوئی نسبت ہمیں بھی ہو
آنکھوں میں جھانک کر ہمیں پہچان جائیے

اک دھوپ سی جمی ہے نگاہوں کے آس پاس
یہ آپ ہیں تو آپ پہ قربان جائیے

یا بے رُخی سے دیجیے دادِ سپردگی!
یا سادگی سے ہو کے پشیمان جائیے

کچھ کہہ رہی ہیں آپ کے سینے کی دھڑکنیں
میرا نہیں تو دل کا کہا مان جائیے

اپنی غزل قتیلؔ وہ کوئل کی کوک ہے
جس کی تڑپ کو دور سے پہچان جائیے

○

دل کو غمِ حیات گوارا ہے ان دنوں
پہلے جو درد تھا وہی چارہ ہے ان دنوں

ہر سیلِ اشک ساحلِ تسکیں ہے آجکل
دریا کی موج موج کنارا ہے ان دنوں

یہ دل ذرا سا دل تری یادوں میں کھو گیا
ذرّے کو آندھیوں کا سہارا ہے ان دنوں

شمعوں میں اب نہیں ہے وہ پہلی سی روشنی
کیا واقعی وہ انجمن آرا ہے ان دنوں

تم آ سکو تو شب کو بڑھا دوں کچھ اور بھی
اپنے کہے میں صبح کا تارا ہے ان دنوں

○

صدمے جھیلوں، جان پہ کھیلوں، اس سے مجھے انکار نہیں ہے
لیکن تیرے پاس وفا کا کوئی بھی معیار نہیں ہے

یہ بھی کوئی بات ہے آخر دور ہی دور رہیں متوالے؟
ہرجائی ہے چاند کا جوبن یا پنچھی کو پیار نہیں ہے

ایک ذرا سا دل ہے جس کو توڑ کے بھی تم جا سکتے ہو
یہ سونے کا طوق نہیں، یہ چاندی کی دیوار نہیں ہے

ملاحوں نے ساحل ساحل موجوں کی توہین تو کر دی
لیکن پھر بھی کوئی بھنور تک جانے کو تیار نہیں ہے

پھر سے وہی سیلابِ حوادث! جانے دو اے ساحل والو
یا اس بار سفینہ ڈوبا یا اب کے منجدھار نہیں ہے

قیدِ قفس کے بعد کرے گا قیدِ گلستاں کون گوارا؟
اب بھی وہی زنجیریں ہیں گو پہلی سی جھنکار نہیں ہے

○

چمن کی آبرو بن کر صبا کے ساتھ چلتے ہیں
سبک رفتار ہیں لیکن ادا کے ساتھ چلتے ہیں

عجب کھیل ہے جو منزل کا تصور ہی بدل جائے
مسافر بے رُخی سے رہنما کے ساتھ چلتے ہیں

خدا جانے کہاں ٹھہریں گے جا کر ولولے دل کے
یہ دیوانے تو رہوارِ وفا کے ساتھ چلتے ہیں

ستارے ڈوب جائیں یا افق سے آفتاب اُبھرے
اندھیرے تو بہر صورت ضیا کے ساتھ چلتے ہیں

دمِ رخصت ہم اپنے آنسوؤں کو روک بھی لیتے
مگر یہ کارواں تیری رضا کے ساتھ چلتے ہیں

قتیل اس بے مروّت کے نہ چھیڑو تذکرے ہم سے
یہ وہ نشتر ہیں جو ذکرِ وفا کے ساتھ چلتے ہیں

○

اندیشۂ اربابِ حرم ساتھ رہے گا
جنّت بھی ملے گی تو یہ غم ساتھ رہے گا

پیاسے ہی گذر جائیں گے ہم راہِ طلب سے
عبرت کے لیے ساغرِ جم ساتھ رہے گا

تو اور نہ آئے درِ زندانِ وفا تک
مر کر بھی یہ عزم تیری قسم ساتھ رہے گا

افلاک سے پلکوں پہ اُتر آئیں گے تارے
کھل کر بھی شبِ غم کا بھرم ساتھ رہے گا

منزل سے پلٹ آئے گی اک ایک تجلّی
ہاں شعلۂ رخسارِ صنم ساتھ رہے گا

میخانہ بہت دور نہیں دیدۂ غم سے
اگر گردشِ دوراں کوئی دم ساتھ رہے گا

راہوں میں قتیل آئیں گے سو آئنہ خانے
لیکن مرا گلپوش قلم ساتھ رہے گا

ساحر لدھیانوی

○

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب!
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبت کا اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

○

ہر چند مری قوتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبعِ خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہوں میں بیداریِ احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گزر جا
ہر چیز سزاوارِ نظارا نہیں ہوتی

فطرت کی مشیت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کسی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

○

طربزاروں پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گذری
دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری

زمیں نے خون اُگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری

ہمیں یہ فکر اُن کی انجمن کس حال میں ہو گی
انھیں یہ غم کہ اُن سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گذری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گذری

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گذری

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے، لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گذری

○

عقاید وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

حقیقت آشنائی اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی

مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ رانی
جوانی بے نیازِ عبرتِ انجام ہے ساقی

ہوس ہو گی اسیرِ حلقۂ نیک و بدِ عالم
محبت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے ساقی

ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی

مرے ساغر میں مے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی

زمانہ برسرِ پیکار ہے پُرہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیام ہے ساقی

○

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنّا کے سہارے جی لیا میں نے

انھیں اپنا نہیں سکتا مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدّت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بے کار امیدو!
بہت دکھ سہہ لیے میں نے بہت دن جی لیا میں نے

○

نفس کے لوچ میں رم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
حیات، ساغرِ سم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بامِ حرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

یہ اجتناب ہے عکسِ شعورِ محبوبی
یہ احتیاط، ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ادھر بھی ایک اچٹتی نظر کہ دنیا میں
فروغِ محفلِ جم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

نئے جہان بسائے ہیں فکرِ آدم نے
اب اس زمیں پہ ارم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مرے شعور کو آوارہ کر دیا جس نے
وہ مرگِ شادی و غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مجروحؔ سلطان پوری

○

جب ہوا عرفاں تو غم آرامِ جاں بنتا گیا
سوزِ جاناں دل میں سوزِ دیگراں بنتا گیا

رفتہ رفتہ منقلب ہوتی گئی رسمِ چمن
دھیرے دھیرے نغمۂ دل بھی فغاں بنتا گیا

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

میں تو جب مانوں کہ بھر دے ساغرِ ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیرِ مغاں بنتا گیا

جس طرف بھی چل پڑے ہم آبلہ پایانِ شوق
خار سے گل اور گل سے گلستاں بنتا گیا

شرحِ غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

○

اب اہلِ درد یہ جینے کا اہتمام کریں
اسے بھلا کے غمِ زندگی کا نام کریں

فریب کھا کے ان آنکھوں کا کب تلک اے دل
شرابِ خام پئیں رقصِ ناتمام کریں

غمِ حیات نے آوارہ کر دیا ورنہ
تھی آرزو کہ ترے در پہ صبح و شام کریں

نہ دیکھیں دیر و حرم سوئے رہروانِ حیات
یہ قافلے تو نہ جانے کہاں قیام کریں

غمِ جہاں کو غمِ دل بنا کے کچھ نہ ملا
کہ جس سے زیست کو راحت ملے وہ کام کریں

سکھائیں دستِ طلب کو ادائے بیباکی
پیامِ زیرِ لبی کو صلائے عام کریں

غلام رہ چکے، توڑیں یہ بندِ رسوائی
خود اپنے بازوئے محنت کا احترام کریں

زمیں کو مل کے سنواریں مثالِ روئے نگار
رُخِ نگار کی ضو سے فروغِ بام کریں

پھر اُٹھ کے گرم کریں کاروبارِ زلف و جنوں
پھر اپنے ساتھ اسے بھی اسیرِ دام کریں

روح

○

یہ رُکے رُکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں
یونہی کب تلک خدایا غمِ زندگی نباہیں

کہیں ظلمتوں میں گھِر کر ہے تلاشِ دستِ رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقشِ پا سے راہیں

ترے خانماں خرابوں کا چمن کوئی نہ صحرا
یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

○

ختم شورِ طوفاں تھا دور تھی سیاہی بھی
دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباہی بھی

التفات سمجھوں یا بے رُخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی

اس نظر کے اُٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہِ صبحگاہی بھی

یاد کر وہ دن جس دن تیری سخت گیری پر
اشک بھر کے اُٹھی تھی میری بے گناہی بھی

پستیٔ زمیں سے ہے رفعتِ فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کجکلاہی بھی

شمع بھی اُجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی راہی بھی

گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروح
مسجدوں میں کی میں نے جا کے دادخواہی بھی

○

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گُل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

مگر اے ہم قفس کہتی ہے شوریدہ سری اپنی
یہ رسمِ قید و زنداں ایک دیوارِ کہن تک ہے

دعا دیتی ہیں راہیں آج تک مجھ آبلہ پا کو
مرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

میں کیا کیا جرعۂ خوں پی گیا پیمانۂ دل میں
بلا نوشی مری کیا اک مئے ساغر شکن تک ہے

نہ آخر کہہ سکا اس سے مرا حالِ دلِ سوزاں
مہِ تاباں کہ جو اس کا شریکِ انجمن تک ہے

نوا ہے جادۂ دل مجروحؔ جس میں روح ساعت بھی
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

○

لیے بیٹھا ہے دل اک عزمِ بے باکانہ برسوں سے
کہ اس کی راہ میں ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے

دلِ سادہ نہ سمجھا ماسوائے پاک دامانی
نگاہِ یار کہتی ہے کوئی افسانہ برسوں سے

مجھے یہ فکر سب کی پیاس اپنی پیاس ہے ساقی
تجھے یہ ضد کہ خالی ہے مرا پیمانہ برسوں سے

گریزاں تو نہیں تجھ سے مگر تیرے سوا دل کو
کئی غم اور بھی ہیں اے غمِ جانانہ برسوں سے

ہزاروں ماہتاب آئے ہزاروں آفتاب آئے
مگر ہمدم وہی ہے ظلمتِ غم خانہ برسوں سے

شکیل بدایونی

○

مری زندگی ہے ظالم ترے غم سے آشکارا
ترا غم ہے در حقیقت مجھے زندگی سے پیارا

وہ اگر بُرا نہ مانیں تو جہانِ رنگ و بُو میں
میں سکونِ دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا

مجھے تجھ سے خاص نسبت میں رہینِ موجِ طوفاں
جنھیں زندگی تھی پیاری اُنھیں مل گیا کنارا

مجھے آ گیا یقیں سا کہ یہی ہے میری منزل
سرِ راہ جب کسی نے مجھے دفعتاً پکارا

میں بتاؤں فرق ناصح جو ہے مجھ میں اور تجھ میں
مری زندگی تلاطم تری زندگی کنارا

مجھے گفتگو سے بڑھ کر غمِ اذنِ گفتگو ہے
وہی بات پوچھتے ہیں جو نہ کہہ سکوں دوبارا

کوئی اے شکیلؔ دیکھے یہ جنوں نہیں تو کیا ہے
کہ اسی کے ہو گئے ہم جو نہ ہو سکا ہمارا

○

ہم ہیں اور ان کی خوشی ہے آج کل
دل گئی ہی زندگی ہے آج کل

ان کا ذکر ان کی تمنا ان کی یاد
وقت کتنا قیمتی ہے آج کل

جل رہی ہے دل میں شمعِ آرزو
غمکدے میں روشنی ہے آج کل

تُو ہے اور دریا دلی ہے ساقیا
میں ہوں اور تشنہ لبی ہے آج کل

عرضِ غم پر مسکراتے بھی نہیں
یہ بھی سی برہمی ہے آج کل

حاصلِ ترکِ محبت دیکھنا
انجمن سونی پڑی ہے آج کل

دل میں اور مایوسیوں میں اے شکیلؔ
اتحادِ باہمی ہے آج کل

○

پھر اٹھی دل میں اک موجِ شباب آہستہ آہستہ
پھر آیا زندگی میں انقلاب آہستہ آہستہ

سما کر مجھ میں وہ جانِ شباب آہستہ آہستہ
بنا دے گا مجھے اپنا جواب آہستہ آہستہ

یہ محفل زاہدانِ خشک کی محفل ہے اے رندو!
ذرا اس بزم میں ذکرِ شراب آہستہ آہستہ

مری نظریں مجھی کو رفتہ رفتہ بھولے جاتی ہیں
ہوئے جاتے ہیں جلوے کامیاب آہستہ آہستہ

شکیل اس درجہ مایوسی شروعِ عشق میں کیسی
ابھی تو اور ہونا ہے خراب آہستہ آہستہ

○

مری زندگی پہ نہ مسکرا مجھے زندگی کا الم نہیں
جسے تیرے غم سے ہو واسطہ وہ خزاں بہار سے کم نہیں

مرا کفر حاصلِ زُہد ہے مرا زُہد حاصلِ کفر ہے
مری بندگی ہے وہ بندگی جو رہینِ دیر و حرم نہیں

مجھے راس آئیں خدا کرے یہی اشتباہ کی ساعتیں
انھیں اعتبارِ وفا تو ہے مجھے اعتبارِ ستم نہیں

وہی کارواں وہی راستے وہی زندگی وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں

نہ وہ شانِ جبرِ شباب ہے نہ وہ رنگِ قہرِ عتاب ہے
دلِ بے قرار پہ ان دنوں ہے ستم یہی کہ ستم نہیں

نہ فنا مری نہ بقا مری مجھے اے شکیل نہ ڈھونڈیے
میں کسی کا حسنِ خیال ہوں مرا کچھ وجود و عدم نہیں

○

لطیف پردوں سے تھے نمایاں مکیں کے جلوے مکاں سے پہلے
محبت آئینہ ہو چکی تھی وجودِ بزمِ جہاں سے پہلے

ہر ایک عنوانِ دردِ فرقت ہے ابتدا شرحِ مدعا کی
وہی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں اُن کو کہاں سے پہلے

مسرتیں رازدارِ غم تھیں مسرتوں میں الم تھا پنہاں
جبھی تو صحنِ چمن میں شاید بہار آئی خزاں سے پہلے

سمجھ رہا تھا کہ ناامیدی نہ پردہ دارِ امید ہوگی
نظر اٹھا کر جو میں نے دیکھا غبار تھا کارواں سے پہلے

اٹھا جو مینا بدستِ ساقی رہی نہ کچھ تابِ ضبط باقی
تمام میکش پکار اُٹھے یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے

قسم فریبِ نگاہ و دل کی ہمیں جو اس جستجو نے کھویا
وہیں تھی دراصل اپنی منزل قدم اٹھے تھے جہاں سے پہلے

ازل سے شاید لکھے ہوئے تھے شکیل قسمت میں جورِ پیہم
کھلیں جو آنکھیں اس انجمن میں نظر ملی آسماں سے پہلے

○

نہ اب وہ آنکھوں میں برہمی ہے نہ اب وہ ماتھے پہ بل رہا ہے
وہ ہم سے خوش ہیں ہم ان سے خوش ہیں زمانہ کروٹ بدل رہا ہے

خوشی نہ غم کی نہ غم خوشی کا عجیب عالم ہے زندگی کا
چراغِ افسردۂ محبت نہ بجھ رہا ہے نہ جل رہا ہے

اہانتِ چشمِ مست ہے یہ کہ ہوش چھا جائے بے خودی پر
نظر اٹھا کر تو دیکھ ساقی یہ کون گر کر سنبھل رہا ہے

ہزار ترکِ وفا کروں میں تری محبت کو کیا کروں میں
دلِ حزیں تجھ سے روٹھ کر بھی ترے اشاروں پہ چل رہا ہے

کہاں یہ ہستی کی وارداتیں کہاں یہ عیش و طرب کی باتیں
اب اور ہی نغمہ چھیڑ مطرب کہ رنگِ محفل بدل رہا ہے

شکیل بتفسیرِ شعر اپنی جو پوچھتے ہو تو ہے بس اتنی
جو نالہ سینے میں گھٹ رہا تھا وہ نغمہ بن کر نکل رہا ہے

فضل احمد کریم فضلیؔ

○

تمہیں اک نہیں جانستاں اور بھی ہیں
بہت حادثاتِ جہاں اور بھی ہیں

حسیں اور بھی ہیں جواں اور بھی ہیں
غزالانِ ابرو کماں اور بھی ہیں

سبھی کو محبت میں ہوتے ہیں صدمے
ابھی کیا ابھی امتحاں اور بھی ہیں

چلو دھوم سے جشنِ ماتم منائیں
ہمیں اک نہیں نوحہ خواں اور بھی ہیں

نہیں ختم کچھ آسماں پر خدائی
مرے حال پر مہرباں اور بھی ہیں

نقاب اس نے رخ سے اٹھائی تو لیکن
حجابات کچھ درمیاں اور بھی ہیں

فریبِ کرم اک تو ان کا ہے اس پر
ستم میری خوش فہمیاں اور بھی ہیں

وفا ان سے اپنی جتانے گئے تھے
مگر اب تو وہ بدگماں اور بھی ہیں

نہیں صبر ہی کی کمی تجھ میں فضلیؔ
میری جان کچھ خامیاں اور بھی ہیں

○

بہار آئی گل افشانی کے دن ہیں
ہماری تنگ دامانی کے دن ہیں

عنادل کی غزل خوانی کے دن ہیں
گلوں کی چاک دامانی کے دن ہیں

جدھر دیکھو کھلے ہیں لالہ و گل
یہ خونِ دل کی ارزانی کے دن ہیں

ہوا دامانِ گل دامانِ یوسفؑ
نظر کی پاک دامانی کے دن ہیں

سبک رو ہے نسیمِ روح پرور
مگر پھر بھی گراں جانی کے دن ہیں

دلِ پُر درد اُمڈا آ رہا ہے
یہ بحرِ غم میں طغیانی کے دن ہیں

یہی دن ماحصل ہیں زندگی کے
یہی جو دل کی نادانی کے دن ہیں

جمالِ زندگی کی خیر یارب
کمالِ عقلِ انسانی کے دن ہیں

غزل پاکیزہ ہے فضلیؔ ابھی تک
یہ دن ہرچند عریانی کے دن ہیں

○

پھر ایسے خیالات آنے لگے
کہ ہم خود بخود گنگنانے لگے

ہمارا تمہارا عجب حال ہے
نظر مل گئی مسکرانے لگے

جوانی کی اللہ رے سرشاریاں
قدم خود بخود ڈگمگانے لگے

اندھیرا اندھیرا سا چھانے لگا
مرے پاس سے جب وہ جانے لگے

یونہی عمر گزرے گی اس قید میں
وہ کاہے کو تشریف لانے لگے

اکیلے میں گاتے تھے میری غزل
مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے

ترا روٹھنا ہے یہ بے فائدہ
تجھے کیوں وہ فضلی منانے لگے

○

آغازِ شباب شب ہے پیارے
جانے کا یہ وقت کب ہے پیارے

آنکھوں کا تو کام ہی ہے رونا
یہ گریۂ بے سبب ہے پیارے

اپنے ہاتھوں سے تو پلا دے
پینے کا مزہ تو جب ہے پیارے

اک آگ جلائے دے رہی ہے
دل جیسے ابولہب ہے پیارے

پھر بعد میں آ کے کیا کرے گا
آنے کا تو وقت اب ہے پیارے

کیا حال کہوں، کرم ہے تیرا!
آگے حدِ ادب ہے پیارے

کوئی نہ کوئی تو بات ہوگی
کیوں خندۂ زیرِ لب ہے پیارے

بے بات کی بات پر بگڑنا
غصہ تیرا غضب ہے پیارے

یہ پھول سے کہہ رہی ہے شبنم
کیوں ہنستا ہے کیا سبب ہے پیارے

اپنے فضلی سے جو خفا ہو
اس کا کوئی سبب ہے پیارے

○

اب وہ ٹھکی ہوئی سی رات نہیں
بات کیا ہے کہ اب وہ بات نہیں

پھر وہی جاگنا ہے دن کی طرح
رات ہے اور جیسے رات نہیں

بات اپنی تمھیں نہ یاد رہی
خیر، جانے دو، کوئی بات نہیں

کچھ نہیں ہے تو یاد ہے اُن کی
ان سے ترکِ تعلقات نہیں

پھر بھی دل کو بڑی اُمیدیں ہیں
گو بظاہر توقعات نہیں

عشق ہوتا ہے خود بخود پیدا
عشق کے کچھ لوازمات نہیں

ایسے فضلی کے شعر کم ہوں گے
جن میں کچھ دل کی واردات نہیں

○

آتے رہتے ہیں قدسیوں کے پیام
شعر بھی اک طرح کا ہے الہام

عشق ہے کس قدر بلند مقام
اس کے آگے ہے بس خدا کا نام

کام ان کا ہے دیں نہ دیں انعام
چاہیے ہم کو اپنے کام سے کام

زندگی ہے ازل سے تا بہ ابد
زندگی کی نہ کوئی صبح، نہ شام

راہرو تھک کے رہ گئے اختر
زندگی تھی کچھ ایسی تیز خرام

زلفِ دوراں سنوارنے والے
ہیں بڑی چیز عاشقانِ کرام

گر تمنا نہیں تو حسرت ہے
کیا ہوا کاروبارِ شوق تمام

میں نے مانا کہ ہوں تہی ساغر
شکر صد شکر ہے تو ہاتھ میں جام

لو مبارک ہو تم کو اے فضلی
اب وہ لیتے نہیں تمھارا نام

ناصر کاظمی

○

عشق جب زمزمہ پیرا ہوگا
حسن خود محوِ تماشا ہوگا

سن کے آوازۂ زنجیرِ صبا
قفسِ غنچہ کا در وا ہوگا

جرسِ شوق اگر ساتھ رہی
ہر نفس شہپرِ عنقا ہوگا

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

کون دیکھے گا طلوعِ خورشید
ذرہ جب دیدۂ بینا ہوگا

ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بیدرد کوئی کیا ہوگا

پھر سلگنے لگا صحرائے خیال
ابر گھر کر کہیں برسا ہوگا

پھر کسی دھیان کے صد راہے پر
دلِ حیرت زدہ تنہا ہوگا

ہر روش رنگ برستے ہوں گے
عالمِ خاک شفق زا ہوگا

پھر کسی صبحِ طرب کا جادو
پردۂ شب سے ہویدا ہوگا

گل زمینوں کے خنک رمنوں میں
جشنِ رامشگری برپا ہوگا

پھر نئی رت کا اشارا پا کر
وہ سمن بو چمن آرا ہوگا

گلِ شب تاب کی خوشبو لے کر
ابلقِ صبح روانہ ہوگا

پھر سرِ شاخِ شعاعِ خورشید
نکہتِ گل کا بسیرا ہوگا

اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی
اک شرر پھول میں لرزا ہوگا

تجھ کو ہر پھول میں عریاں سوتے
چاندنی رات نے دیکھا ہوگا

دیکھ کر آئنۂ آبِ رواں
پتہ پتہ لبِ گویا ہوگا

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر
چاند کس شہر میں اترا ہوگا

○

وا ہوا پھر درِ میخانۂ گل
پھر صبا لائی ہے پیمانۂ گل

زمزمہ ریز ہوئے اہلِ چمن
پھر چراغاں ہوا کاشانۂ گل

رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری
لے کے پھر آئی ہے نذرانۂ گل

پھول برسائے یہ کہہ کر اس نے
میرا دیوانہ ہے دیوانۂ گل

پھر کسی گل کا اشارا پا کر
چاند نکلا سرِ میخانۂ گل

پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا
سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گل

آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گل

آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں
ہم سے تھی رونقِ کاشانۂ گل

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل

کل ترا دور تھا اے بادِ صبا
ہم ہیں اب سرخیِ افسانۂ گل

ہم ہی گلشن کے امیں ہیں ناصر
ہم سا کوئی نہیں بیگانۂ گل

○

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اوّلیں قرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزرگاہِ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

ایسا الجھا ہوں غمِ دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جن کا خیال
اُس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یاد ہے سیرِ چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

○

سازِ ہستی کی صدا غور سے سن — کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن
دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان — شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سن
چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان — ڈوبتے دن کی ندا غور سے سن
کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سرِ شام — روح کے تار ہلا غور سے سن
یاس کی چھاؤں میں سونے والے — جاگ اور شورِ درا غور سے سن
ہر نفس دامِ گرفتاری ہے — تو گرفتار رہا غور سے سن
دل تڑپ اٹھتا ہے کیوں آخرِ شب — دو گھڑی کان لگا غور سے سن
اسی منزل میں ہیں سب ہجر و وصال — رہرو آبلہ پا غور سے سن
اسی گوشے میں ہیں سب دیر و حرم — دل صنم ہے کہ خدا غور سے سن
کعبہ سنسان ہے کیوں اے واعظ — ہاتھ کانوں سے اٹھا غور سے سن
موت اور زیست کے اسرار و رموز — آ مری بزم میں آ غور سے سن
کیا گزرتی ہے کسی کے دل پر — تو بھی اے جانِ وفا غور سے سن
کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ جمال — شب گزیدوں کی دعا غور سے سن
ہے یہی ساعتِ ایجاب و قبول — صبح کی لَے کو ذرا غور سے سن
کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں — کیا سناتی ہے صبا غور سے سن
برگِ آوارہ بھی اک مطرب ہے — طائرِ نغمہ سرا غور سے سن
رنگِ منت کشِ آواز نہیں — گل بھی ہے ایک نوا غور سے سن
خامشی حاصلِ موسیقی ہے — نغمہ ہے نغمہ نما غور سے سن
آئینہ دیکھ کے حیران نہ ہو — نغمۂ آبِ صفا غور سے سن
عشق کو حسن سے خالی نہ سمجھ — نالۂ اہلِ وفا غور سے سن
دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے — میں نہیں تجھ سے جدا غور سے سن

ہر قدم راہِ طلب میں ناصر
جرسِ دل کی صدا غور سے سن

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گل اداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

میں رو رہا تھا مقدر کی سخت راہوں میں
اڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے ابھر ابھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذرا سی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا
بلا رہا ہے کوئی بام سے اتر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے ادھر ادھر کے مجھے

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

اب تو جھونکے سے لرز اٹھتا ہوں
نشۂ خوابِ گراں تھا پہلے

اب تو منزل بھی ہے خود گرمِ سفر
ہر قدم سنگِ نشاں تھا پہلے

سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے

یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب
اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے

یوں نہ گھبرائے ہوئے پھرتے تھے
دل عجب کنجِ اماں تھا پہلے

ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے

اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

اڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طیور
سرو اک شوخ جواں تھا پہلے

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن
اس قدر دور کہاں تھا پہلے

کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

ہم نے بخشی ہے خموشی کو زباں
درد مجبورِ فغاں تھا پہلے

ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق
شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے

ہم نے روشن کیا معمورۂ غم
ورنہ ہر سمت دھواں تھا پہلے

ہم نے محفوظ کیا حسنِ بہار
عطرِ گل صرفِ خزاں تھا پہلے

غم نے پھر دل کو جگایا ناصر
خانہ برباد کہاں تھا پہلے

ابنِ انشا

○

اور تو کوئی بس نہ چلے گا ہجر کے درد کے ماروں کا
صبح کا ہونا دوبھر کر دیں رستہ روک ستاروں کا

جھوٹے سکوں میں بھی اٹھا دیتے ہیں یہ اکثر سچا مال
شکلیں دیکھ کے سودے کرنا، کام ہُوا بنجاروں کا

اپنی زباں سے کچھ نہ کہیں گے چپ ہی رہیں گے عاشق لوگ
تم سے تو اتنا ہو سکتا ہے پوچھو حال بچاروں کا

جس جپسی کا ذکر ہے تم سے دل کو اسی کی کھوج رہی
یوں تو ہمارے شہر میں اکثر میلہ لگا ہے نگاروں کا

ایک ذرا سی بات تھی جس کا چرچا پہنچا گلی گلی
ہم گمناموں نے پھر بھی احسان نہ مانا یاروں کا

درد کا کہنا چیخ ہی اٹھو، دل کی نصیحت وضع نبھاؤ
سب کچھ سہنا چپ چپ رہنا کام ہے عزت داروں کا

انشا اب انہی اجنبیوں میں چین سے باقی عمر کٹے
جن کی خاطر بستی چھوڑی نام نہ لو ان پیاروں کا

○

سانحہ ہم پہ یہ پہلا ہے مری جاں کوئی
ویسے دامن سے ملا آتا ہے گریباں کوئی

قیس صاحب کا تو اس غم میں عجب حال ہُوا
اپنے رستے میں نہ پڑتا ہو بیاباں کوئی

ہم نے اپنے کو کوئی دیر سنبھالا ہوتا
آن نکلے اگر آنسو سرِ مژگاں کوئی

یارو اس دردِ محبت کی دوا بتلاؤ
ڈھونڈ لیں گے غمِ دوراں کا تو درماں کوئی

یک نظر دیکھنا، رم کرنا، ہوا ہو جانا
ان سے چھوٹی ہے بھلا خوئے غزالاں کوئی

ہم کسی سمت بھی نکلیں وہیں جا کر نکلیں
ہم سے بھولی ہے رہِ کوچۂ جاناں کوئی

اب تری یاد میں رُو دیں گے نہ حیراں ہوں گے
آن پیماں ہے کوئی دل سے ہے پیماں کوئی

سونی راتوں میں سرِ بسترِ خوابِ راحت
بیٹھا رہتا ہے کسی بات پہ گریاں کوئی

بھیگی شاموں میں کھلے صحن میں تنہا تنہا
کھویا کھویا نظر آتا ہے خراماں کوئی

دوستو! او دوستو! اس شخص کو جا کر سمجھاؤ
اپنے انشا کے سنبھلنے کا بھی ساماں کوئی

یہ بھی ہم لوگوں کی وحشت پہ ہنسا کرتا تھا
آیا اس خانۂ ویراں میں بھی مہماں کوئی

○

دل سی چیز کے گاہک ہوں گے دو یا ایک ہزار کے بیچ
انشاؔ جی کیا مال لیے بیٹھے ہو تم بازار کے بیچ

پینا پلانا عین گنہ ہے، جی کا لگانا عین ہوس
آپ کی باتیں سب سچی ہیں، لیکن بھری بہار کے بیچ؟

اے سخیو! اے خوش نظرو! یک گونہ کرم خیرات کرو
نعرہ زناں کچھ لوگ پھریں ہیں صبح سے شہر نگار کے بیچ

خار و خس و خاشاک تو جانیں، ایک تجھی کو خبر نہ ملے
اے گل خوبی ہم تو عبث بدنام ہوئے گلزار کے بیچ

منت قاصد کون اٹھائے، شکوۂ درباں کون کرے
نامۂ شوق غزل کی صورت چھپنے کو دو اخبار کے بیچ

○

ساون بھادوں ساٹھ ہی دن ہیں پھر وہ رت کی بات کہاں
اپنے اشک مسلسل برسیں اپنی سی برسات کہاں

چاند نے کتنی باتیں کر لیں — نکلا، چمکا، ڈوب گیا
ہم بھی آنکھ جھپک لیں سو لیں۔ اے دل ہم کو رات کہاں

قیس کا نام سنا ہے تم نے ہم سے اب ملاقات کرو
عشق و جنوں کی منزل مشکل سب کی یہ اوقات کہاں

پیت کا کاروبار بہت ہے اب تو اور بھی پھیل چلا
اور جو کام جہاں کے دیکھیں فرصت دیں حالات کہاں

انشاؔ جی ہم نظم کے شاعر، پھر بھی — خیر جو ہیں سو ہیں
کام کی بات غزل میں کہنا سب کے بس کی بات نہیں

○

کبھی ان کے ملن کی آشا نے اک جوت جگا دی تھی من میں — اب من کا اجالا سنولایا، پھر شام ہے اپنے آنگن میں

جی گھلتا ہے آنسو ڈھلتے ہیں، ہر نیر میں دیپ سے جلتے ہیں — اس برکھا سے جی کی آگ بجھے؟ یہ تو اور بھی بھڑکے ساون میں

کبھی بول مدھر، کبھی نین کنول، ان گلیوں میں تم ہمیں لے آئے — اس من کو نہ لوگو بھٹکاؤ، یہ من ہے کسی کے بندھن میں

ہر شکل کا روپ نہیں ہوتا، ہر روپ کو نام نہیں دیتے — کچھ شکلیں ہیں اپنی آنکھوں میں، کچھ روپ ہیں اپنے درپن میں

کبھی ان کے اجنتا میں آؤ، وہ مورتیں تم کو دکھلائیں — وہ مورتیں تم کو دکھلائیں ہم کھو گئے جن کے درشن میں

یہ چھیل چھبیلا کون پھرے اس متھرا کی نگری میں سکھیو! — کبھی باتیں کہ اپنے شیام میں تھیں، اب دیکھو تو اس نگر بن میں

ہر ایک پہ نظریں اٹھتی تھیں، ہر ایک پہ جی کو مچلنا تھا — اس شہر میں روپ کا کال نہیں کچھ، ادھر ہے اپنے ساجن میں

یا ان میں چکا لیے ملتے ہیں، یا بیت کے مارے ملتے ہیں — کچھ پورب ہیں، کچھ پچھم میں، کچھ اتر میں، کچھ دکھن میں

شہروں میں پھرے بنیا سی لیے جھنا کے تئیں بھگوان کے — انشا سا کوئی رمتا دیکھا؟ کہنے کو ہیں جوگی ہر بن میں

اس حسن کے نام پہ یاد آئے سب منظر فیض کی نظموں کے — وہی رنگِ حنا، وہی بندِ قبا، وہی پھول کھلے پیراہن میں

ہم لوگوں کے آنے سے پہلے بھی تم لوگ ادھر سے گزرتے تھے — کبھی پھول ابھی دیکھے غرفوں میں، کبھی قوس قزح کسی چلمن میں

ہم ان سے جو مل کر دور ہوئے، مجبور ہوئے، رنجور ہوئے — اب دل کا لہو کا تا مشکل ہے، ہاں جان بسے گی ادھن میں

تم لوگوں نے چاند بجھا ڈالا، شبِ ماہ کا لطف گنوا ڈالا — اب لاکھ چراغ جلاتے پھرو، ہو راستے پہ ہر روزن میں

کبھی میر فقیر کی بیتوں سے، کبھی غزلوں سے انشا صاحب کی

ان برہ کی بے کل راتوں میں ہم جوت جگاتے ہیں من میں

○

ہم رات بہت روئے بہت آہ و فغاں
دل درد سے بوجھل ہو تو پھر نیند کہاں
سر زانو پہ رکھے ہوئے کیا سوچ رہی
کچھ بات سمجھتی ہو محبت زدگاں
تم میری طرف دیکھ کے چپ ہو سی گئی
وہ ساعتِ خوش وقت نشاطِ گزراں
اک دن یہ سمجھتے تھے کہ پایانِ تمنا
اک رات ہے مہتاب کے ایامِ جواں
اب اور ہی حالت ہے مگر جانِ تمنا
ہم نالہ کشاں، بے گنہاں، غم زدگاں
اس گھر کی کھلی چھت پہ چمکتے ہوئے
کہتے ہو کبھی آتے وہاں جا کے یہاں
برگشتہ ہوا ہم سے یہ مہتاب تو پیا
بس بات سنی، راہ چلا، کاہکشاں
انشا سے ملو اس سے نہ روکیں گے
اس سے یہ ملاقات نکالی ہے کہاں
مشہور ہے ہر بزم میں اس شخص کا
باتیں ہیں بہت شہر میں بدنام میاں
اے دوستو اے دوستو اے درد
گلیوں میں چلو سیر کریں شہرِ بتاں
ہم جائیں کسی سمت کسی چوک میں
کہنا نہ کوئی بات کسی سود و زیاں
انشا کی غزل سن لو پہ رنجور نہ
دیوانہ ہے دیوانے نے اک بات
ہوتا ہے یہی عشق میں بیمار
باتیں یہی دیکھی ہیں محبت زدگاں

مُتغزّلین جدید

(۲)

آنند نرائن مُلّا

○

...پ کے دنیا سے سوادِ دلِ خاموش میں آ
...یہاں تو مری ترسی ہوئی آغوش میں آ

...ر دنیا میں کہیں تیرا ٹھکانا ہی نہیں
...ے مرے دل کی تمنا لبِ خاموش میں آ

...ے رنگیں پسِ پردہ اشارے کب تک
...ے دن ساغرِ رندانِ بلانوش میں آ

...ق کرتا ہے تو پھر عشق کی توہین نہ کر
...تو بیہوش نہ ہو، ہو تو نہ پھر ہوش میں آ

...دل دے نہ کہیں جوہرِ انساں کا بھی رنگ
...ے زمانے کے لہو دیکھ نہ یوں جوش میں آ

...ہ کیا دام لگاتی ہے نگاہِ مُلّا
...چہ تمنا! تو کبھی دستِ تخیل افروش میں آ

○

نگاہ و دل کا افسانہ قریبِ اختتام آیا
ہمیں اب اس سے کیا، آئی سحر یا وقتِ شام آیا

زبانِ عشق پہ اک چیخ بن کر تیرا نام آیا
خرد کی منزلیں طے ہو چکیں دل کا مقام آیا

اُٹھانا ہے جو پتھر رکھ کے سینہ پہ وہ گام آیا
محبت میں تری ترکِ محبت کا مقام آیا

اِسے آنسو نہ کہہ اک یادِ ایامِ گذشتہ ہے
مری عمرِ رواں کو عمرِ رفتہ کا سلام آیا

ذرا لو اور دل کی تیز کر سیلا سا یہ شعلہ
نہ روشن کر سکا گھر کو نہ محفل ہی کے کام آیا

مکمل تبصرہ کرتا ہوا ایامِ رفتہ پہ
نگاہِ بے سخن میں ایک اشکِ بے کلام آیا

توانا کو بہانہ چاہیے شاید تشدد کا
پھر اک مجبور پر شوریدگی کا اتہام آیا

نہ جانے کتنی شمعیں گُل ہوئیں کتنے بجھے تارے
تب اک خورشید اتراتا ہوا بالائے بام آیا

برہمن آبِ گنگا، شیخ کوثر لے اُڑا اس سے
ترے ہونٹوں کو جب چھوتا ہوا مُلّا کا جام آیا

روشؔ صدیقی

اس سے بڑھکر تو کوئی بے سر و ساماں نہ ملا
دِل ملا جس کو مگر دردِ غریباں نہ ملا

اک ذرا ذوقِ تجسس میں بڑھایا تھا قدم
نکہتِ گل کو پھر آغوشِ گلستاں نہ ملا

تلخیٔ بادۂ اندوہ وفا کیا کم ہے
اس میں اے دوست یہ زہرِ غمِ دوراں نہ ملا

کرلیا ہم نے گوارا غمِ آشفتہ سری
جب کسی طرح مزاجِ دلِ خوباں نہ ملا

اب کہاں جائیں بتاؤ تو کچھ اے اہلِ حرم
بُت کدے میں بھی وہ غارت گرِ ایماں نہ ملا

نسبتِ پائے نگاریں ہے یہ اے موجِ نسیم
خاک سے سلسلۂ لالہ و ریحاں نہ ملا

بات اتنی سی ہے اے واعظِ افلاک نشیں
کیا ملے گا اسے یزداں جسے انساں نہ ملا

ان سے اب تذکرۂ دولتِ کونین ہے کیوں
جن غریبوں کو ترا گوشۂ داماں نہ ملا

زندگی نام ہے طوفانِ حوادث کا روشؔ
ننگِ ساحل ہے وہ جس کو کوئی طوفاں نہ ملا

عمرِ ابد سے خضر کو بیزار دیکھ کر
خوش ہوں فسونِ نرگسِ بیمار دیکھ کر

کیا جلوہ گاہِ حسرتِ نظارہ ہے بہشت!
حیراں ہوں صورتِ در و دیوار دیکھ کر

بادہ بقدرِ ظرف سہی رسمِ میکدہ
ساقی! نزاکتِ دلِ مے خوار دیکھ کر

اب جستجوئے دوست کی منزل کہیں بھی ہو
ہم چل پڑے ہیں راہ کو دشوار دیکھ کر

شایانِ جرمِ عشق نہ تھی قیدِ زندگی
جی شاد ہو گیا رسن و دار دیکھ کر

اب اس سے کیا غرض یہ حرم ہے کہ دیر ہے
بیٹھے ہیں ہم تو سایۂ دیوار دیکھ کر

اب حشر تک حجاب نشیں ہے نگاہِ شوق
پلٹا تھا رنگِ حسرتِ دیدار دیکھ کر

رازِ فروغِ آخرِ شب کچھ نہ کھل سکا
کیوں خوش ہے شمع صبح کے آثار دیکھ کر

سازِ غزل اٹھا ہی لیا ہم نے اے روشؔ
اُس چشمِ نیم باز کا اصرار دیکھ کر

میراجی

○

ہنسو تو ساتھ ہنسے گی دنیا، بیٹھ اکیلے رونا ہوگا
چپکے چپکے بہا کر آنسو، دل کے دکھ کو دھونا ہوگا

بیرن ریت بڑی دنیا کی، آنکھ سے ٹپکا جو بھی موتی
پلکوں ہی سے اٹھانا ہوگا، پلکوں ہی سے پرونا ہوگا

پیاروں سے مل جائیں پیارے، ان ہونی کب ہونی ہوگی
کانٹے پھول بنیں گے کیسے، کب سکھ سیج بچھونا ہوگا

بہتے بہتے کام نہ آئے لاکھوں بھنور طوفانی ساگر
اب منجدھار میں اپنے ہاتھوں جیون ناؤ ڈبونا ہوگا

میراجی کیوں سوچ ستائے، پلک پلک ڈوری لہرائے
قسمت جو بھی رنگ دکھائے اپنے دل میں سمونا ہوگا

○

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا، کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کیں!
کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بری جیسی بھی گزری اُن کے سہارے گزری ہے
حضرت دل جب ہاتھ بڑھائیں، ہر مشکل آسان کریں!

ایک ٹھکانا آگے آگے، پیچھے پیچھے مسافر ہے!
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا عنوان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں تو مبادا دونوں، باہم کچھ احسان کریں

دست مزد میں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
ایک ہی نعرہ کافی ہے بربادیٔ ہمہ ایوان کریں

میر ملے تھے میراجی سے باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ اُن کا بھی دیوان کریں

جلال الدین اکبرؒ

○

خاموش ہیں لب اور آنکھوں سے آنسو ہیں کہ پیہم بہتے ہیں
ہم سامنے اُن کے بیٹھے ہیں اور قصۂ فرقت کہتے ہیں

اب حُسن و عشق میں فرق نہیں اب دونوں کی اک حالت ہے
میں اُن کو دیکھتا رہتا ہوں، وہ مجھ کو دیکھتے رہتے ہیں

ان کی وہ حیا، وہ خاموشی، اپنی وہ محبت کی نظریں
وہ سُننے کو سب کچھ سنتے ہیں ہم کہنے کو سب کچھ کہتے ہیں

اس شوقِ فراواں کی یارب آخر کوئی حد بھی ہے کہ نہیں
انکار کریں وہ یا وعدہ ہم راستہ دیکھتے رہتے ہیں

ہمدرد نہیں ہمراز نہیں کس سے کہئے، کیوں کر کہئے
جو دل پہ گزرتی رہتی ہے جو جان پہ صدمے سہتے ہیں

آ دیکھ کے ظالم فرقت میں کیا حال مرا بے حال ہوا
آہوں سے شرارے جھڑتے ہیں آنکھوں سے دریا بہتے ہیں

اکبر شاید دل کھو بیٹھے وہ جلسے وہ احباب نہیں
تنہا خاموش سے پھرتے ہیں ہر وقت اداس سے رہتے ہیں

○

ہر آن ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے!

کیا آپ جانتے ہیں، مجھے تو خبر نہیں
کہتے ہیں لوگ مجھ کو محبت ہے آپ سے

اس دل کی آرزوئے محبت کو کیا کہوں
جس دل کو آرزوئے محبت ہے آپ سے

رونا تو ہے یہی کہ نہیں آہ میں اثر
شکوہ ہے آپ سے نہ شکایت ہے آپ سے

آلِ احمد سرورؔ

○

غیرتِ عشق کا یہ ایک سہارا نہ گیا
لاکھ مجبور ہوئے ان کو پکارا نہ گیا

کیا لہو روئے تو آیا ہے بہاروں کا سلام
صرف خوابوں سے حقائق کو سنوارا نہ گیا

معرکۂ عشق کا سر دے کے بھی سر ہو نہ سکا
کون راہی تھا جو اس راہ میں مارا نہ گیا

وہ بھی وقت آئے ساقی بھی بدل جاتے ہیں
مے کدے پہ کبھی مستوں کا اجارا نہ گیا

شوق کی بات کب الفاظ میں ڈھل سکتی تھی
اس پری کو کبھی شیشے میں اتارا نہ گیا

گاہ ٹکرا دئے شیشے، کبھی چھلکا دئے جام
رائگاں ایک بھی ساقی کا اشارا نہ گیا

آئینے جتنے بھی دیکھے وہ مکدر تھے سرورؔ
جوہرِ صدق و صفا پھر بھی ہمارا نہ گیا

○

ہم برق و شرر کو کبھی خاطر میں نہ لائے
اس فتنۂ دوراں کو مگر دیکھ نہ پائے

گو قطرے میں دریاؤں کا طوفان سمائے
پر شوق کی روداد کب الفاظ میں آئے

زلفوں کو دیا ہے رخِ زیبا نے عجب رنگ
جلووں سے ترے اور بھی روشن ہوئے سائے

یہ عشق کے شعلے بھی عجب چیز ہیں یعنی
جو آگ لگائے وہی خود آگ بجھائے

ڈھلتی ہے وہ مے اک ترے پیمانے میں ساقی
مستی کو بھی جو ہوش کے آداب سکھائے

تیری ہی نگاہوں کا تصرف تھا کہ ہم نے
رعنائیِ افکار کے اعجاز دکھائے

جس دل پہ کسی کی نگہِ لطف پڑی تھی
بیٹھے ہیں سرورؔ اس کو کلیجے سے لگائے

ماہر القادری

○

احساس خوشی مٹ جاتا ہے، افسردہ طبیعت ہوتی ہے
دل پر وہ گھڑی بھی آتی ہے جب غم کی ضرورت ہوتی ہے

دو حرف بھی میرے سن نہ سکے، تم اتنے کیوں بیزار ہوئے
میں نے تمہیں اپنا سمجھا تھا، اپنوں سے شکایت ہوتی ہے

یہ سود و زیاں کے پیمانے، یہ جھوٹے سچے افسانے
ان اہلِ ہوس کی باتوں سے بدنام محبت ہوتی ہے

اک دوسری بوتل آنے تک، یہ دُردِ تہِ ساغر ہی سہی
او تشنۂ مے! بیتاب نہ ہو، ساقی کو ندامت ہوتی ہے

ماہر کی سادہ باتوں سے اللہ بچاتا ہی رکھے!
خود تو یہ بڑے ہی حضرت ہیں اوروں کو نصیحت ہوتی ہے

○

دل میں اب آواز کہاں ہے
ٹوٹ گیا تو ساز کہاں ہے

آنکھ میں آنسو لب پہ خموشی
دل کی بات اب راز کہاں ہے

سرو و صنوبر سب کو دیکھا!
ان کا سا انداز کہاں ہے

دل خوابیدہ، رُوح فسردہ
وُہ جوشِ آغاز کہاں ہے

پردہ بھی جلوہ بن جاتا
آنکھ تجلّی ساز کہاں ہے

بُت خانے کا عزم ہے ماہر
کعبے کا در باز کہاں ہے

سراج الدین ظفر

اٹھو زمانے کے آشوب کا ازالہ کریں
بنامِ گل بدناں رخ سوئے پیالہ کریں
بیادِ دیدۂ مخمور پر پیالہ کریں
اٹھو کہ زہر کا پھر زہر سے ازالہ کریں
وہ رند ہیں نہ اٹھائیں بہار کا احساں
درود ہم تری خلوت میں بے حوالہ کریں
کہاں کے دیر و حرم آؤ ایک سجدۂ شوق
بپائے ہوشربایانِ بست سالہ کریں
برس پڑے جو گلستاں میں ابر لطف سے شراب
بہک بہک کے ہم آگے سبوئے لالہ کریں
سبو اٹھا کہ گدایانِ کوئے مے خانہ
ترے حوالے مہ و مہر کا قبالہ کریں
حدیثِ زہد ہو یا وارداتِ زہرہ وشاں
کسی کے نام کو ہم زیبِ ہر مقالہ کریں
دکھا صحیفۂ رخ اس طرح کہ اہلِ بہار!
ورق ورق بخجالت بیاضِ لالہ کریں
اٹھو جلا کے مئے سرخ سے چراغِ ابد
نشاطِ صحبتِ شب کو ہزار سالہ کریں
ارادہ نیچی نگاہوں کی ہے کہ جیسے ظفر
تلاشِ گنجِ غزالانِ خورد سالہ کریں

درِ مے خانہ سے دیوارِ چمن تک پہنچے
ہم غزالوں کے تعاقب میں ختن تک پہنچے
ہاتھ میخواروں کے بے قصد اٹھے تھے لیکن
اتفاقاً ترے گیسو کی شکن تک پہنچے
مدرسے میں کہاں اس زلف کا موضوعِ جدید
لوگ پہنچے تو رواياتِ کہن تک پہنچے
راستہ ایک تھا ہم عشق کے دیوانوں کا
قدِ گیسو سے چلے دار و رسن تک پہنچے
آئیں ہم وسعتِ ازلی پہ تو میخانے سے
سلسلۂ انجمنِ سرو و سمن تک پہنچے
اک قبائے سبک و تنگ میں ہو سو میں طلسم
کیا کوئی حسن کے اسرارِ کہن تک پہنچے
آپ ہی آپ جو کھل جائے تری زلفِ دراز
ناگہاں بے ہنری نقطۂ فن تک پہنچے
اے سخن فہم ہم اس بزم سے آئے ہیں جہاں
حیرتِ آئینہ اسلوبِ سخن تک پہنچے
اس طرح شوقِ غزالاں میں غزلخواں ہو ظفر
شہرتِ مشکِ غزل شہرِ ختن تک پہنچے

مختار صدیقی

○

موت کو زیست ترستی ہے یہاں
موت ہی کون سی سستی ہے یہاں

دم کی مشکل نہیں آساں کرتے
کس قدر عقدہ پرستی ہے یہاں

سب خرابے ہیں تمناؤں کے
کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں

چھوڑو بے صرفہ ہیں ساون بھادوں
دیکھو ہر آنکھ برستی ہے یہاں

اب تو ہر اوج کا تارا ڈوبا
اوج کا نام ہی پستی ہے یہاں

○

تھی تو سہی پہ آج سے پہلے ایسی حقیر و فقیر نہ تھی
دل کی شرافت ذہن کی جودت اتنی بڑی تقصیر نہ تھی

سچ کہتے ہو ہم ایسے کہاں اور سوز و گدازِ عشق کہاں
سچ ہے مرے آشفتہ دل میں کوئی کبھی تصویر نہ تھی

اب جو اچاٹ ہوئی ہے طبیعت شاید اب ہم رخصت ہیں
بن کارن، بے بات وگرنہ، ایسی کبھی دلگیر نہ تھی

اہلِ جنوں کو فصلِ خزاں سے اب کے بھی گو نہ ربط رہا
اب کے بہار وہ آئی کہ جس کی بوئے گل بھی سفیر نہ تھی

آخر غیرت نے سمجھایا، نومیدانہ زیست کریں
باقی ہر تدبیر تو کی جو اپنے خلاف ضمیر نہ تھی

یوسف ظفر

○

تعمیرِ زندگی کو نمایاں کیا گیا
تخریبِ کائنات کا ساماں کیا گیا

گلشن کی شاخ شاخ کو ویراں کیا گیا
یوں بھی علاجِ تنگیٔ داماں کیا گیا

کھوئے ہوؤں پہ تیری نظر کی نوازشیں
آئینہ دے کے اور بھی حیراں کیا گیا

آوارگیٔ زلف سے آسودگی ملی!
آسودگی ملی کہ پریشاں کیا گیا

وہ خوش نصیب ہوں کہ غمِ التفات سے
میرے غمِ حیات کا درماں کیا گیا

تنہائیاں بچھا کے جہانِ خراب میں
میرے لئے نگاہ کا ساماں کیا گیا

پھیلا کے بے ثباتیٔ عالم کی داستاں
مجھ پر حرام کیفِ بہاراں کیا گیا

بھڑکا کے آتشِ رخِ جاناں کی آرزو
مجھ کو رہینِ آتشِ دوراں کیا گیا

نومیدیٔ طلب سے بڑھا کے طلب کا رنگ
امیدِ دیدِ دوست کو ارزاں کیا گیا

یہ بھی کرم کہ مجھ کو شبانِ سیاہ میں
ناسورِ دل نوازیٔ ہجراں کیا گیا

جمعیتِ جمال کا حسنِ کمال دیکھ
آخر یہی ہوا کہ پریشاں کیا گیا

دیکھ چمن چمن کو بہار و خزاں کا رنگ
میرے خیال و خواب پہ احساں کیا گیا

آ، اور کائنات کے پھولوں کی داد دے
جن سے ترا جمال نمایاں کیا گیا

○

یارو! ہر غم غمِ یاراں ہے قریب آجاؤ
پیارو پھر فصلِ بہاراں ہے قریب آجاؤ

دور ہو کر بھی سنیں تم نے حکایاتِ وفا
قرب میں بھی وہی عنواں ہے قریب آجاؤ

ہم محبت کے مسافر ہیں کہیں دیکھ نہ لے
گھات میں گردشِ دوراں ہے قریب آجاؤ

جان پیاری ہے کہ تم بھی ہو مری جان کہ یہ
غمِ جاں ہی غمِ جاناں ہے قریب آجاؤ

آج دنیا کو نہیں اپنے غموں سے فرصت
آج مل بیٹھنا آساں ہے قریب آجاؤ

کس مروت پہ زمانے سے ڈریں، دور رہیں
آؤ اللہ نگہباں ہے قریب آجاؤ

میرے ہی پہلوئے سوزاں میں سکوں ممکن ہے
چار سو گردشِ دوراں ہے قریب آجاؤ

جاؤ، اب جاؤ، کہ وہ عہدِ وفا ختم ہوا
جب بھی دیکھو کہ پھر امکاں ہے قریب آجاؤ

میں زمانے کی کڑی دھوپ کا مارا ہوں ظفر
تم جہاں ہو چمنستاں ہے قریب آجاؤ

انجم رومانی

ہر چند انہیں عہد فراموش نہ ہوگا
لیکن ہمیں اس وقت کوئی ہوش نہ ہوگا

دیکھو گے تو آئے گی تمہیں اپنی جفا یاد
خاموش جسے پاؤ گے خاموش نہ ہوگا

گذرے ہیں وہ لمحے کہ سدا یاد رہیں گے
دیکھا ہے وہ عالم کہ فراموش نہ ہوگا

ہم اپنی شکستوں سے ہیں جس طرح بغل گیر
یوں تجھ سے بھی کوئی ہم آغوش نہ ہوگا

پی جاتے ہیں زہرِ غمِ ہستی ہو کہ مے ہو
ہم سا بھی زمانے میں بلانوش نہ ہوگا

ہونے کو تو دنیا میں کئی پردہ نشیں ہیں
لیکن تری صورت کوئی روپوش نہ ہوگا

پاؤ گے نہ آزادِ غمِ انجم کسی دل کو
ہوگا غمِ فردا جو غمِ دوش نہ ہوگا

جہاں تک گیا کاروانِ خیال
نہ تھا کچھ بجز حسرتِ پائمال

مجھے تیرا، تجھ کو ہے میرا خیال
مگر زندگی پھر بھی ہے خستہ حال

جہاں تک ہے دیر و حرم کا سوال
رہیں چپ تو مشکل، کہیں تو محال

تری کائنات ایک حیرت کدہ
شناسا مگر اجنبی خد و خال

مری کائنات ایک زخمِ کہن
مقدر میں جس کے نہیں اندمال

نئی زندگی کے نئے فکر و فن
نئے آدمی کی نئی چال ڈھال

ہوئے رخصت انجم سحر کے قریب
نہ دیکھا گیا شاید اپنا مآل

قیوم نظر

کیوں بیٹھ گئے غبار سے ہم
کچھ کہہ نہ سکے بہار سے ہم

یہ زندگی عمر بھر کا رونا
گھبرا گئے انتظار سے ہم

وہ جبر کی لذتوں کا عالم
باز آئے اس اختیار سے ہم

ہنستے ہیں کہ ہنس سکے زمانہ
خوش ہیں تو اس اعتبار سے ہم

یوں بھی تو سکوں ملا ہے برسوں
پھرتے رہے بے قرار سے ہم

وہ لمحہ ہے آج تک گریزاں
جب تم سے تھے ہمکنار سے ہم

اب آخر شب نظر ہے شاید
پھر جیسے ہیں ہوشیار سے ہم

ماتھے پر ٹیکا صندل کا اب، دل کے کارن رہتا ہے
مندر میں مسجد بنتی ہے مسجد میں برہمن رہتا ہے

ذرّے میں سورج اور سورج میں ذرّہ روشن رہتا ہے
اب من میں ساجن بستے ہیں اور ساجن میں من رہتا ہے

رُت بیت چکی ہے برکھا کی اور پیت کے ملنے بیٹھے ہیں
روتے ہیں رونے والوں کی آنکھوں میں ساون رہتا ہے

اک آہ نشانی جینے کی رہتی تھی مگر جب وہ بھی نہیں
کیوں دکھ کی مالا جپنے کو یہ تنکا سا تن رہتا ہے

اے مجھ پر ہنسنے اور کسی کو دیکھنے والو یہ تو کہو!
یوں کب تک جان پہ بنتی ہے یوں کب تک جوبن رہتا ہے

دل توڑ کے جانے والے سن دو اور بھی رشتے باقی ہیں
اک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اک پریم کا بندھن رہتا ہے

عبدالمجید حیرت

○

ایماں نواز گردشِ پیمانہ ہو گئی
ہم سے بھی ایک لغزشِ مستانہ ہو گئی

کوئی تو بات شمع کے جلنے میں تھی ضرور
جس پر نثار ہستیٔ پروانہ ہو گئی

صد شکر آج ہو تو گئی اُن سے گفتگو
یہ اور بات ہے کہ حریفانہ ہو گئی

اللہ رے اشکباریٔ شمعِ شبِ فراق
جو صبح ہوتے ہوتے اک افسانہ ہو گئی

حیرت کے غمکدے میں خوشی کا گزر کہاں
تم آ گئے تو رونقِ کاشانہ ہو گئی

○

مرہمِ زخمِ جگر ہو جائے
ایک ایسی بھی نظر ہو جائے

اک اشارہ بھی اگر ہو جائے
اس شبِ غم کی سحر ہو جائے

صبح یہ فکر کہ ہو جائے شام
شام کو، یہ کہ سحر ہو جائے

ہو نہ اتنا بھی پریشاں کوئی
کہ زمانے کو خبر ہو جائے

یوں تو جو کچھ بھی کسی پر گزرے
دل نہ افسردہ مگر ہو جائے

فکرِ فردا بھی کریں گے حیرت
پہلے یہ شب تو بسر ہو جائے

سکندر علی وجد

○

شمیمِ زلفِ یار آئے نہ آئے
مرے دل کو قرار آئے نہ آئے

ابھی آیا ہے ہوش اے یادِ جاناں
نہ تڑپا، بار بار آئے نہ آئے

چراغِ زندگانی بجھ رہا ہے
وہ جانِ انتظار آئے نہ آئے

کیا جو تم نے اپنے دل سے پوچھو
ہمارا اعتبار آئے نہ آئے

نگاہِ اہلِ گلشن کہہ رہی ہے
خزاں جائے، بہار آئے نہ آئے

بڑھے گا کارواں منزل بمنزل
غبارِ رہگذار آئے نہ آئے

○

جب وہ مسرور نظر آتا ہے
ہر طرف نور نظر آتا ہے

میں تو سے خوار نہوں تو کیوں ساقی!
نشے میں چُور نظر آتا ہے

قرب سے ہاتھ اُٹھایا میں نے
تو بڑی دُور نظر آتا ہے

میں ہی تنہا نہیں، دل کے ہاتھوں
تو بھی مجبور نظر آتا ہے

خاکساری کو چھپانے کے لئے
وجدؔ مغرور نظر آتا ہے

ادیب سہارنپوری

○

اک خلش کو حاصلِ عمرِ رواں رہنے دیا
جان کر ہم نے انہیں نامہرباں رہنے دیا

آرزوئے قرب بھی بخشی دلوں کو عشق نے
فاصلہ بھی میرے اُنکے درمیاں رہنے دیا

کتنی دیواروں کے سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
عشق نے لیکن ہمیں بے خانماں رہنے دیا

اپنے اپنے حوصلے اپنی طلب کی بات ہے
چن لیا ہم نے تمہیں سارا جہاں رہنے دیا

کون اس طرزِ جفائے آسماں کی داد دے
باغ سارا پھونک ڈالا آشیاں رہنے دیا

یہ بھی کیا جینے میں جینا ہے بغیر اُنکے ادیب
شمع گل کر دی گئی باقی دھواں رہنے دیا

○

وہ پَو پھٹی وہ کرن سے کرن میں آگ لگی
وہ شب کی زلفِ شکن در شکن میں آگ لگی

سلگ اُٹھی وہ ردائے نجوم و کاہکشاں!
وہ دیکھ دامنِ چرخِ کہن میں آگ لگی

نشاطِ گرمیِ محفل تھی جس کی تابانی
اسی چراغ سے کیوں انجمن میں آگ لگی

ہزار شمس و قمر بجھ گئے، پہ یہ نہ بجھی!
یہ کس دیئے سے پتنگوں کے من میں آگ لگی

تمام عمر کے آنسو اسے بجھا نہ سکے
جو دل سے تا بہ جگر دم زدن میں آگ لگی

بُھلا سکے گی نہ دُنیا یہ حادثہ کہ ادیب
چراغِ لالہ و گل سے چمن میں آگ لگی

ذوالفقار علی بُخاری

○

بسائی مَیں نے جو قلبِ حزیں میں — وہ دُنیا کام آئی کارِ دیں میں
وہی ہے اصل میں جانِ تمنّا — جو حسرت ہے نگاہِ واپسیں میں
ترے شوقِ سراپا کی کشش سے — سمٹ آیا ہوں مَیں اپنی جبیں میں
ہے پیچ و تاب میں ہر موجِ ساحل — وہ بیتابی ہے موجِ تہ نشیں میں
حقیقت ہے کہ تم ہو جانِ خوبی — کہ خوبی ہے وطن کی سرزمیں میں
محبت ہے کہ وُہ عکسِ مسرت — اتر آیا مرے قلبِ حزیں میں
جنوں کے راج میں انصاف ہوگا — نہ ہوگا فرق جیب و آستیں میں
بہت کچھ پاؤ گے دنیا میں پیارے — محبت پاؤ گے لیکن ہمیں میں

بخاریؔ کی تڑپ، حافظؔ کی مستی
تمہارے نغمۂ وجد آفریں میں

○

زندگی آزار تھی آزار ہے تیرے بغیر
کارِ سہلِ مرگ بھی دشوار ہے تیرے بغیر

کام یوں اکثر رکے جیسے کبھی چلتے نہ تھے
عمرِ فانی وقتِ بے رفتار ہے تیرے بغیر

کیا بتاؤں کس طرح اب کٹ رہی ہے زندگی
میری ہر ہر سانس اک تلوار ہے تیرے بغیر

تیرا غم تھا اور تجھ ہی سے بیاں کرتا تھا میں
کون سا غم قابلِ اظہار ہے تیرے بغیر

میرے غم کی تلخیوں کا اس سے کچھ اندازہ [illegible]
مجھ کو مے نوشی سے بھی انکار ہے تیرے بغیر

غلام ربّانی تاباںؔ

○

جنوں خود نما خود نگر بھی نہیں
خرد کی طرح کم نظر بھی نہیں

کوئی راہزن کا خطر بھی نہیں
کہ دامن میں گردِ سفر بھی نہیں

یہاں ہوش و ایماں سبھی لُٹ گئے
مزا یہ ہے ان کی خبر بھی نہیں

غمِ زندگی اک مسلسل عذاب
غمِ زندگی سے مفر بھی نہیں!

نظر معتبر ہے خبر معتبر
مگر اس قدر معتبر بھی نہیں

تری انجمن مرکزِ آرزُو!
تری انجمن میں گزر بھی نہیں

کہاں جائیں تاباںؔ گنہگارِ شوق
سزا بھی نہیں درگزر بھی نہیں!

○

چھٹے غبارِ نظر بامِ طور آ جائے
پیو شراب کہ چہرہ پہ نُور آ جائے

اُٹھاؤ جام بنامِ حیات بادہ کشو
نظارے جُھوم میں، نظر کو سرور آ جائے

شراب خانہ میں کوثر کا ذکر! کیا کہئے
کسی کی عقل میں جیسے فتُور آ جائے

تمام زہد و ریاضت ہو غرقِ موجِ شراب
جو میکدے میں وُہ شیدائے حور آ جائے

مقامِ دار سے گُذرو تو زندگی پاؤ!
پیو جو زہرِ ہلاہل سرور آ جائے

نگاہ تیز، نفس گرم، آرزُو بیباک!
جسے ہو ناز ہمارے حضور آ جائے!

یہ کاروبارِ مشیت بھی خوب ہے تاباں!
کسی پہ برق گرے زد پہ طور آ جائے

نقی

رازؔ مُرادآبادی

○

ہر اک شکستِ تمنا پہ مُسکراتے ہیں
وُہ کیا کریں جو مسلسل فریب کھاتے ہیں

کبھی کبھی تو وہ اس طرح یاد آتے ہیں
ہم اسکے بعد ہر اک شے کو بھول جاتے ہیں

یقینِ عشق نہیں، اعتبارِ حُسن نہیں
یہ وہم کیا مرے دل میں سمائے جاتے ہیں

نگاہِ ناز بھی کیا چیز ہے، خُدا جانے
نظر کے ساتھ زمانے بدلتے جاتے ہیں

کسی کے وعدۂ صبر آزما کی خیر کہ ہم
اب اعتبار کی حد سے گزرتے جاتے ہیں

○

غم کہ تھا حریفِ جاں اب حریفِ جاناں ہے
اب وہ زلف برہم ہے اب وہ چشم گریاں ہے

وسعتوں میں دامن کی ان دنوں گریباں ہے
ہم نفس کہیں شاید موسمِ بہاراں ہے

رنگ و بُو کے پردے میں کون یہ خراماں ہے
ہر نفس معطّر ہے ہر نظر غزل خواں ہے

بندگی یہ کیا جانے، دیر کیا، حرم کیا ہے
ہم جہاں یہ ہیں واعظ، کفر ہے نہ ایماں ہے

شکریہ مگر ناصح تو یہ رازؔ کیا سمجھے
جورِ برملا ان کا التفاتِ پنہاں ہے

مجید امجد

○

کیا روپ دوستی کا کیا رنگ دشمنی کا
کوئی نہیں جہاں میں کوئی نہیں کسی کا

اک تنکا آشیانہ، اک راگنی اثاثہ
اک موسمِ بہاراں مہمان دو گھڑی کا

آخر کوئی کنارا اس سیلِ بے کراں کا
آخر کوئی مداوا اس دردِ زندگی کا

میری سیہ شبی نے اک عمر آرزو کی
لرزے کبھی اُفق پر تاگا سا روشنی کا

اب میری زندگی میں آنسو ہیں اور نہ آہیں
لیکن۔ یہ ایک میٹھا میٹھا سا روگ جی کا

او مسکراتے تارو! او کھلکھلاتے پھولو!
کوئی علاج میری افسردہ خاطری کا!

○

جنونِ عشق کی رسمِ عجیب کیا کہنا
میں اُن سے دُور وہ میرے قریب کیا کہنا

یہ تیرگیِ مسلسل میں ایک وقفۂ نور
یہ زندگی کا طلسمِ عجیب کیا کہنا

جو تم ہو برقِ نشیمن، تو میں نشیمنِ برق
اُلجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب کیا کہنا

ہجومِ رنگ فراواں سہی۔ مگر، پھر بھی
بہار۔ نوحۂ صد عندلیب، کیا کہنا

ہزار قافلۂ زندگی کی تیرہ شبی
یہ روشنی سی اُفق کے قریب کیا کہنا

لرز گئی تری لَو میرے ڈگمگانے سے
چراغِ گوشۂ کوئے حبیب کیا کہنا

شان الحق حقّی

○

اثر نہ ہو تو اسی نطق بے اثر سے کہہ
چھپا نہ دردِ محبت جہان بھر سے کہہ

جو کہہ چکا ہے تو اندازِ تازہ تر سے کہہ
خبر کی بات ہے اک گوشِ بے خبر سے کہہ

چمن چمن سے اکھڑ کر رہے گا پائے خزاں
روش روش کو جتا دے شجر شجر سے کہہ

بیانِ شوق نہیں قیل و قال کا محتاج
کبھی فغاں میں ادا کر کبھی نظر سے کہہ

وزیر و میر کے کیا گوشِ بے اثر سے خطاب
مرادِ دل کی گدایانِ رہ گزر سے کہہ

شبابِ تشنہ کی خوں بار نوشیوں کو نہ بھول
مرے فسانۂ رنگیں کو پیشتر سے کہہ

سفر ہے شرطِ حیات اور حیات ہے شرطِ سفر
پکار کر یہ رفیقانِ ہمسفر سے کہہ

○

اے دل ترے خیال کی دنیا کہاں سے لائیں
ان وحشتوں کے واسطے صحرا کہاں سے لائیں

حیرت تو ہے یہی کہ ہو دنیا سے دل کو میل
ہو جس سے دل کو میل وہ دنیا کہاں سے لائیں

دیکھا تھا جو نہالِ تمنّا کے سائے میں
اے بے دلی وہ خوابِ دل افزا کہاں سے لائیں

روشن تھے جو کبھی وہ نظارے کدھر گئے
برپا تھا جو کبھی وہ تماشا کہاں سے لائیں

کیا اس نگاہِ حوصلہ افزا کو دیں جواب!
گم کر دیا ہے وہ تمنّا کہاں سے لائیں

ہے لطفِ دوست حرفِ تقاضا کا منتظر
اے بے بسی مجالِ تقاضا کہاں سے لائیں

حقّی بہت ہے کارِ جنوں دشت نیستی میں
آسودگانِ راہ وہ سودا کہاں سے لائیں

باقیؔ صدیقی

○

ہم ذرّے ہیں خاکِ رہگذر کے
دیکھو ہمیں بام سے اُتر کے

چُپ ہو گئے یوں اسیر جیسے
جھگڑے تھے تمام بال و پر کے

وعدہ نہ دِلاؤ یاد اُن کا
نادم ہوں خود اعتبار کر کے

اے بادِ سحر نہ چھیڑ ہم کو
ہم جاگے ہوئے ہیں رات بھر کے

شبنم کی طرح حیات کے خواب
کچھ اَور بکھر گئے بکھر کے

جب اُن کو خیالِ وضع آیا
انداز بدل گئے نظر کے

یوں موت کے منتظر ہیں باقیؔ
مل جائے گا چین جیسے مر کے

○

رسم سجدہ بھی اُٹھا دی ہم نے
عظمتِ عشق بڑھا دی ہم نے

جب کوئی تازہ شگوفہ پھوٹا
کی گلستاں میں منادی ہم نے

جب چمن میں نہ کہیں چین ملا
بابِ زنداں پہ صدا دی ہم نے

آنچ صیّاد کے گھر تک پہنچی
اتنی شعلوں کو ہوا دی ہم نے

خونِ دل سے درِ مے خانہ پر
تیری تصویر بنا دی ہم نے

دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

جگن ناتھ آزاد

○

جو دل کا راز بے آہ و فغاں کہنا ہی پڑتا ہے
تو پھر اپنے قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

تجھے اے طائرِ شاخِ نشیمن کیا خبر اس کی
کبھی صیاد کو بھی باغباں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ دنیا ہے یہاں ہر کام چلتا ہے سلیقے سے
یہاں پتھر کو بھی لعلِ گراں کہنا ہی پڑتا ہے

بہ فیضِ مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں
کہ رہزن کو امیرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے

زبانوں پہ دلوں کی بات جب ہم لا نہیں سکتے
جفا کو پھر وفا کی داستاں کہنا ہی پڑتا ہے

نہ پوچھو کیا گزرتی ہے دلِ خود دار پر اکثر
کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

○

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں
اب یہ بھی ہے بہت کہ تمہیں یاد آ سکوں

یہ کیا طلسم ہے کہ تری جلوہ گاہ سے
نزدیک آ سکوں نہ کہیں دور جا سکوں

ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں
پردے گرے ہیں وہ کہ نہ جن کو اٹھا سکوں

کس طرح کر سکو گے بہاروں کو مطمئن
اہلِ چمن جو میں بھی چمن میں نہ آ سکوں

تیری حسیں فضا میں مرے اے نئے وطن
ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں؟

آزادؔ سازِ دل پہ ہیں رقصاں وہ زمزمے
خود سن سکوں مگر نہ کسی کو سنا سکوں

عرش ملسیانی

یہ دورِ خرد ہے دورِ جنوں اس دور میں جینا مشکل ہے
انگور کی مے کے دھوکے میں زہراب کا پینا مشکل ہے

جب ناخنِ وحشت چلتے تھے روکے سے کسی کے رک نہ سکے
اک چاکِ دلِ انسانیت سیتے ہیں تو سینا مشکل ہے

اک صبر کے گھونٹ سے مٹ جاتی سب تشنہ لبوں کی تشنہ لبی
کم ظرفیٔ دنیا کے صدقے یہ گھونٹ بھی پینا مشکل ہے

وہ شعلہ نہیں جو بجھ جائے آندھی کے ایک ہی جھونکے سے
بجھنے کا سلیقہ آساں ہے، جلنے کا قرینا مشکل ہے

کہنے کو رفو کر ہی لیں گے دنیا والے سب زخم اپنے
جو زخمِ دلِ انساں پہ لگا، اس زخم کا سینا مشکل ہے

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

مل کر رہے گا بالآخر اے عرش سکونِ ساحل بھی
طوفانِ حوادث سے لیکن بچ جائے سفینا، مشکل ہے

دلِ فسردہ پہ سو بار تازگی آئی
مگر وہ یاد کہ جا کر نہ پھر کبھی آئی

چمن میں کون ہے پرسانِ حالِ شبنم کا
غریب روئی تو غنچوں کو بھی ہنسی آئی

نویدِ عیش سے بھی لطفِ عیش مل نہ سکا
لباسِ غم ہی میں آئی اگر خوشی آئی

کسی طرح بھی زمانے کو بس میں کر نہ سکے
نہ دوستی نہ ہمیں راس دشمنی آئی!

عجب نہ تھا کہ غمِ دل شکست کھا جاتا
ہزار شکر ترے لطف میں کمی آئی!

زمانہ ہنستا ہے مجھ پہ ہزار بار ہنسے
تمہاری آنکھ میں لیکن یہ کیوں نمی آئی

دیے جلائے امیدوں نے دل کے گرد بہت
کسی طرف سے نہ اس گھر میں روشنی آئی

ہزار دید پہ پابندیاں تھیں پردے تھے
نگاہِ شوق مگر ان کو دیکھ ہی آئی

ظہور نظر

○

حیات وقفِ غمِ روزگار کیوں کرتے
مَیں سوچتا ہُوں کہ وُہ مجھ سے پیار کیوں کرتے

نہ میری راہ میں تارے نہ میرے پاس چراغ
وہ میرے ساتھ سفر اختیار کیوں کرتے

نگاہ صرف بُلاوا نہیں کچھ اَور بھی ہے
یہ جانتے تو تِرا اعتبار کیوں کرتے؟

غمِ حیات میں ہوتا اگر نہ ہاتھ تِرا!
تو ہم خرد میں جنوں کو شمار کیوں کرتے

کوئی تو بات ہے ورنہ جفاؤں کے مارے
تجھے بُھلا کے ترا انتظار کیوں کرتے!

نظرؔ چمن میں اگر واقعی بہار آتی!
تو پھول خواہشِ ابرِ بہار کیوں کرتے

○

رو لیتے تھے ہنس لیتے تھے بس میں تھا جب اپنا جی
تم نے ہمیں دیوانہ کہا ہے ایسی تو کوئی بات نہ تھی

اب یہ تمہارا کام گر جا تو ہم پروانے تھے یا دیپ
دن بیتا تو جلتے جلتے، جلتے جلتے رات گئی

گُلشن گُلشن محفل محفل ایک ہی قصّہ ایک ہی بات
ظالم دُنیا، جابر دُنیا، جانے یہ کب بدلے گی

لپکے کتنے ہاتھ نہ جانے اُن کے بھیگے دامن پر
کل تک تھے ہم چاک گریباں اُن سے پُوچھے آج کوئی

ہم ہیں مشعل والے پہلے ہم سے دو دو ہاتھ کرو
پھر بکھرا لینا اندھیارا نگر نگر بستی بستی!

تم ہو آگ تو ہم پانی ہیں تم ہو دُھوپ تو ہم چھاؤں
اپنا تمہارا ساتھ ہی کیا ہے ہم پر جا تم راجہ جی

گلی گلی میں خون کے دھبّے ڈگر ڈگر پہ راکھ کے ڈھیر
جشن منانے والے یارو ایک نظر اس جانب بھی

ضیاؔ جالندھری

○

چھیڑی بھی جو رسم و راہ کی بات
وہ سُن نہ سکے نگاہ کی بات

ہر لحظہ بدل رہے ہیں حالات
مجھ سے نہ کرو نباہ کی بات

کہتے ہیں تری مژہ کے تارے
خود میری شبِ سیاہ کی بات

اب ہے وُہ نگہ نہ وُہ تبسم
کچھ اور تھی گاہ گاہ کی بات

کیا یاد نہ آئے گا یہ انجام!
کس دل سے کرینگے چاہ کی بات

○

کیا سروکار اب کسی سے مجھے
واسطہ تھا تو تھا تجھی سے مجھے

بے حسی کا بھی اب نہیں احساس
کیا ہُوا تیری بے رُخی سے مجھے

موت کی آرزو بھی کر دیکھوں
کیا امیدیں تھیں زندگی سے مجھے

پھر کسی پہ نہ اعتبار آئے
یوں اُتارو نہ اپنے جی سے مجھے

تیرا غم بھی نہ ہو تو کیا جینا
کچھ تسلی ہے درد ہی سے مجھے

کتنا پُرکار ہو گیا ہُوں کہ تھا
واسطہ تیری سادگی سے مجھے

کر گئے وُہ کس قدر تباہ ضیاؔ
دشمنی، اندازِ دوستی سے مجھے

احمد ریاض

○

بہ وصفِ شوق بھی دل کا کہا نہیں کرتے
فروغِ قامت و رُخ کی ثنا نہیں کرتے

شکستِ عہدِ ستم پر یقین رکھتے ہیں
ہم انتہائے ستم کا گلا نہیں کرتے

کچھ اس طرح سے لُٹی ہے متاعِ دیدہ و دل
کہ اب کسی سے بھی ذکرِ وفا نہیں کرتے

اسی لئے ہیں سزاوار جور و برقِ ستم
کہ حقِ خدمتِ گلچیں ادا نہیں کرتے

مذاقِ کوہ کنی ہو کہ دشت پیمائی
جنہیں تمہاری طلب ہو وہ کیا نہیں کرتے

وُہ آشنائے غمِ کائنات کیا ہوں گے
جو خود کو آپ کا درد آشنا نہیں کرتے

غمِ حبیب، غمِ زندگی، غمِ دوراں
کسی مقام پہ ہم جی بُرا نہیں کرتے

○

کیا کیا محبتوں کے زمانے بدل گئے
اب تم کبھی ملے ہو تو آنسو نکل گئے

فرطِ غمِ حوادثِ دوراں کے باوجود
جب بھی ترے دیار سے گذرے مچل گئے

مَیں نکتہ چیں نہیں ہوں مگر یہ بتلایئے
وہ کون تھے جو ہنس کے گلوں کو مسل گئے

کچھ دستِ گلفروش میں سنولا کے رہ گئے
کچھ باغباں کی برق نوازی سے جل گئے

تم نے ہمیں فریبِ قیادت دیا تو ہے!
لیکن کبھی ہُوا ہے کہ طوفان ٹل گئے

اک وُہ بھی تھے جو بہ گئے موجوں کے ساتھ ساتھ
اک ہم بھی ہیں جو کھا کے تھپیڑے سنبھل گئے

احمد راہی

○

غمِ حیات میں کوئی کمی نہیں آئی
نظر فریب تھی تیری جمال آرائی

وہ داستاں جو تری دلکشی نے چھیڑی تھی
ہزار بار مری سادگی نے دہرائی

فسانے عام سہی میری چشمِ حیراں کے
تماشا بنتے رہے ہیں یہاں تماشائی

تری وفا، تری مجبوریاں بجا، لیکن
یہ سوزشِ غمِ ہجراں، یہ سرد تنہائی

کسی کے عہدِ تمنا کا پاس ہے ورنہ
مجھے خیالِ جہاں ہے نہ خوفِ رسوائی

میں سوچتا ہوں زمانے کا حال کیا ہوگا
اگر یہ اُلجھی ہوئی زلف تُو نے سلجھائی

کہیں یہ اپنی محبت کی انتہا تو نہیں
بہت دنوں سے تری یاد بھی نہیں آئی

○

کبھی تری کبھی اپنی حیات کا غم ہے
ہر ایک رنگ میں ناکامیوں کا ماتم ہے

خیال تھا ترے پہلو میں کچھ سکوں ہوگا
مگر یہاں بھی وہی اضطرابِ پیہم ہے

مرے مذاقِ الم آشنا کا کیا ہوگا؟
تری نگاہ میں شعلے ہیں اب نہ شبنم ہے

سحر سے رشتۂ امید باندھنے والے
چراغِ زیست کی لو شام ہی سے مدھم ہے

یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی راہی
کہ ہر قدم پہ عجب بے بسی کا عالم ہے

عارف عبدالمتین

○

میری سوچ لرز اٹھی ہے دیکھ کے پیار کا یہ عالم
تیری آنکھوں سے ٹپکا ہے آنسو بن کر میرا غم

دل کو ناز ہے سلجھاؤ پر لیکن میں نے یہ دیکھا ہے
سُلجھانے سے اور اُلجھا ہے تیری زلف کا ایک اک خم

دن کے بولتے ہنگامے میں اکثر سویا رہتا ہے
کروٹ لیکر جاگ اُٹھتا ہے رات کی چُپ میں تیرا غم

ہجر کے سنولائے لمحوں میں آس بھی تنہا چھوڑ گئی
کس سے پُوچھوں کون بتائے رات ہوئی ہے کتنی کم

تیری دُھن میں تجھ سے بھی شاید آگے جا نکلا ہُوں
تیرے پہلو میں بیٹھا ہوں پھر بھی آنکھیں ہیں پُرنم

تیرا غم ہم دیوانوں کو کس عالم میں چھوڑ گیا
ایک زمانہ ہم سے خفا ہے ایک جہاں سے ہم برہم

○

ترے بازوؤں کا سہارا تو لے لوُں مگر ان میں بھی بچ گئی ہے تھکن
میں صحرا سے بچ کر چمن میں تو آؤں پہ صحرا سے کچھ کم نہیں یہ چمن

میری زیست کی راہ تاریک تھی، چاند بن کر تم آئے تو روشن ہوئی
یہ راہ آج پھر تیرہ و تار ہے، غالباً چاند کو لگ گیا ہے گہن

ہر اک سمت ناگن کی صورت لپکتی ہوئی تیرگی سے ہراساں نہ ہو
عجب کیا کہ لَو دے اُٹھے میرے لمس فروزاں سے تیرا سُلگتا بدن

ہے اشکوں سے بھیگی ہوئی مُسکراہٹ مروّت کا اعجاز ورنہ
غموں کی ہواؤں میں اُڑتا ہُوا دیکھ کر آ رہے ہیں کوئی پیرہن

فراقِ لب و زُلف پر منحصر کم ہی پائی ہے اہلِ وفا کی تڑپ
تم آغوش کے تنگ حلقے میں ہو، پھر بھی ہر لحظہ افزوں ہے دل کی جلن

شہرت بخاری

○

وہ پاس آئے، ہنس بنے اور پلٹ گئے
کتنے ہی پردے آنکھوں کے آگے سے ہٹ گئے

ہر باغ میں بہار ہوئی خیمہ زن، مگر
دامن کے ساتھ ساتھ یہاں دل بھی پھٹ گئے

گمراہیوں کا لپکا کچھ ایسا پڑا کہ ہم
منزل قریب آئی تو رہبر سے کٹ گئے

دل دے کے اس طرح سے طبیعت سنبھل گئی
گویا تمام عمر کے جھگڑے نپٹ گئے

برسوں کے پیاسے دشت نوردوں سے پوچھیے
ان بادلوں کا پیار جو گھرتے ہی چھٹ گئے

بس میں رہیں نہ جب غمِ دوراں کی وسعتیں
ہم لوگ اپنے گوشۂ دل میں سمٹ گئے

شہرتؔ انہیں بھلانے کی کوشش جو کی کبھی
دامانِ دل سے سینکڑوں فتنے لپٹ گئے

○

ہم پی گئے سب، ہلے نہ لب تک
جی ہار گئے، نجوم شب تک

ہر چند گھٹائیں چھٹ گئی ہیں
پر دل پہ غبار سا ہے اب تک

خوش ہو نہ زمانہ میرے غم پر
آئے گا یہ دورِ جام سب تک

اشکوں نے فسانہ کر دیا ہے
وہ لفظ کہ آ سکا نہ لب تک

ہر غم کو اُڑا دیا ہنسی میں
تم پیشِ نظر رہے ہو جب تک

مے خانے میں سر چھپائیں آؤ
وا ہو درِ کعبہ جانے کب تک

شہرتؔ کوئی اور بات چھیڑو
اُٹھیں وہ نقابِ لطف جب تک

شہزاد احمد شہزاد

○

میری خاطر دیر نہ کرنا اور سفر کرتے جانا
لیکن چھوڑ کے جانے والو ایک نظر کرتے جانا

اتنا سکوں اتنی خاموشی کیسے رات گزر سکتی ہے
جاتے جاتے محفلِ دل کو زیر و زبر کرتے جانا

ہجر کی شب کے تارو! تم کو ڈوب تو جانا ہے لیکن
میرے دل پر کیا گزری ان کو تو خبر کرتے جانا

روتی آنکھیں یا ہنستے لب آپ ہی اک رسوائی ہیں
چپ چپ رہنا اور طوافِ راہگذر کرتے جانا

اور ذرا چمکا دینا یادوں کے بھڑکتے شعلوں کو
اے غمِ جاناں! اے غمِ دوراں دل پہ اثر کرتے جانا

ہم سے درد کے ماروں کی مجبوری کیا کہتا ہے کیا
جینا اور نہ مرنا لیکن عمر بسر کرتے جانا

کس کو خبر شہزاد کہ ان آنکھوں میں کیسا جادو ہے
کہنا اور نہ سننا لیکن دل میں گھر کرتے جانا

○

کھلے جو پھول تو منہ چھپ گیا ستاروں کا
مثالِ ابر چلا کارواں بہاروں کا

نہ مجھ سے پوچھ شبِ ہجر دل پہ کیا گزری
یہ دیکھ حال ہے کیا میرے غمگساروں کا

نئی بہار ہنسے اک نیا چمن کھل جائے
سمجھ سکے کوئی مطلب اگر اشاروں کا

شبِ سیاہ کے لمحے گزار لینے دو
گھڑی گھڑی نہ کرو ذکر ماہ پاروں کا

دکھائی دیتی ہے اس طرح روپ رنگ کی بات
فضا میں رقص ہو جس طرح ابر پاروں کا

ہوا نہ راہ میں حائل کوئی شگوفہ بھی
رواں دواں ہی رہا قافلہ بہاروں کا

مجھے بھی اہلِ جہاں بھول جائیں گے شہزاد
کسے خیال ہے ڈوبے ہوئے ستاروں کا

سلام مچھلی شہری

○

یہ ابر و باد یہ طوفاں، یہ اندھیری رات
اب ایک موڑ پہ آ جا رفیقِ راہِ حیات

ہوا کے دوش پہ موجِ اجل خراماں ہے
مریضِ دہر پہ طاری ہیں نزع کے لمحات

حیات ایک تخیل نہیں حقیقت ہے
مجھے بتائی ہے آدم کے عزم نے یہ بات

مرے رفیق، محبت کے دن بھی آئیں گے
وہی حسین سویرا وہی کنواری رات

وہی گلاب کے موسم وہی شراب کے دور
وہی سنہری گھٹائیں، وہی بھری برسات

سنائی جائے گی کوئل کو ہم نوا کر کے
حسین پھولوں کو بھونروں کی ایک راز کی بات

غزل کی ڈال سجا کر چمن کی دلہن کو —
سلام نذر کرے گا سہاگ کی سوغات

○

ہوا زمانے کی ساقی بدل تو سکتی ہے
حیات ساغرِ رنگیں میں ڈھل تو سکتی ہے

بس اک لطیف تبسم بس اک حسین نظر
مریضِ دل کی یہ حالت سنبھل تو سکتی ہے

جہاں پہ چھوڑ رہے ہو مجھے اندھیرے میں
وہیں سے راہِ محبت نکل تو سکتی ہے

بھرا ہے غنچۂ زخمِ جگر کا کیا ہوگا
نسیمِ صبح مری سمت چل تو سکتی ہے

تری نگاہِ کرم کی قسم ہے اب بھی مجھے
یہی یقین کہ دنیا بدل تو سکتی ہے

سلام! جام و سبو کی یہ شاعری معلوم
وگرنہ اپنی طبیعت بہل تو سکتی ہے!

شاعر لکھنوی

○

آنسو شعلوں میں ڈھل رہے ہیں — غم دل کی فضا بدل رہے ہیں

گلشن ہے انہیں کا گل انہیں کے — کانٹوں پہ جو ہنس کے چل رہے ہیں

ایک ایک نفس میں روشنی ہے — یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

چپ چپ سی ہے تلخیٔ زمانہ — غم جام و سبو میں ڈھل رہے ہیں

مٹ مٹ کے ابھر رہی ہے دنیا — بجھ بجھ کے چراغ جل رہے ہیں

اللہ رے اعتبارِ ہستی — ہم خواب میں جیسے چل رہے ہیں

اس سمت بھی گردشِ زمانہ! — کچھ لوگ ابھی سنبھل رہے ہیں

ساحل پہ انہیں کا حق ہے شاعر
طوفاں کا جو رخ بدل رہے ہیں

○

جو غمِ حبیب سے دور تھے وہ خود اپنی آگ میں جل گئے
جو غمِ حبیب کو پا گئے وہ غموں سے ہنس کے نکل گئے

جو تھکے تھکے سے تھے حوصلے وہ شباب بن کے مچل گئے
جو نظر نظر سے گلے ملی تو بجھے چراغ بھی جل گئے

نہ خزاں میں ہے کوئی تیرگی نہ بہار میں کوئی روشنی
یہ نظر نظر کے چراغ ہیں کہیں بجھ گئے کہیں جل گئے

غمِ عیش یاس و امید کا نہ اثر حیات پہ ہو سکا
مری روحِ عشق وہی رہی یہ لباس تھے جو بدل گئے

نہ ہے شاعر اب غمِ نو بہ نو نہ وہ داغِ دل نہ وہ تازگی
جنہیں اعتمادِ بہار تھا وہی پھول رنگ بدل گئے

جعفر طاہر

○

کوئے حرم سے نکلی ہے کوئے بتاں کی راہ
ہائے کہاں پہ آ کے ملی ہے کہاں کی راہ

صد آسماں بضمن و صد کہکشاں بدوش
بامِ بلندِ یار ترے آستاں کی راہ

ملکِ عدم میں قافلۂ عمر جا بسا
ہم دیکھتے ہی رہ گئے اُس بے گماں کی راہ

لُٹتا رہا ہے ذوقِ نظر گام گام پر
اب کیا رہا ہے پاس جو ہم لیں وہاں کی راہ

اے زلفِ خم بخم تجھے اپنا ہی واسطہ
ہموار ہونے پائے نہ عمرِ رواں کی راہ

گلہائے رنگ رنگ میں افکارِ نَو بہ نَو
یہ رہگزارِ شعر ہے کس گلستاں کی راہ

طاہرؔ یہ منزلیں، یہ مقامات، یہ حرم
اللہ رے یہ راہ، یہ کوئے بتاں کی راہ

○

عرصۂ ظلمتِ حیات کٹے
ہم نفس مسکرا کہ رات کٹے

ثمرِ آرزو کا ذکر نہ چھیڑ
چھونے پائے نہ تھے کہ ہات کٹے

کاش ہر زلف تیغ بن جائے
کاش زنجیرِ حادثات کٹے

اے بقائے دوام کے مالک
کس طرح عمرِ بے ثبات کٹے

آدمی جستجوئے راہ میں ہے
تجھ کو ضد ہے رہِ نجات کٹے

شبِ خلوت سخن سخن کی داد
اور سرِ بزم بات بات کٹے

حبیب اشعر

○

دل کے ہاتھوں کہیں دُنیا میں گذارا نہ رہا
ہم کسی کے نہ رہے، کوئی ہمارا نہ رہا

صبر اے دل! کہ یہ حالت نہیں دیکھی جاتی
ٹھہر اے درد! کہ اب ضبط کا یارا نہ رہا

یوں تو اب بھی ہے وہی رنج وہی محرومی
وہ جو اک تیری طرف سے تھا اشارا نہ رہا

اور تو کیا تھا انہیں اپنا سمجھنے کے سوا
وہ بھی اب عشق کی غیرت کو گوارا نہ رہا

چھن گئی آخری امید بھی دل سے اشعر
یہ سہارا ہے کہ اب کوئی سہارا نہ رہا

○

بے نیازی سے، مدارات سے ڈر لگتا ہے
جانے کیا بات ہے، ہر بات سے ڈر لگتا ہے

ساغرِ بادۂ گل رنگ تو کچھ دُور نہیں
نگہِ پیرِ خرابات سے ڈر لگتا ہے

دل پہ کھائی ہوئی اک چوٹ اُبھر آتی ہے
تیرے دیوانے کو برسات سے ڈر لگتا ہے

اے دل! افسانۂ آغازِ وفا رہنے دے
مجھ کو بیتے ہوئے لمحات سے ڈر لگتا ہے

ہاتھ سے ضبط کا دامن نہ کہیں چھوٹ جائے
آپ کی پرسشِ حالات سے ڈر لگتا ہے

میں جو اُس بزم میں جاتا نہیں اشعر مجھ کو
اپنے سہمے ہوئے جذبات سے ڈر لگتا ہے

مکین احسن کلیم

○

حیات مجھ پہ اک الزام ہی سہی پھر بھی
بہت عزیز ہے مجھ کو یہ زندگی پھر بھی

نہیں کچھ اور تو ممکن تھی خودکشی پھر بھی
ہے کوئی بات کہ جیتا ہے آدمی پھر بھی

یہ تیرگی تو بس اک گردشِ زمیں تک ہے
مگر یہ رات جو ہم سے نہ کٹ سکی پھر بھی

چمن لٹا ہے خود اہلِ چمن کی سازش سے
کلی کلی ہے مگر محوِ خواب سی پھر بھی

کسی کو پا کے بھی اکثر گماں یہ ہوتا ہے
کہ جیسے رہ گئی باقی کوئی کمی پھر بھی

ہمیں پہ یورشِ ظلمت ہمیں ہیں کشتۂ شب
ہمیں ہیں پیشروِ صبحِ روشنی پھر بھی

لبِ کلیم پہ اب نغمۂ بہار تو ہے
یہ اور بات کہ آنکھیں ہیں شبنمی پھر بھی

○

بہت تلخ ہیں زندگی کے فسانے
مرے خواب ہیں پھر بھی کتنے سہانے

سہارا نہ دیتی اگر موجِ طوفاں
ڈبو ہی دیا تھا ہمیں ناخدا نے

سحر کو تو آنا ہے آ کر رہے گی
کٹے کیسے لیکن یہ شب کون جانے

گری اور گرتی رہی برقِ سوزاں
بنے اور بنتے رہے آشیانے

ستاروں سے آگے بہت کچھ ہے مانا
زمیں پہ بھی جینے کے ہوں کچھ بہانے

کلیم آج کیا سوچ کر ہو گئے چپ
ارے آ گئے یاد کب کے زمانے

سلیم احمد

○

ترک ان سے رسم و راہِ ملاقات ہو گئی
یوں مل گئے کہیں تو کوئی بات ہو گئی

دل تھا اُداس عالمِ غربت کی شام تھی
کیا وقت تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی

یہ دشت ہول خیز یہ منزل کی دھن یہ شوق
یہ بھی خبر نہیں کہ کہاں رات ہو گئی

رسمِ جہاں نہ چھوٹ سکی ترکِ عشق سے
جب مل گئے تو پرسشِ حالات ہو گئی

خوشبو رہی سہی تھی، جو مجھ میں خلوص کی
اب وہ بھی نذرِ رسمِ عنایات ہو گئی

دلچسپ ہے سلیم، حکایت تری مگر —
اب سو بھی جا کہ یار، بہت رات ہو گئی

○

مانے تو کس کی دیوانہ مانے
جتنی زبانیں اُتنے فسانے

انداز اس کا، احوال میرا
کچھ میں نہ سمجھوں کچھ وہ نہ جانے

اللہ رے یہ خود اعتمادی
میں اب چلا ہوں اُن کو منانے

گم کردہ رہ کیا سوچتا ہے
چھوڑ آیا پیچھے کتنے ٹھکانے

میری وفا کا وہ معترف ہے
اپنی خطا کو مانے نہ مانے

چاہو تو آؤ چاہو نہ آؤ
دونوں کے یکساں حیلے بہانے

کچھ میرے غم سے نسبت ہے اُن کو
یاد آ رہے ہیں کتنے فسانے

کیا ہے سلیم ان باتوں کا حاصل
کس کو چلا ہے تو آزمانے

نور بجنوری

○

ان گھٹاؤں میں اُجالے کا بسیرا ہی سہی
خیر اگر آپ بضد ہیں تو سویرا ہی سہی

اے غمِ زیست بلاتی ہیں مہکتی زلفیں
آج کی رات یہ پُر نور اندھیرا ہی سہی

دل میں جو آگ لگی ہے وُہ کہاں بجھتی ہے
راہ شاداب سہی ابر گھنیرا ہی سہی

ہوشیار اہلِ خرد خاک نشیں آ پہنچے
آپ کے زعم کا افلاک پہ ڈیرا ہی سہی

تو پریشان نہ ہو خالقِ فردوس بریں
یہ جہنم یہ جہاں آج سے میرا ہی سہی

کتنی یادیں ہیں کہ ناگن کی طرح ڈستی ہیں
نور ان گلیوں کا اک آخری پھیرا ہی سہی

○

میری دُنیا سنگ و آہن ان کی دُنیا چاند ستارے
عقل کہاں تک دامن کھینچے عشق کہاں تک ہاتھ پسارے

اپنی اپنی دھن میں مگن ہیں شاموں صبحوں کے متوالے
صبح کے آنسو کون سکھائے رات کے گیسو کون سنوارے

آبلہ پا رہگیروں کو جھرنوں سے دل بہلانے بھی دے
عزمِ جواں کو اور جواں کر اپنی منزل دُور ہے پیارے

چھم چھم چھم چھم ناچتی موجیں یہ سرگوشی کرتی جائیں
طوفانوں کی راہ تکیں گے کب تک یہ مجبور کنارے

نور عقیدوں کے شعلوں میں رُوحیں جلتی دیکھ چکی ہیں
تم ہی بتاؤ ان آنکھوں سے آنسو ٹپکیں یا انگارے

اصغر سلیم

○

غبار سا ہے سرِ شاخسار کہتے ہیں
چلا ہے قافلۂ نوبہار کہتے ہیں

بدل گئی ہیں جہانِ وفا کی سب رسمیں
اُجڑ گئے ہیں دلوں کے دیار کہتے ہیں

اس ایک بات سے گلچیں کا دل دھڑکتا ہے
کہ ہم صبا سے حدیثِ بہار کہتے ہیں

یہ ہجو ہے تو کسی مصلحت سے ہے ورنہ
فقیہہِ شہر بھی ہے بادہ خوار، کہتے ہیں

جسے کبھی سرِ منبر نہ کہہ سکا واعظ
وہ بات اہلِ جنوں زیرِ دار کہتے ہیں

سلیم سایۂ گُل ہو کہ سختیِ زنداں
جنوں ہے شیوۂ مردانِ کار، کہتے ہیں

○

گُلشن گُلشن شعلۂ گُل کی، زلفِ صبا کی بات چلی
حرفِ جنوں کی، بندِ گراں کی، جُرم و سزا کی بات چلی

زنداں زنداں شورِ جنوں ہے موسمِ گُل کے آنے سے
محفل محفل اب کے برس، اربابِ وفا کی بات چلی

عہدِ ستم ہے دیکھیں ہم آشفتہ سروں پر کیا گُزرے
شہر میں اس کے بندِ قبا کی رنگِ حنا کی بات چلی

ایک ہُوا دیوانہ اِک نے سر تیشے سے پھوڑ لیا
کیسے کیسے لوگ تھے جن سے رسمِ وفا کی بات چلی

”ٹوٹ گئیں نغموں کی طنابیں شعر کے خیمے راکھ ہوئے“
بزمِ سخن میں جب بھی سلیم اس شعلہ نوا کی بات چلی

ساغرؔ صدیقی

○

جھوم کر گاؤ! میں شرابی ہوں
رقص فرماؤ! میں شرابی ہوں

ایک سجدہ بنامِ مے خانہ
دوستو آؤ! میں شرابی ہوں

لوگ کہتے ہیں رات بیت چکی
مجھ کو سمجھاؤ! میں شرابی ہوں

آج ان ریشمی گھٹاؤں کو
یوں نہ بکھراؤ! میں شرابی ہوں

حادثے روز ہوتے رہتے ہیں
بھول بھی جاؤ! میں شرابی ہوں

مجھ پہ ظاہر ہے آپ کا باطن
منہ نہ کھلواؤ! میں شرابی ہوں

○

چراغِ طور جلاؤ! بڑا اندھیرا ہے
ذرا نقاب اُٹھاؤ! بڑا اندھیرا ہے

وہ جن کے ہوتے ہیں خورشید آستینوں میں
اُنھیں کہیں سے بلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

مجھے خود اپنی نگاہوں پہ اعتماد نہیں
مرے قریب نہ آؤ! بڑا اندھیرا ہے

فرازِ عرش سے ٹوٹا ہوا کوئی تارا
کہیں سے ڈھونڈ کے لاؤ! بڑا اندھیرا ہے

ابھی تو صبح کے ماتھے کا رنگ کالا ہے
ابھی فریب نہ کھاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بصیرتوں پہ اُجالوں کا خوف طاری ہے
مجھے یقین دلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

جسے زبانِ خرد میں شراب کہتے ہیں
وہ روشنی سی پلاؤ! بڑا اندھیرا ہے

بنامِ زہرہ جبینانِ خطۂ فردوس
کسی کرن کو جگاؤ! بڑا اندھیرا ہے

عظیم مرتضیٰ

○

کچھ بھی ہو مرا حال نمایاں تو نہیں ہے
دل چاک سہی خیر، گریباں تو نہیں ہے

حسن طلب برق ہے تعمیرِ نشیمن
ورنہ ہوسِ سیرِ گلستاں تو نہیں ہے

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویراں تو نہیں ہے

ہم درد کے مارے ہی گراں جاں ہیں وگرنہ
جینا تری فرقت میں کچھ آساں تو نہیں ہے

ٹوٹا تو عزیز اور ہوا اہلِ وفا کو
دل بھی کہیں اُس شوخ کا پیماں تو نہیں ہے

○

ترا خیال بھی ہے وضعِ غم کا پاس بھی ہے
مگر یہ بات کہ دنیا نظر شناس بھی ہے

بہارِ صبحِ ازل پھر گئی نگاہوں میں
وہی فضا ترے کوچے کے آس پاس بھی ہے

جو ہو سکے تو چلے آؤ آج میری طرف
ملے بھی دیر ہوئی اور جی اداس بھی ہے

خلوصِ نیتِ رہرو پہ منحصر ہے عظیم
مقامِ عشق بہت دور بھی ہے پاس بھی ہے

جمیلؔ ملک

○

کون ہمارا درد بٹائے، کون ہمارا تھامے ہات
ان کے نگر میں جگمگ جگمگ، اپنے دیس میں رات ہی رات

نیلے نیلے امبر پر وہ چاند ـــــ وہ کرنوں کی برسات
ہم دونوں کھوئے کھوئے سے ہائے وہ مست منوہر گھات

تو گلشن گلشن اٹھلائے میں صحرا صحرا بھٹکوں!
دل کا یہ سودا ہے ورنہ تیرا اور میرا کیا ساتھ

سب دنیاداری کی باتیں، دل میں اور زباں پر اور
تجھ سے پیار بڑھا کر آخر جان گئے تیری اوقات

چاہے اب اس کو اپناؤ چاہے ناز سے ٹھکراؤ!
آج سے اپنا دخل نہیں ہے دل کی ڈور تمہارے ہات

دنیا کا منشا ہے پیارے ہم گھٹ گھٹ کر مر جائیں!
دل کی دھڑکن یہ کہتی ہے اک دن بدلیں گے حالات

ایک انوکھی لے سے میں نے سب کے دل پگھلائے ہیں
دنیا کو یہ وہم کہ میرے ہونٹوں پر ہے اپنی بات

○

یہ منظر یہ روپ انوکھے سب شہکار ہمارے ہیں
ہم نے اپنے خونِ جگر سے کیا کیا نقش ابھارے ہیں

صدیوں کے دل کی دھڑکن ہے اُن کی جاگتی آنکھوں میں
یہ جو فلک پر ہنس مکھ چنچل جگمگ جگمگ تارے ہیں!

ایک ذرا سی بھول پہ ہم کو اتنا تو بدنام نہ کر
ہم نے اپنے گھاؤ چھپا کر تیرے کاج سنوارے ہیں

کچھ باتیں، کچھ راتیں، کچھ برساتیں اپنا سرمایہ
ماضی کے اندھیارے میں یہ جلتے دیپ ہمارے ہیں

ایک جہاں کی کھوج میں اپنے پیار کی نگری چھوڑ آئے
اور زمانہ یہ سمجھا، ہم پیار کی بازی ہارے ہیں

سب سے ہنس کر ملنے والے ہم کو کسی سے بَیر نہیں
دنیا ہے محبوب ہمیں اور ہم دنیا کو پیارے ہیں

غزلِ جدید

ہری چند اختر

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونیکا وقت آیا

اُسے دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

تکلم کی خموشی کہہ رہی ہے حرفِ مطلب سے
کہ اشک آمیز نظروں سے ادا ہونیکا وقت آیا

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونیکا وقت آیا

نوید سربلندی دی منجم نے تو مَیں سمجھا
سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

شعری بھوپالی

غضب ہے جستجوئے دل کا یہ انجام ہو جائے
کہ منزل دور ہو اور راستے میں شام ہو جائے

وہی نالہ، وہی نغمہ، بس اک تفریقِ لفظی ہے
قفس کو منتشر کر دو نشیمن نام ہو جائے

تصدقِ عصمتِ کونین اس مجذوبِ اُلفت پر
جو اُن کا غم چھپائے اور خود بدنام ہو جائے

یہ عالم ہو تو اُن کو بے حجابی کی ضرورت کیا
نقاب اُٹھنے نہ پائے اور جلوہ عام ہو جائے

یہ میرا فیصلہ ہے آپ میرے ہو نہیں سکتے
میں جب جانوں کہ یہ جذبہ مرا ناکام ہو جائے

ابھی تو دل میں ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

اسد ملتانی

○

رہیں نہ رند یہ واعظ کے بس کی بات نہیں
تمام شہر ہے دو چار دس کی بات نہیں

ہیں کچھ طیور فضائے چمن کے زندانی
فقط اسیریٔ دام و قفس کی بات نہیں

نگاہ بھی نہیں اُٹھتی بلندیوں کی طرف
طلب کا ذکر نہیں دسترس کی بات نہیں

نگاہِ دوست سے ہوتی ہے دل کی نشو و نما
یہاں مقابلۂ برق و خس کی بات نہیں

عجب نہیں جو محبت ہو زندۂ جاوید
کہ عرضِ شوق نفس دو نفس کی بات نہیں

پسندِ خاطرِ اہلِ صفا ہے میری غزل
کہ اس میں کوئی ہوا و ہوس کی بات نہیں

اسد یہ کام ہے صد گونہ سینہ کاوی کا
حیات صرف شمارِ نفس کی بات نہیں

کشفی ملتانی

○

دل دل ہی رہیگا، گُلِ تر ہو نہیں سکتا
خوں ہو کے بھی منظورِ نظر ہو نہیں سکتا

جو ظُلم کیا تُو نے، کیا بے جگری سے
ایسا تو کسی کا بھی جگر ہو نہیں سکتا

تھک تھک کے تری راہ میں یُوں بیٹھ گیا ہوں
گویا کہ بس اب مجھ سے سفر ہو نہیں سکتا

اظہارِ محبت مرے آنسو ہی کریں گے
اظہار بہ اندازِ دگر ہو نہیں سکتا

ہر بُوند لہو کی کبھی بنتی نہیں آنسو
جیسے کہ ہر اک قطرہ گہر ہو نہیں سکتا

یہ عہدِ جوانی بھی ہے کچھ ایسا زمانہ
بے بادہ سر جوش بسر ہو نہیں سکتا

لے جائے گا یہ دل مجھے اُس بزم میں آخر
جس میں کہ صبا کا بھی گذر ہو نہیں سکتا

جب تک تری رحمت کا ہے کشفی کو سہارا
سچ یہ ہے گناہوں سے حذر ہو نہیں سکتا

عشرت رحمانی

○

دل ہی نہیں تو دل کے سہاروں کو کیا کروں
جب پاس تم نہیں تو بہاروں کو کیا کروں

جلووں سے جن کے چاند ستاروں میں تھی ضیا
اب وہ ہنسی نہیں تو ستاروں کو کیا کروں

تصویر یا در تصورِ جاناں یہ سب فریب،
میں اُن سے دُور اُنکے نظاروں کو کیا کروں

وُہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ رنگ و بُو
گذری ہوئی حسین بہاروں کو کیا کروں

خوابوں کے نُور چھین لیا اے خیالِ یار
تیرے بغیر ایسے اشاروں کو کیا کروں

دل ہے خزاں نصیب گلستاں ہے پُر بہار
عشرت بھلا میں ایسے نظاروں کو کیا کروں

شوکت تھانوی

○

ہو راہزن کی ہدایت کہ راہبر کے فریب
مری نگاہ نے کھائے نظر نظر کے فریب

یہ بتکدے، یہ کلیسا، یہ مسجدیں یہ حرم
یہ سب فریب ہیں اک اک سنگِ در کے فریب

سمجھ رہے تھے کہ اشکوں سے ہوگا دل ہلکا
نہ جانتے تھے کہ ہیں یہ بھی چشمِ تر کے فریب

پتہ چلا کہ ہر اک گام میں تھی اک منزل
کھلے ہیں منزلِ مقصود پہ سفر کے فریب

ان ہی کا نام محبت ان ہی کا نام جنوں
مری نگاہ کے دھوکے تری نظر کے فریب

وحید قریشی

○

غم کے ہاتھوں (شکرِ خدا ہے) عشق کا چرچا عام نہیں
گلی گلی پتھر پڑتے ہوں ہم ایسے بدنام نہیں

وہ بھی کیا دن تھے جن روزوں بےفکری میں کٹتے تھے
اب کیسی اُفتاد پڑی ہے چین نہیں آرام نہیں

دل کے اُجڑتے ہی آنکھوں نے حیف یہ عالم دیکھ لیا
جلوہ سرِ رہ کوئی نہیں ہے کوئی بروئے بام نہیں

جس کے اثر سے بےخود ہو کر اپنے تئیں ہم رُسوا ہوں
موجِ نشّۂ گل کے ہاتھوں میں ایسا کوئی جام نہیں

دل کا رونا، دل کا کھونا، لاکھ عذابِ الیم سہی
ہمت ہار کے بیٹھ ہی جائیں ہم ایسے ناکام نہیں

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کب سے خوار و پریشاں ہیں
فرصت ہو تو آ کر دیکھو ہم آوارہ گردوں کو

سر جو جھکا اس شوخ کے آگے اور کہیں پھر جھک نہ سکا
کچھ تو مداوا کرنا ہوگا اِس آشفتہ مزاجی کا

وادی صحرا ڈھونڈ کے جب سے تیرے شہر میں آن بسے
ہم نے اپنی طرف سے خواہاں کب تم کو بدنام کیا

اہلِ زمانہ کو بس میری اک رُسوائی یاد رہی
ورنہ رہا کچھ موج بلا کا رُخ بھی پھرا دُنیا کی ہوا کا

خیر سے اب کے اہلِ ستم کو دیوانوں سے کام پڑا ہے
جو پامالِ خزاں ہیں اک دن خاکِ چمن سے پھر اُٹھیں گے

اک اک بوند جلی ہے لہو کی تب جا کر یہ رات کٹی

یاں اپنا ہی ہوش نہیں ہے کس کو یاد کے …
کتنے غبار ہیں اس من میں کتنے دل ایں …
سنگِ مہر و وفا ہیں واعظ ہم کافر بھی …
اے غمِ جاناں اپنے پیارے سب ہی تجھ سے …
جنگل جنگل ڈھونڈتے پھرتے ہم کو سارے …
تم نے جو جو داغ دئے ہیں وہ چھاتی پہ …
ورنہ میری وفا کے جانے کتنے اور بھی …
رونا کیا ہے کہ رہ گزرے گا، اس کے ہم …
دیکھی کتنی زنجیریں ہیں دیکھیں کتنے …
اُن کا شہر نہ جانے کیا ہو جو مقتول …
تیرے لئے اُمیّدِ طرب ہم کب سے جاگ …

میر کا طرز اپنایا سب نے لیکن یہ انداز کہاں
اعظمی صاحب آپ کی غزلیں سُن سُن کر سب حیراں ہیں

شاد

نریش کمار

شام وعدہ کا ڈھل گیا سایا
آنے والا ابھی نہیں آیا

زندگی کے غموں کو اپنا کر
ہم نے دراصل تجھ کو اپنایا

جستجو ہی دلوں کی منزل تھی
ہم نے کھو کر تجھے، تجھے پایا

زندگی نام ہے جدائی کا
آپ آئے تو مجھ کو یاد آیا

ہم نے تیری جفا کے پردے میں
خود بھی دل پہ بہت ستم ڈھایا

زندگی سے تو خیر شکوہ تھا،
مدتوں موت نے بھی ترسایا

شاد اہلِ طرب کو بھی اکثر
میری افسردگی پہ پیار آیا

حزیں

شعیب احمد

یوں غرق تھا ان جلووں میں حزیں نظریں بھی اٹھانا بھول گیا
خود عینِ فسانہ بن تو گیا، عنوانِ فسانہ بھول گیا

مانا وہ نگاہیں بجلی تھیں، مانا وہ تبسم شعلہ تھا
دل برق کی زد پہ خود آیا، یہ بات زمانہ بھول گیا

وہ برق گرانے والا بھی خود اس کی تلافی کر نہ سکا
دامن کی ہوائیں کیا کرتیں دل ہوش میں آنا بھول گیا

ہونٹوں پہ تبسم کی بجلی، آنکھوں میں تجلی کے طوفاں
اس طرح وہ آئے محفل میں نظریں جھکانا بھول گیا

نخشب جارچوی

کوئی کس طرح رازِ اُلفت چھپائے
نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے

وہ مجبوریوں پر مری مُسکرائے
یہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو آئے

محبت میں کچھ اتفاقات بھی تھے
کہ جو میری تقدیر بننے نہ پائے

ترا غم بھلا کیا چھپائے سے چھپتا
بہت اشک روکے بہت مسکرائے

وہ اس طرح میرے برابر سے گزرے
ادائیں سنبھالے نگاہیں جھکائے

زمانے کے جور و ستم توبہ توبہ
کہ اکثر تو مجھ کو نہ تم یاد آئے

ترے رُوبرو گر نظر مطمئن ہو
تو سینے میں دل بھی دھڑکنے نہ پائے

میں اِس احتیاطِ نظر کے تصدق
نہ بیگانہ سمجھے نہ اپنا بنائے

یہی تو جوابِ شکایت تھا نخشب
مرے شعر اُس نے مجھی کو سنائے

کیف

حکیم ہاشم جان

○

منزل ہے سفر میں مری یا میں ہوں سفر میں
اتنا بھی نہیں ہوش تری راہ گزر میں

حسرت ہے اب اتنی دلِ شوریدہ اثر میں
میں اُن کی نظر میں رہوں وہ میری نظر میں

کیا کیا نہ دکھائی تری رفتار نے شوخی
پس پس گئے فتنے بھی تری راہ گزر میں

تم چھپ نہیں سکتے، کہیں تم جا نہیں سکتے
تم میرے تخیل میں ہو تم میری نظر میں

ہر قافلے والے سے نہ تھی رسم بڑھانی
ملنا تھا مسافر کی طرح کیف سفر میں

حمیدہ نسیم

محبت جادہ ہے منزل نہیں ہے
یہ مشکل آخری مشکل نہیں ہے

دلِ رہرو میں ہیں کچھ اور خطرے
خیالِ دوریٔ منزل نہیں ہے

خرد باطل خرد پر ناز باطل
مگر میرا جنوں باطل نہیں ہے

یہ دل بے مہر بھی ہے بے وفا بھی
نہیں یہ دل تو میرا دل نہیں ہے

ڈراتا ہے مجھے یوں خندۂ برق
مجھے اندیشۂ حاصل نہیں ہے

میں سب کچھ جانتا ہوں اپنا انجام
مگر اظہار کے قابل نہیں ہے

میانِ قعرِ دریا ہے سفینہ
نہیں اے ناخدا ساحل نہیں ہے

یہاں مہر و وفا نادانیاں ہیں
یہ دنیا عشق کے قابل نہیں ہے

یہ ہے مرحوم امیدوں کا مدفن
کبھی دل تھا مگر اب دل نہیں ہے

تابش دہلوی

ہو گا سکوں بھی ہوتے ہوتے
سو جاؤں گا روتے روتے

آخر دل ہے، ٹھہر جائے گا
شام و سحر کے ہوتے ہوتے

وحشت ناک ہے خوابِ ہستی
چونک پڑا ہوں سوتے سوتے

داغِ دل اشکوں سے مٹے گا
دھلتے دھلتے دھوتے دھوتے

آپ سے آپ ترے دیوانے
ہنس بھی دیتے ہیں روتے روتے

اختر ہوشیارپوری

پھر ابر برس کے کھل گیا ہے
مے خانے کا بھیس دُھل گیا ہے

ان گالوں میں عکس ہے شفق کا
یا رنگ نظر میں گھل گیا ہے

ہشیار غمِ جہاں اِدھر ہے
اک پیکرِ کیف ڈُل گیا ہے

یہ تیرے بدن کی کسمساہٹ
پھولوں میں زمانہ تل گیا ہے

اُف تیری نظر کی مے فشانی
دامانِ حیات دُھل گیا ہے

اسال تو دُور دُور اختر
افسانۂ بوئے گل گیا ہے!

اقبال صفی پوری

گزر گئی جو چمن پر وہ کوئی کیا جانے
چھڑے ہوئے ہیں بہار و خزاں کے افسانے

جہاں پہ چاک گریباں بھی چاکِ دل بن جائے
گزر رہے ہیں اب ان منزلوں سے دیوانے

مرے لبوں کا تبسم تو سب نے دیکھ لیا
جو دل پہ بیت رہی ہے وہ کوئی کیا جانے

ترے حضور جنہیں کہہ سکی نہ گویائی!!
مرے سکوت نے دہرا دئیے وہ افسانے

نگاہِ عشق میں دیر و حرم کی قید نہیں
کہیں بھی شمع جلے، اُڑ چلیں گے پروانے

تمام وسعتِ کونین کو ڈبو دیں گے!
چھلک گئے جو کہیں اس نظر کے پیمانے

نہ اشتیاقِ نظارہ، نہ اعتبارِ جمال!
ٹھہر گئی ہے کہاں زندگی خدا جانے

نہ شمعِ بزم پہ کچھ آنچ آئے گی اقبال
خود اپنی آگ میں جلتے رہیں گے پروانے

خاطر غزنوی

جب اس زلف کی بات چلی
ڈھلتے ڈھلتے رات ڈھلی

پھر بھی پھیکی پھیر بھی ہنسی
دیکھ کے سب حالات کلی

شمع کا بھی انجام نہ پوچھ
پروانوں کے ساتھ جلی

اب کے بھی تم دور رہے
اب کے بھی برسات چلی

ان آنکھوں نے لوٹ کے بھی
اپنے اوپر بات نہ لی

خاطر یہ ہے بازئ دل
اس میں جیت سے مات بھلی

احمد فراز

ہم بھی خود دشمن جاں تھے پہلے
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اب وہاں خاک اُڑاتی ہے خزاں
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں
صورتِ موج رواں تھے پہلے

کچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیں
رونقِ بزم جہاں تھے پہلے

ہم کہ ہیں آج غبارِ پس رَو
منزلِ ہم سفراں تھے پہلے

بن گیا قافلہ چلتے چلتے
ورنہ تنہا ہی رواں تھے پہلے

اب کسے وضعِ محبت کا خیال
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعمِ وفا
تم سے ہم شکوہ کناں تھے پہلے

دولتِ غم تو میسر تھی فراز
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

فارغ بخاری

یہی ہے دورِ غمِ عاشقی تو کیا ہوگا
اسی طرح سے کٹی زندگی تو کیا ہوگا

ابھی تو ہم نفسوں کو ہے وہمِ چارہ گری
ہوئی نہ درد میں پھر بھی کمی تو کیا ہوگا

یہ تیرگی تو بہر حال چھٹ ہی جائے گی
نہ راس آئی ہمیں روشنی تو کیا ہوگا

امید ہے کہ کبھی تو لبوں پہ آئے گی
کبھی نہ آئی لبوں پر ہنسی تو کیا ہوگا

نفس نفس میں فغاں ہے، نظر نظر میں ہراس
کچھ اور دن یہی حالت رہی تو کیا ہوگا

رضا ہمدانی

یہ دورِ مسرت یہ تیور تمہارے
ابھرنے سے پہلے نہ ڈوبیں ستارے

بھنور سے لڑو، تند لہروں سے الجھو
کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

عجب چیز ہے یہ محبت کی بازی
جو ہارے وہ جیتے جو جیتے وہ ہارے

یہ ناگنیں بن کے ڈستی ہیں کرنیں
کہاں کوئی یہ روزِ روشن گزارے

سفینے وہاں ڈوب کر ہی رہے ہیں
جہاں حوصلے ناخداؤں نے ہارے

کئی انقلابات آئے جہاں میں
مگر آج تک دن نہ بدلے ہمارے

رضاؔ سیلِ نو کی خبر دے رہے ہیں
افق کو یہ چھوتے ہوئے تیز دھارے

سلیم واحد سلیم

روح کی شعلہ مزاجی کا مداوا کچھ تو ہو
دشتِ وحشت ہو کہ زندانِ تمنا کچھ تو ہو

کب تلک یونہی رہیں گے اہلِ دل محرومِ دید
جراتِ بے باک یا حسنِ تقاضا کچھ تو ہو

ایک سناٹے میں گم ہیں زندگی کی شورشیں
شورِ محشر یا سکوتِ حشر پیا کچھ تو ہو

اک کرن بھی تو نہیں غم کی اندھیری رات میں
کوئی جگنو، کوئی آنسو، کوئی تارا کچھ تو ہو

ہم تو دیوانے تھے بربادی مقدر میں ہی
ہوش والوں نے مگر اس در سے پایا کچھ تو ہو

صبح کے نغموں سے گونج اٹھے بیابانِ امید
بول اٹھے یا سکوتِ شامِ صحرا کچھ تو ہو

ہم دلِ بیتاب کو بھی راہ پر لاتے سلیم
دل مگر راہِ وفا میں بھولا بھٹکا کچھ تو ہو

احمد ظفر

آپ کہیں تو گلشن ہے
ورنہ دل اک مدفن ہے

کیسے یہ دن رات کٹیں
ایک مسلسل الجھن ہے

آگ لگی ہے سانسوں میں
ہائے یہ کیسا ساون ہے

اُن سے میری بات نہ پوچھ
اُن سے میری اَن بن ہے

پنچھی پنچھی سہم گیا
دوست یہ اچھا گلشن ہے

تاریکی مٹ جائے گی
مشعل مشعل روشن ہے

وقت کی ہر آواز ظفر
میرے دل کی دھڑکن ہے

مینائے غزل

ماہ لقا

چندا بی بی

○

تم مُنہ لگا کے غیروں کو مغرور مت کرو
تک چلنا ایسے دیووں سے دستور مت کرو

ٹُک بہانے ہر گھڑی زاری نہیں ہے خوب
یہ رازِ عشق ہے اسے مشہور مت کرو

ہر چند دل دُکھانا کسی کا بُرا ہے پر
رنجیدہ خاطروں کو تو رنجور مت کرو

اے ہمدمو جو مجھ سے ہے منظور اختلاط
بُجز ذکرِ یار تم کوئی مذکور مت کرو

روشن رکھو جہان میں مولا مثالِ مہر
چنداؔ کے منہ سے نُور کو تم دُور مت کرو

○

شیشۂ دل کو دیا ہُوں تیرے ہات
چُور یا ثابت ہو رکھ تُو اپنے سات

کعبۂ دل ہی سمجھ کر اپنا گھر
اے مُحبت نا مہرباں رہ ایک رات

اِنتظار آخر ہُوا اے گلعذار
غنچۂ لب سے نہ کی پر تُو نے بات

دو ہی دِن ملنے میں تم گھبرا گئے
پھر خدا ہی جانے کب ہو ایسی گھات

رُوبرو چنداؔ کے ہووے کیا عجب
مشتری و زہرہ و پر دیں کو مات

ادا جعفری (بدایونی)

○

فریب کاریِ تخئیل پہ جو اترائے
اب ایسے سرکش و ناداں کو کون سمجھائے

ہزار غنچوں نے چاہا الگ تھلگ رہنا
جو کوئی شوخ کرن آپ ہی اُلجھ جائے

گرہ کشائیِ شبنم کی داد کیا دیں دل
ہنسی کے ساتھ ہی آنکھوں میں اشک بھر آئے

نگاہِ قہر کی گرمی کی تاب کیا لاتے
نگاہِ مہر کی شوخی سے بھی جو کُمھلائے

تری نگاہ کی حیرانیوں کے افسانے
مری نگاہ کی نادانیوں نے سُلجھائے

○

ڈھلکے ڈھلکے آنسو ڈھلکے — چھلکے چھلکے ساغر چھلکے
دل کے تقاضے اُن کے اشارے — بوجھل بوجھل ہلکے ہلکے
دیکھو دیکھو دامن اُلجھا — ٹھہرو ٹھہرو ساغر چھلکے
ان کا تغافل اُن کی توجہ — اک دل اس پر لاکھ تھلکے
اُن کی تمنا اُن کی محبت — دیکھو سنبھل کے دیکھو سنبھل کے
غم نے اُٹھائے سینکڑوں طوفاں — دل نے بسائے لاکھ محلّے
پل میں ہنساؤ پل میں رُلاؤ — پل میں اُجالے پل میں دُھندلکے
ہم نے نہ سمجھا تم نے نہ جانا — دل نے مچائے لاکھ تہلکے
لاکھ منایا لاکھ بُھلایا — نین کٹورے بھر بھر چھلکے
کتنے اُلجھے کتنے سیدھے — رستے اُن کے رنگ محل کے

کڑیاں جھیلیں پاپڑ بیلے
جھلکے اب تو مکھڑا جھل کے

زہرہ نگاہ

○

صبر و ضبط کے لے کے بیشمار زمانے
تیری یاد آئی تھی، آج مجھ کو سمجھانے

پا گئے ہیں منزل کو خود بخود ہی دیوانے
عقل کے دوراہے پر کھو گئے ہیں فرزانے

تم نے بات کہہ ڈالی کوئی بھی نہ پہچانا
ہم نے بات سوچی تھی بن گئے ہیں افسانے

ان نئی بہاروں پر ان نئے نظاروں پر
ایک رند ہی کیا ہیں، رو رہے ہیں میخانے

ہائے کیا عجیب ہے، ہائے کیا تیری الفت ہے
ہم ہی کھا گئے دھوکہ، ہم چلے تھے سمجھانے

○

خوش جو آئے تجھے پشیمان گئے
اے تغافل تجھے پہچان گئے

خوب ہے صاحب محفل کی ادا
کوئی بولا تو بُرا مان گئے

کوئی دھڑکن ہے نہ آنسو نہ اُمنگ
وقت کے ساتھ یہ ٹوفان گئے

اُس کو سمجھے کہ نہ سمجھے لیکن
گردش دہر تجھے جان گئے

تیری ایک ایک ادا پہچانی
اپنی ایک ایک خطا مان گئے

اس جگہ عقل نے دھوکا کھایا
جس جگہ دل تیرے فرمان گئے

اختر

نواب اختر محل

○

اک آہ شعلہ بار سے دل کو جلا دیا
لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا
ان کا تھا کھیل، خاک میں ہم کو ملا دیا

خط لے کے نامہ بر سے جو ٹکڑے اڑا دیا
غیروں نے آج اُن کے تئیں کچھ پڑھا دیا

تقصیر یار کی، نہ قصورِ عدو ہے کچھ
اختر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

شیریں

نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال

○

خالق ہے خدائے سحر و شام ہمارا
مشہور اسی نے یہ کیا نام ہمارا

پیدا ہوئے ہم اُمتِ محبوبِ خدا میں
برتر نہ ہو کیوں رتبۂ اسلام ہمارا

ہم کرتے ہیں حج کوچۂ دلدار کا اپنے
ہے چادرِ تن جامۂ احرام ہمارا

فرقت میں تری ساتھ دیا اپنا اسی نے
کام آیا بہت یہ دلِ ناکام ہمارا

پہلی سی رکاوٹ نہیں اب ہر نظرِ لطف
آغاز سے بہتر ہوا انجام ہمارا

کافر کیا مجھ کو، تری اس زلف کے کاف
اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا

دنیا میں بڑا شور ہے شکر آگنی کا
شیریں جو تخلص میں ہوا نام ہمارا

نزاکت

○

بسکہ رہتا ہے یار آنکھوں میں
ہے نظر بے قرار آنکھوں میں

محفلِ گل رُخاں میں وہ گل رُو
لے گیا دل ہزار آنکھوں میں

سُرمۂ خاکِ پا عنایت ہو
آگیا ہے غبار آنکھوں میں

یاد آئے کمر جو گُلشن میں
ہو رگِ گل بھی خار آنکھوں میں

عالم

نواب بادشاہ محل

○

مجھ سے آزردہ میرا یار ہے آج
صبر کیسا، کسے قرار ہے آج

کل تو ہنس ہنس کے کر رہے تھے کلام
باتیں کرنے میں مجھ سے عار ہے آج

ساقیا! کس کا جامِ عشق پیا
چشمِ بد دُور، کیا خُمار ہے آج

نہیں ثابت کہ کیا ہُوا دل کو
مثلِ سیماب بے قرار ہے آج

جلد آ، اے عزیزِ مصرِ جمال!
تیرا عالم کو انتظار ہے آج

مشتری

قمرن جان لکھنوی

○

مے ہے، گلزار ہے، ساقی ہے، گھٹا چھائی ہے
کہہ دو توبہ شکنوں سے کہ بہار آئی ہے

کیا بلا عشق ہے جیتی ہوں تو بدنام ہوں میں
جان دیتی ہوں تو اس شوخ کی رسوائی ہے

کیا جنوں خیز ہے اُس کے گُلِ عارض کی بہار
کہ جسے دیکھئے خود رفتہ ہے، سودائی ہے

لی خبر اپنے مریضِ شبِ غم کی نہ کبھی
بس انہی باتوں پہ دعوائے مسیحائی ہے

شبِ فرقت کے جوائے مشتری جاگے تھے ہم
کیا تہِ خنجرِ قاتل ہمیں نیند آئی ہے

زہرہ

امراؤ جان لکھنوی

○

حوصلہ آپ کو جفا کا ہے
یہ نتیجہ مری وفا کا ہے

زلف کھولے ہوئے وہ آتا ہے
سامنا آج کس بلا کا ہے

اپنے مطلب کے آشنا سب ہیں
آشنا کون آشنا کا ہے

شیخ نے کعبہ، برہمن نے دیر
درِ مے خانہ ہم نے تاکا ہے

کیا کرے رہ کے ہند میں زہرہ
عزم بالجزم کربلا کا ہے

نازک

زینت بیگم

○

کوچہ میں کوئی سسکے، کوئی در پہ مرے ہے
انصاف بھی کچھ ہے، تو یہ کیا ظلم کرے ہے

موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے
وُہ وہم و گماں سے بھی حقیقت میں پرے ہے

ہے نالہ و زاری کا مرے شور فلک تک
پر وُہ بُتِ مغرور کوئی کان دھرے ہے

یاد آتی ہے اِن آنکھوں میں آمد وُہ نشہ کی
ساقی مئے گلرنگ سے جب جام بھرے ہے

غش میں مجھے کل دیکھ کے وُہ ڈر کے یہ بولا
بس ہوش میں آ، کیوں مجھے بدنام کرے ہے

پیغامِ اجل چاہ ہے اُس بُت کی، ولیکن
کب عاشقِ جاں باختہ مرنے سے ڈرے ہے

جلتے تمہیں ٹک دیکھا، تو آنکھیں نہ نکالو
منظور ہمیں تو نظرے خوش گذرے ہے

نازک سفرِ دُور کو گویا وُہ سدھارا
گرمِ طلبِ شوق کے نزدیک مرے ہے

موتی

موتی جان

○

گلابی رُو برو ہے اور ہم ہیں
بس اب جام و سبُو ہے اور ہم ہیں

سیا گر تُو نے چاکِ جیب ناصح!
تو پھر تارِ رفُو ہے اور ہم ہیں

بلا سے گو نہ ہووے دل کو واشُد
ہجومِ یاس تو ہے اور ہم ہیں

شبِ مہتاب میں تا صُبح ساقی
خیالِ ماہ رُو ہے اور ہم ہیں

یہ جی میں لہر گیا آئی کہ موتی
کنارِ آبِ جُو ہے اور ہم ہیں

شیریںؔ

سنتا ہے کون کس سے کہوں ماجرائے دل
بہتر یہ ہے کسی سے نہ کوئی لگائے دل

کیونکر رہیں حواس جو قابو سے جائے دل
اے کاش! موت آئے، کسی پر نہ آئے دل

باتیں وہ دل فریب، ادائیں وہ دل رُبا
ایسے پری جمال پہ کیونکر نہ آئے دل

بے مہر و بے مروّت و نا آشنا ہو تُم
تُم سے خدا کرے نہ کوئی بھی لگائے دل

شیریںؔ کا یہ کلام ہے، ہر وقت ہر گھڑی
جس کو خُدا خراب کرے وہ لگائے دل

لطیفؔ

محمدی جان صاحبہ

آیا جمالِ یار کا جلوہ نظر کہاں
نخلِ مُراد نے ابھی پایا ثمر کہاں

کرتے ہیں سیرِ عالمِ لاہوت کی بشر
ہوتا ہے مشتِ خاک کا دیکھو گزر کہاں

عاشق نے تیرے چھان لی دیر و حرم کی خاک
اب اور تجھ کو ڈھونڈے وہ اے سیم بر کہاں

پُوچھوں میں کس سے آہ کدھر جاؤں میں لطیفؔ
ملتی ہے رفتگانِ عدم کی خبر کہاں

شباب

حسین باندی بنارسی

○

مے کشی کا لطف تنہائی میں کیا، کچھ بھی نہیں
یار پہلو میں نہ ہو جب تک مزا کچھ بھی نہیں

تم رہو پہلو میں میرے، میں تمہیں دیکھا کروں
حسرتِ دل اے صنم! اس کے سوا کچھ بھی نہیں

حضرتِ دل کی بدولت میری رسوائی ہوئی
اس کا شکوہ آپ سے اے دل، ربا کچھ بھی نہیں

قسمتِ بد دیکھیے، پوچھا جو اس نے حالِ دل
باندھ کے ہاتھوں کو میں نے کہہ دیا کچھ بھی نہیں

آپ ہی تو چھیڑ کر پوچھا ہمارا حالِ دل
بولے پھر منہ پھیر کے، ہم نے سنا کچھ بھی نہیں

کوچۂ الفت میں انساں دیکھ کر رکھے قدم
ابتدا اچھی ہے اس کی، انتہا کچھ بھی نہیں

دلبر

امراؤ بیان

○

سوجھی ہے کتنی دور کی مجھ کو خمار میں
بنت العنب کو پھر میں بٹھاؤں کنار میں

ہم لاکھ چاہتے ہیں نہ اس شوخ سے ملیں
پر کیا کریں کہ دل ہی نہیں اختیار میں

اللہ رے شوقِ کوچۂ قاتل کہ بعدِ مرگ
اڑ کر مرا غبار گیا کوئے یار میں

تم آ گئے تو از سرِ نو زندگی ہوئی
باقی نہیں تھی جان مرے جسمِ زار میں

دلبر کو کربلا میں بلا لیجیے حسین
گھیرا ہے آفتوں نے بہت اس دیار میں

نُورجہاں نازؔ

○

طے نیم جاں کا آج بھی جھگڑا نہ ہو سکا
تجھ سے ستم بھی اے ستم آرا نہ ہو سکا

جب دردِ دل کا تم سے مداوا نہ ہو سکا
پھر کچھ بھی تم سے حضرتِ عیسیٰ نہ ہو سکا

اللہ رے روانیٔ چشمِ شبِ فراق
یُوں تیز رَو کبھی کوئی دریا نہ ہو سکا

اندھیر ہے کہ موت بھی معشوق بن گئی
ہرچند چاہا رات کو مرنا نہ ہو سکا

کِس وقت بہرِ پرسشِ بیمار آئے وہ
جب آنکھ سے بھی اپنی اشارا نہ ہو سکا

شوخؔ

شہزادی جان اکبر آبادی

○

تمہارے گیسو و رُخ پر نثار ہم بھی ہیں
اِسی خیال میں لیل و نہار ہم بھی ہیں

جو دیکھا جانبِ غیر اُس نے دِل پُکار اُٹھا
نگاہِ لُطف کے اُمّیدوار ہم بھی ہیں

مٹے ہیں آپ تو حُورانِ خُلد پر واعظ
بتانِ ہند پہ دِل سے نثار ہم بھی ہیں

خود اپنے ہاتھ سے تعزیر آپ دیں ہم کو
خطا معاف ہو! تقصیروار ہم بھی ہیں

تُمہارے ساتھ ہمیں بھی ہے ایک نسبتِ خاص
جو آپ شوخ ہیں تو بے قرار ہم بھی ہیں

اختتامیہ

محمد حسین آزاد

رُخِ رنگیں کی جو ہوں یاد میں خوں بار آنکھیں
میرے دامن کو کریں دامنِ گلزار آنکھیں

کیا غضب ہیں تری اے ترکِ جفاکار آنکھیں
وہ ہی کر دیتی ہیں ہو جاتی ہیں جب چار آنکھیں

چشمِ کافر میں نشہ کے ہیں جو ڈورے ساقی
کیا بھلی لگتی ہیں پہنے ہوئے زنار آنکھیں

سچ ہے اک جا پہ بہم کیونکہ رہیں دو بیمار
میرا بیمار ہے دِل اُن کی ہیں بیمار آنکھیں

ہائے حسرت نہ بر آئی کبھی دل کی آزاد
ساتھ ہی لے کے چلیں حسرتِ دیدار آنکھیں

آسی غازی پوری

تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
مُنہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

ناتوانوں کے سہارے کو ہے یہ بھی کافی
دامنِ لُطفِ غبارِ پسِ محمل دینا

ذوق میں صورتِ موج آ کے فنا ہو جاؤں
کوئی بوسہ تو بھلا اے لبِ ساحل دینا

ہائے رے ہائے تری عقدہ کشائی کے مزے
تُو ہی کھولے جسے وہ عقدۂ مشکل دینا

ایک فتنہ ہے قیامت میں بہارِ فردوس
جُز ترے کچھ بھی نہ چاہے مجھے وہ دِل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دِل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دِل دینا

مرزا ہادی رسوا

نالہ رکتا ہے، تو سر گرم جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے، تو بے درد خفا ہوتا ہے

پھر نظر جھینپتی ہے، آنکھ جھکی جاتی ہے
دیکھیے دیکھیے پھر تیر خطا ہوتا ہے

عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا؟
دم نکلنے میں بھی کم بخت مزا ہوتا ہے

حالِ دل اُن سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہوں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

ہجر میں نالہ و فریاد سے باز آ رسوا
ایسی باتوں سے وُہ بے درد خفا ہوتا ہے

راسخ عظیم آبادی

مرا سینہ اے محبت جو بنے تو باغ کرنا
یہ اسی لیے بنا ہے اسے داغ داغ کرنا

وہ کہاں ملیں جنھوں کو تری جستجو نے کھویا
کبھی گم شدوں کا اپنے نہ سرِ سراغ کرنا

مجھے رفتگی سی کچھ ہے تری چشم دیکھ ساقی
نہ شراب سے لبالب تو مرا ایاغ کرنا

غمِ دہر سے رہائی نہیں جیتے جی میسر
نہ خیال دار ہی اے دلِ بے فراغ کرنا

دو جہاں میں تم کو بس ہے یہی داغِ یار راسخ
شبِ گور کا بھی اپنی تم اسے چراغ کرنا

بے نظیر شاہ

نہ رہا حجاب نیاز بھی جو نگاہِ اہلِ نیاز میں
تو رہا نہ تیرے سوا کوئی پسِ پردۂ حسنِ مجاز میں

نہ ہو اپنی آنکھ جو حسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو ہو غزنوی کی نگاہ ہو، وہی خم ہے زلفِ ایاز میں

ہمہ تن تصورِ دید ہوں طرب آشنائے نوید ہوں
کہ ترانہ کش ہیں خموشیاں مرے دل کے پردۂ راز میں

تو چراغِ دیر و حرم ہے تجھے کیا پڑی ہے جو تُو جلے
کہ تمام رات بسر ہوئی ہے کسی کی سوز و گداز میں

پسِ مرگ دادِ وفا ملی، یہ مرادِ دستِ دعا ملی
کہ تری وفا نے اٹھا لیے مرے پھول دامنِ ناز میں

جو بنا یہاں وہی لٹ گیا جو مٹا یہاں وہی بن گیا
یہی بے نظیر رواج ہے رہِ عشق شعبدہ باز میں

قاضی صادق اختر

جب پردہ رخ سے دور کرے وہ نقاب کا
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہو آفتاب کا

کل بن کے شیخ مجتہدِ عصر ساقیا
دکھلا کے باغ سبز عذاب و ثواب کا

کہنے لگا زراہِ تبختر مجھے بہ طنز
معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا

ہم نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
کیجے جو آپ مجھ کو نہ موردِ عتاب کا

تقویٰ ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
اور ہو یقین آپ کے اِس اجتناب کا

مے ہو صبوحی کنجِ باغ ہو ساقی ہو ماہ وش
اور واں مخل نہ ہو کوئی باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شیخ جی چلا
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا

سینے سے اپنا سینہ ملا کر وہ منہ سے منہ
یہ ریشِ حضرت جلوہ ہے رنگِ خضاب کا

منت سے یوں کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا

اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجئے روزِ حساب کا

اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

مائلؔ دہلوی

محمد تقی بیگ

بیخودی میں قدم غیر پہ سر رکھتے ہیں
شوق سا شوق ترے خستہ جگر رکھتے ہیں

آج کہتی ہے شبِ غم کی سیاہی کچھ اور
آج مر جائیں جو ارمانِ سحر رکھتے ہیں

تم نے دیکھے ہی نہیں دردِ محبت والے
لاکھوں ایسے ہیں کہ باتوں میں اثر رکھتے ہیں

ہم کو مرنے کا نہیں رنج خوشی ہے اس کی
آج ہم اپنی خوشی میں اثر رکھتے ہیں

کیا ہوا حضرتِ مائلؔ نے جو دیکھا اس کو
اہلِ دل جتنے ہیں سب ذوقِ نظر رکھتے ہیں

بزمؔ اکبر آبادی

مزے اب ان کی اُلفت میں وہ حاصل ہوتے جاتے ہیں
کہ اعضا جس قدر اپنے ہیں سب دل ہوتے جاتے ہیں

کبھی رہتے ہیں آنکھوں میں کبھی رہتے ہیں وہ دل میں
یہ دونوں گھر ہمارے عیش منزل ہوتے جاتے ہیں

مرادِ آئی تری اے دل کہ جویا تھا شہادت کا
سنا ہے وہ ستم کرنے کے قابل ہوتے جاتے ہیں

مرے غم خوار ہمدم ہو کے دم بھرنے لگے ان کا
بڑے عیار اب تو حضرتِ دل ہوتے جاتے ہیں

عجب کچھ بزمؔ اب تو صاحبانِ فن کی حالت ہے
کہ منہ کی کھاتے جاتے ہیں مقابل ہوتے جاتے ہیں

سورج نرائن مہر

ہمارے حال کی جا کر انہیں خبر تو کریں
وہ کیوں نہ آئیں گے تدبیر چارہ گر تو کریں

کریں گے عرض بھی کچھ چین لے ذرا اے دل
وہ انجمن میں ہماری طرف نظر تو کریں

بہت سے تشنۂ دیدار روز جا بیٹھیں
مگر کبھی وہ سرِ رہگذر گذر تو کریں

جلا دے شمع کی مانند تو مجھے اے عشق
کہ اور لوگ ذرا تجھ سے الحذر تو کریں

ہم ان سے ذکر نہیں کرتے بزمِ اعدا کا
کہ ذکر وہ ہے یہ منظور ہو جو شر تو کریں

نہ مجھ سے جذبۂ دل یہ بھی ہو سکا افسوس
کہ قبرِ مہر پہ وہ ایک دن گذر تو کریں

ثاقب کانپوری

اس عشق کا انجام میں کچھ سوچ رہا ہوں
ہاں اے ہوسِ خام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

خالی ہوئے سب جام، نہیں کوئی بھی میکش
اے دُردِ تہِ جام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

جی بھر کے تجھے آج میں دیکھوں کہ نہ دیکھوں
اے حُسنِ لبِ بام! میں کچھ سوچ رہا ہوں

اپنے دلِ بیتاب سے میں خود ہوں پریشاں
کیا دوں انہیں الزام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

تارے سے چمکنے لگے تاریک فضا میں
ہاتھوں میں لئے جام، میں کچھ سوچ رہا ہوں

امجد حیدر آبادی

○

کام کب حسبِ مدعا نہ ہوا
اس کے فضل و کرم سے کیا نہ ہوا

ڈھونڈتا ہوں مَیں ہر نفس اس کو
مجھ سے جو اک نفس جدا نہ ہوا

کیا ملا وحدتِ وجودی سے
بندہ بندہ رہا، خدا نہ ہوا

بندگی میں یہ کبریائی ہے
خیر گزری کہ مَیں خدا نہ ہوا

پاک ہستی سے میری نسبت ہے
مَیں بُرا ہو کے بھی بُرا نہ ہوا

غیر کی کیا شکایت اے امجد
آہ! جب میرا دل، مرا نہ ہوا

جگر بریلوی

○

دل اکیلا رہ کے اُجڑ گیا مجھے میہماں کی تلاش ہے
گل و لالہ کی ہمیں ہے ہوس ہمیں باغباں کی تلاش ہے

کوئی اور ہونگے جو بھولے ہوں ہمیں عہدِ رفتہ ہے یاد ابھی
ہمیں ہے بہار کی آرزو ہمیں گلستاں کی تلاش ہے

سرِ راہ چھوڑ کے چل دیا نہ پھر اس طرف کبھی رُخ کیا
ہمیں غیر جس نے سمجھ لیا اسی کارواں کی تلاش ہے

پر و بال پہلے درست کر تو تپش بھی دل کی مدد کرے
تجھے عندلیبِ شکستہ پر، عبث آشیاں کی تلاش ہے

ہے عجب جگر کا غمِ نہاں، ہے عجیب حسن میں سوال و دولاں
کبھی دلستاں سے ہے بے غرض کبھی دلستاں کی تلاش ہے

قمر بدایونی

وہ جو کچھ کہے سچ کہے کہہ چکا
یہ قول اس کا قائم ہے رہ چکا

محبت سی شے اور ظاہر نہ ہو
یہ راز اور مخفی رہے رہ چکا

جو کہتا ہے مجھ سے یہاں نامہ بر
یہی ان سے جا کر کہے کہہ چکا

اب اس چشمِ حیراں میں آنسو کہاں
یہ دریا کہاں تھم سکے بہہ چکا

سُنے گا وہ کیا حالِ دل غور سے
جو تمہید ہی پر کہے کہہ چکا

حسینوں کی بے باکیاں دیکھ کر
یہ دل میرے بس میں رہے رہ چکا

قمرؔ میں نقاہت سے دم ہی نہیں
یہ چاند اب کہاں تک گہے گہہ چکا

امید امیٹھوی

آئینہ ہے اگرچہ سکندر لئے ہوئے
میں اس سے کوئی چیز ہوں بہتر لئے ہوئے

کہتا ہے ان سے دردِ محبت کی داستاں
دل کے عوض جو بیٹھے ہیں پتھر لئے ہوئے

وہ چیز ہے کچھ اور جو ہوتی ہے جاں ستاں
قاتل وہی نہیں کہ ہو خنجر لئے ہوئے

واعظ یہ خوبیاں ترے جامِ طہور کی
محراب جھک پڑے نہ کہیں در لئے ہوئے

بس جانیے کہ غم سے زمانہ خراب ہے
جب دیکھیے مجھے مے و ساغر لئے ہوئے

اک وہ کہ جدّ و جہد سے قسمت بدل گئی
اک ہم کہ رو رہے ہیں مقدر لئے ہوئے

افسانے میں بھی رحمتِ حق کے سنا کیا
اک گوشہ میں الگ مے و ساغر لئے ہوئے

ملنا تھا اس نظر سے نظر کا کہ کوئی تیر
دل تک اُتر گئی مرے نشتر لئے ہوئے

امیدؔ پھر بھی مجھ سے زمانہ خلاف ہے
تیغ و علم لئے ہوں نہ لشکر لئے ہوئے

بنواری لال شعلہ

○

ہے عشق میں ابرو کے جو کاہیدہ تن اپنا
سایہ تری تلوار کا ہوگا کفن اپنا

اس منہ کی کریں بات ذرا منہ کو تو بنوائیں
غنچوں سے کہو صاف تو کرلیں دہن اپنا

پرکھولے ہوئے کرتی ہیں پریاں مرا ماتم
اندر کا اکھاڑا ہے یہ بیت الحزن اپنا

کیا کہتے ہیں سُن سُن کے مرے شعر کو شعلہ
اعدا کے لئے تیغ ہے گویا سخن اپنا

وحشی شاہجہانپوری

○

اس وعدہ کا مطلب کیا سمجھوں آسان بھی ہے دشوار بھی ہے
ابرو پہ ہے بل ہونٹوں پہ ہنسی انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

ہے دور تو ہے پرواز وہی، نزدیک ہے تو انداز وہی
ظالم تری چتون ناز بھری کیا تیر بھی ہے تلوار بھی ہے

دینار و درم کچھ پاس نہیں ہاں! مہر و وفا کی دولت ہے
بازارِ جہاں میں دل میرا نادار بھی ہے زردار بھی ہے

جس طرح ہو اک زندانیٔ غم آزاد حدودِ زنداں میں
اس دامِ گہِ ہستی میں بشر مجبور بھی ہے مختار بھی ہے

دنیا کو ہے جانا ایک نے گھر اور ایک نے مانا راہ گزر
کہتے ہیں جسے مرنا وحشی آسان بھی ہے دشوار بھی ہے

برقؔ دہلوی

○

تابشِ حسن، حجابِ رُخِ پُر نور نہیں
رخنہ گر ہو نگہِ شوق تو کچھ دُور نہیں

شبِ فرقت نظر آتے نہیں آثارِ سحر
اتنی ظلمت ہے رُخِ شمع پہ بھی نُور نہیں

رازِ سربستۂ فطرت نہ کھلا ہے نہ کھلے
میں ہوں اس سعی میں مصروف جو مشکور نہیں

صرفِ نیرنگیٔ نظارہ ہے خود اپنی نظر
عینِ وحدت ہے کوئی ناظر و منظور نہیں

نظر آتا نہیں گو منزلِ مقصد کا نشاں
ذوقِ صادق یہی کہتا ہے کہ کچھ دور نہیں

کیفیؔ چڑیا کوٹی

○

ہوئی تھیں پست جس دم ہمتیں جوشِ اسیراں کی
ستم دیکھو کہ اونچی ہو گئی دیوارِ زنداں کی

خدارا مطربِ لذت نوا تو اس کو چھیڑے جا
ترے نغمے سے اب ملنے لگی جنبش رگِ جاں کی

مزا آیا ہے ان کو چھیڑنے کا صحنِ گلشن میں
اُڑا جب رنگِ رُخ رنگت نکھر آئی گلستاں کی

عدم کہتے ہیں جس کو صورتِ خوابِ پریشاں ہے
یہ ہستی کچھ نہیں تعبیر ہے خوابِ پریشاں کی

بہارِ دل کشا کھولے گی، بلبل نغمہ خواں ہو گی
کلی کے ہر ورق میں داستانیں ہیں گلستاں کی

میں بیٹھا ہوں جہاں تھک کر سمجھ میں آ گیا کیفیؔ
مری درماندگی سے اصل وسعت ہے بیاباں کی

اقبال احمد سہیل

○

عرشِ بریں بھی اس کے مقابل نہیں رہا
جس دل کو تُو نے دیکھ لیا دل نہیں رہا

درسِ جنونِ عشق کو کچھ ظرف چاہیے
دیوانہ کیا بنے گا جو عاقل نہیں رہا

چشمِ کرم کی شوخیِ طرزِ ستم نہ پُوچھ
غم بھی بقدرِ حوصلۂ دل نہیں رہا

گُم تھی فضائے حُسن میں کل کائناتِ حُسن
اٹھا غبارِ قیس تو محمل نہیں رہا

اب بھی دلِ حزیں سے تغافل شعار یا
اب یہ تری نظر ہے مرا دل نہیں رہا

جب سے جمالِ عشق ہے پیشِ نظر سہیلؔ
میں آب و رنگِ حُسن کا قائل نہیں رہا

اکبر حیدری

○

جہانِ حُسن میں محوِ ترنّم ہے وفا میری
میں نغمہ ہوں محبت کا محبت ہے وفا میری

دلِ مضطر کو جس پر اعتبارِ حکمرانی تھا
مرے احساسِ خودداری میں ہے وہ التجا میری

امینِ دورِ مستقبل ہیں میری خاک کے ذرّے
حقیقت میں بقا کا پیش خیمہ ہے فنا میری

مشیت کی نگاہوں میں جو معیارِ پرستش تھی
ہوئی ہے جذبِ اشکِ خونفشاں میں وہ دُعا میری

جہانِ قدس تک رُوحِ تخیل سیر کر آئی
مری پرواز کتنی ہے کہاں تک ہے فضا میری

اک آنسو اور وُہ بھی دل کی رنگینی سے بیگانہ
نہ دیکھی جائیگی دُنیا سے تصویرِ وفا میری

نیاز و ناز کا افسانہ لکھنے کے لئے اکبرؔ
سُنی ہے کاتبِ قسمت نے برسوں التجا میری

ماؔنی جائسی

○

نہ رہی وہ کششِ تیغِ ادا میرے بعد
جذب کھو بیٹھا ہے قاتل کا صلا میرے بعد

کیوں نہ بے رنگ ہو صحرائے بلا میرے بعد
کون کانٹوں پہ چلا برہنہ پا میرے بعد

کشتنی میں تھا سو مقتل میں تہ تیغ ہوا
اب رہو منتظرِ اہلِ وفا میرے بعد

صبحِ آخر مری صبحِ شبِ ہجراں تھی مگر
شمع و پروانہ میں بھی ربط نہ تھا میرے بعد

خلشِ پرسشِ محشر تھی مری بے گنہی
نظر آیا مرے قاتل کو خلا میرے بعد

رواؔں

(جگت موہن لال)

○

گلِ ویرانہ ہوں کوئی نہیں ہے قدرداں میرا
تو ہی دیکھ اے مرے خلاق حُسنِ رائیگاں میرا

ہوا اس کو اُڑا لے جائے یا اب پھونک دے بجلی
حفاظت کر نہیں سکتا مری جب آشیاں میرا

یہ کہہ کر رُوح نکلی ہے تنِ عاشق سے فرقت میں
مجھے عجلت ہے بڑھ جائے نہ آگے کارواں میرا

عناصر سنتے ہیں دُنیا کی وسعت مُسکراتی ہے
کسی سے پُوچھتے ہیں اہلِ بینش جب نشاں میرا

مرے بعد اور پھر کوئی نظر مجھ سا نہیں آتا
بہت دن تک کرینگے سوگ اہلِ خانداں میرا

رواؔں سچ ہے محبت کا اثر ضائع نہیں ہوتا
وہ رو دیتے ہیں اب بھی ذکر آتا ہے جہاں میرا

اطہر ہاپوڑی

وہ حُسنِ حیرت افزا اک نظر دیکھا نہیں جاتا
جدھر وہ جلوہ فرما ہیں اُدھر دیکھا نہیں جاتا

نظر سوزی غضب ہے اُس کے حُسنِ روز افزوں میں
بہت دیکھا ہے اس کو اب مگر دیکھا نہیں جاتا

نگاہیں جذب ہو جاتی ہیں اُس کے حُسنِ دلکش میں
کسی جانب پھر اس کو دیکھ کر دیکھا نہیں جاتا

کلیم اللہ سچ کہتے ہیں اُس کے حُسن کا جلوہ
وہ خود دکھلائے تو بھی اک نظر دیکھا نہیں جاتا

مرے ذوقِ نظر کی داد یوں دیتے ہیں وہ مجھکو
کہ اب دنیا میں یہ ذوقِ نظر دیکھا نہیں جاتا

یہ سب سوز و گدازِ شمع سے ہے گرمیِ محفل
کوئی پروانہ ہنگامِ سحر دیکھا نہیں جاتا

مرے غمخوار اطہر اٹھ گئے یہ کہہ کے بالیں سے
یہ بیتابی کا عالم رات بھر دیکھا نہیں جاتا

بیتاب عظیم آبادی

نہ میرے دل نے نہ ادراکِ نکتہ جُو نے کیا
خدا گواہ ہے جو کچھ کیا وہ تُو نے کیا

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بُو نے کیا
بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

کہیں کے رہتے نہ آوارگانِ دشتِ جفا
بڑا کرم کششِ زُلفِ مُشکبو نے کیا

بہار آئی تو کیا ناشگفتہ خاطر کو
فسردہ اَور بھی اس موسمِ نمو نے کیا

تمہاری چارہ گری کو سلام ہے میرا
کہ ایک زخم کو سو زخم اک رفو نے کیا

وہ کیونکر آ کے ملے خود یہ حال مجھ سے پوچھ
برآرِ مقصدِ دل ترکِ آرزو نے کیا

جز اپنے دل کے نہ پایا کسی نے ہم کا نشاں
ہزار عقل کو آوارہ جستجو نے کیا

بڑی امید بندھی بے بسوں کو محشر کی
عجب کرشمہ ترے طرزِ گفتگو نے کیا

کہوں گا یا رب میں صاف صاف حشر کے دن
کہ مجھ سے ہجر میں جو کچھ ہوا وہ تُو نے کیا

بجا رہے نہ مرے عقل و ہوش اے بیتاب
غضب کا مست مجھے پہلے ہی سبُو نے کیا

سیّد اختر علی تلہری

○

نجوم چرخ میں گلہائے گلستاں میں نہیں
مرے مذاق کے جلوے کہیں جہاں میں نہیں

تھکے تھکے سے قدم اُٹھ رہے ہیں جادے پر
وہ ذوقِ منزلِ محبوب کارواں میں نہیں

حدیثِ گردشِ دوراں ہے دل گداز مگر
فغاں کا ذکر کہیں میری داستاں میں نہیں

یہ مانا تو ہے شریعت پناہ اے واعظ
مگر حلاوتِ ایماں ترے بیاں میں نہیں

کہاں سے لاؤں لب و رُخ سے چھیڑ کے قصّے
ہوس کا باب محبت کی داستاں میں نہیں

اگر پرستشِ رسم و رواج ہے ایماں
تو پھر گناہ کوئی سجدۂ بتاں میں نہیں

بنا زمیں کو اپنا، زمیں کی مخلوق
تری نجات مہ و مہر و کہکشاں میں نہیں

حیرتؔ بدایونی

○

رکھتے ہو خیال اور ہی دیتے ہو بیاں اور
کیا بات ہے واللہ کہ دل اور زباں اور

طوفاں سے اگر جان بچا لی دل و جاں نے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہم ماضیِ بے رُوح کا ماتم نہیں کرتے
بُلوائیے باہر سے کوئی مرثیہ خواں اور

ہے پیرِ خرابات کا ہونا ہی اگر فرض
ہم خود ہی بنا لیں گے کوئی پیرِ مغاں اور

ہم پیر ہیں اور پختگیِ عمر میں حیرتؔ
ہو جاتے ہیں انسان کے افکار جواں اور

نشتر جالندھری

فضا ہے رقصاں کھلے ہیں تارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو
ابھی چلے آؤ گھر ہمارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

اِدھر تو آؤ کہ سازِ دل پر ترانہ مہر و وفا کا چھیڑیں
اسی تمنا میں دن گزارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

کسی نے میلی نظر سے دیکھا تمہیں تو غیرت سے کٹ مرے ہم
لگے اُبلنے لہو کے دھارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

تمہاری خاطر لپکتے شعلوں کو ہم نے بڑھ کر گلے لگایا
گل ان کو جانا جو تھے شرارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

تمہارے کہنے پہ زلف و قامت سمجھ کے دار و رسن کو چوما
عطیۂ خوں میں بھرے طرارے، کبھی ہمارا کہا بھی مانو

یہ کس کی تربت ہے آہ نشتر کہ اب تک آواز آ رہی ہے
ہمیں تو ہیں بے رُخی کے مارے کبھی ہمارا کہا بھی مانو

نجم آفندی

ہستی کوئی ایسی بھی ہے انساں کے سوا اور
مذہب کا خدا اور ہے مطلب کا خدا اور

پھر ٹھہر گیا قافلۂ درد سنا ہے
شاید کوئی رستے میں مری طرح گرا اور

اک جرعۂ آخر کی کمی رہ گئی آخر
جتنی وہ پلاتے گئے آنکھوں نے کہا اور

منبر سے بہت فصل ہے میدانِ عمل کا
تقریر کے مرد اور ہیں مردانِ وغا اور

لذت گلہ کر کے میں پچھتایا ہوں کیا کیا
جب ختم ہوئی بات کہیں اُس نے کہا اور

کیا زیرِ لب اے دوست ہے اظہارِ جسارت
حق ہو کہ وہ ناحق ہو ذرا لے تو بڑھا اور

دولت کا تو پہلے ہی گنہگار تھا منعم
دولت کی محبت نے گنہگار کیا اور

یہ وہم سا ہوتا ہے مجھے دیکھ کے ان کو
سیرت کا خدا اور ہے صورت کا خدا اور

مجنوں گورکھپوری

○

رہ جائیں فلک والے شورش سے نہ بیگانہ
ناہید کو تڑپا دے اے نعرۂ مستانہ

کچھ اور بھی جلوے ہیں کچھ اور بلا دے ہیں
لے تیرا خدا حافظ اے جلوۂ جانانہ

میخانے کی حرمت کا کچھ پاس بھی ہے لازم
لغزش ہیں قرینے سے اے لغزشِ مستانہ

آزادی کی دھومیں ہیں شہرے ہیں ترقی کے
ہر گام ہے پسپائی ہر وضع غلامانہ

اے عقل و خرد والو مجنوں کا گلہ کیسا
دیوانے کو کیا کہئے دیوانہ ہے دیوانہ

میکش اکبر آبادی

○

رات اس عقل کا عالم کیا کہوں
بات افسانہ تھی خاموشی فسوں

تجھ سے اپنی زندگی کے ماجرے
ٹھہر ہمدم سانس لے لوں تو کہوں

ہم نے لالے کی طرح اس دور میں
آنکھ کھولی تھی کہ دیکھا دل کا خوں

آپ کی میری کہانی ایک ہے
کہئے اب میں کیا سناؤں کیا سنوں

آپ کا انجان پن بھی ایک فن
اور میری عقل و دانش بھی جنوں

دیکھنا ہے تیرا یہ عالم مجھے
چاہے بہ نکلے مری آنکھوں سے خوں

ہے زمانہ اپنے غم میں مبتلا
کس سے میکش جا کے اپنا غم کہوں

بہزاد لکھنوی

عشق تیری راہ میں کیا وجود کیا عدم
دل جھکا نفس نفس سر جھکا قدم قدم

مقصدِ حیات ہے، مرکزِ ممات ہے
روئے یار رُخ بہ رُخ زلفِ یار خم بہ خم

آہ دل بلند ہو، اے خلش دوچند ہو
پھر سکون دے چلا اضطراب دم بدم

کچھ خرد سے کام لے کچھ جنوں سے کام لے
آ رہی ہیں منزلیں راہ میں قدم قدم

میں عجیب رند تھا ہوش سے نہ بچ سکا
بے خودی میں بھی رہا امتیازِ بیش و کم

جلیل قدوائی

مرا جنونِ محبت تو کوئی راز نہیں
ترے ہی پاس مگر چشمِ امتیاز نہیں

کچھ اور دن اسے رکھ آتشِ محبت پر
کہ تیرے شیشۂ دل میں ابھی گداز نہیں

سمجھ سکے تو سمجھ میری وجہِ خاموشی
بیانِ رازِ حقیقت میں ہے یہ راز نہیں

کرم کہوں اسے قدرت کا یا ستم سمجھوں
کہ دل دیا ہے مگر کوئی دل نواز نہیں

عطائے خاص ہے تیری مرا ذوقِ جنوں
عطا پہ ناز ہے مجھ کو جنوں پہ ناز نہیں

کوئی کسی سے یہ کہہ دے کہ میرا عشق جلیل
بہانہ ساز ہے لیکن زمانہ ساز نہیں

اثر صہبائی

گو سکوں کی جستجو بھی عمر بھر ہوتی رہی
دل کی دُنیا منتشر ہی منتشر ہوتی رہی

اہرمن کی بندگی ذکرِ خدا کے ساتھ ساتھ
ہر زمانے میں بہ اندازِ دگر ہوتی رہی

بارہا اُٹھتی رہیں ناکامیوں کی آندھیاں
آتشِ شوق و محبت تیز تر ہوتی رہی

تجھ سے مل کر پھر نہ برہم ہو سکا دل کا سکوں
محفلِ کون و مکاں زیر و زبر ہوتی رہی

کچھ عجب عالم رہا ہے دورِ الفت میں اثرؔ
رُوح پر اک بارشِ کیف و اثر ہوتی رہی

امین حزیں

درد سینے میں نہاں رہ کے اثر رکھتا ہے
ہمنشیں تمک سے بیاں حُسن کی بیداد نہ کر

پھونک دے نغمۂ جاں سوز سے سامانِ قفس
بلبلِ تفتہ جگر! شکوۂ صیاد نہ کر

لُطف جینے کا ہے جب ہی کہ ہو دل مستِ خودی
آسماں تک سے یہ کہہ دے "مری امداد نہ کر"

یاس میں پھوڑ کے سر مرتے ہیں کم ظرف امیںؔ
ظرف عالی ہے ترا بیعتِ فرہاد نہ کر

عبدالمجید بھٹی

○

اٹھے گرے چلمن، وہ نہاں ہوں کہ عیاں اور
آنکھوں میں نہ آئے گا نیا کوئی سماں اور

گلشن میں ہم رہ کے بھی ہیں اجنبی دونوں
پھولوں کی زباں اور ہے کانٹوں کی زباں اور

یہ ترش نگاہی بھی ہے اقرارِ محبت
کیوں اپنی جفا پر انہیں ہوتا ہے گماں اور

مغرور خداوندو! ڈرو صدق وفا سے
وہ وقت بھی آتا ہے کہ جھکتی ہے کماں اور

یارب ہے وفادار طلب اُن کی جفا سے
دے اور نہ دل ان کو نہ دے ہم کو زباں اور

وامق جونپوری

○

زباں تک جو نہ آئے وہ محبت اور ہوتی ہے
فسانہ اور ہوتا ہے، حقیقت اور ہوتی ہے

نہیں ملتے تو اک ادنیٰ شکایت ہے نہ ملنے کی
مگر مل کر نہ ملنے کی شکایت اور ہوتی ہے

یہ مانا شیشۂ دل رونقِ بازارِ اُلفت ہے
مگر جب ٹوٹ جاتا ہے تو قیمت اور ہوتی ہے

نگاہیں تاڑ لیتی ہیں محبت کی اداؤں کو
چھپانے سے زمانے بھر میں شہرت اور ہوتی ہے

یہ مانا حسن کی فطرت بہت نازک ہے اے وامق
مزاجِ عشق کی لیکن نزاکت اور ہوتی ہے

ن۔ م۔ راشد

پلا ساقیا مئے جاں پلا کہ میں ڈھونڈوں پھر خبرِ جنوں
یہ خرد کی رات چھٹے کہیں نظر آئے پھر سحرِ جنوں

غمِ عاشقی میں گرہ کشا نہ خرد ہوئی نہ جنوں ہوا
وہ ستم ہے کہ ہمیں رہا نہ پئے خرد نہ سرِ جنوں

وہی منزلیں وہی دشت و در ترے دل زدوں کے ہیں راہبر
وہی آرزو وہی جستجو وہی راہ پُر خطرِ جنوں

نہیں ہم عناں مرے مہر و مہ شب و روز میرے غبارِ راہ
کہ مقامِ وقت کے ماورا ہے محیطِ بال و پرِ جنوں

نہ ہمیں نظارے کا ہوش تھا کوئی جوش تھا نہ خروش تھا
مگر آپ ان کی نگاہ تھی سرِ راہ پردہ درِ جنوں

اسی ایک لمحے کے کارواں ہیں نکل کے آج رواں دواں
کھلا رہ گیا تھا الست میں کہیں ایک طاقِ درِ جنوں

نہ تو اس کے ہاتھ میں تھا قلم نہ تو واسطہ اسے سنگ سے
فقط ایک پارۂ سنگ ہے کمالِ نقش گرِ جنوں

ہے وہ مبتلائے غم و تعب مرے لئے وہ دعا بلب
مرے انتظار میں روز و شب ہے نگار خود نگرِ جنوں

تھا عجیب شب بے نوا وہ سرور دولتِ بے بہا
ہوا ہم پہ جب کھلے جنوں کی ہم پہ جب نظرِ جنوں

جمیل مظہری

جب خاک ہی ہونا تھا مجھ کو تو خاکِ رہِ صحرا ہوتا
اک کوشش پیہم تو ہوتی اٹھتا ہوتا گرتا ہوتا

موتی بننے سے کیا حاصل جب اپنی حقیقت ہی کھو دی
قطرے کے لیے بہتر تھا یہی قلزم بنتا دریا ہوتا

ہستی ہے جدائی سے قائم جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا سے اگر ہوتا نہ جدا قطرہ کیونکر قطرہ ہوتا

ق

اٹھو کہ بہت قیدیں تو نے فطرت کی پہنائی زنجیریں
جو زنجیریں خود پہنی ہیں اے کاش انہیں توڑا ہوتا

تخئیل غلط آزادی کی جب فطرت خود آزاد نہیں
آزاد اگر ہوتی فطرت تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟

پابند نہ ہوتی گر یہ زمیں سورج سے ٹکرا کر جل جاتی
پابند نہ گر ہوتیں موجیں ساحل کی جگہ دریا ہوتا

پابند نہ ہوتے گر تارے تو آپس ہی میں ٹکرا جاتے
سارا یہ طلسمِ ارض و سما اک پل میں ٹوٹ گیا ہوتا

پابند نہ ہوتی گر یہ ہوا چلتی اک ایسی تیز آندھی
ذرات میں اک ہلچل ہوتی شیرازۂ کل بکھرا ہوتا

گر نفیِ عمل مقصود ہے فلسفۂ اخلاق یہی
اے کاش حقیقت کو تو نے زنجیروں کی سمجھا ہوتا

آزادیِ مطلق لعنت ہے ہوتا جو سکوں آزادی میں
زنجیروں کا خلعت انساں نے خود شوق سے کیوں پہنا ہوتا

ہر بات جمیل زار کی ہے تدبیرِ بقا تعلیمِ عمل!
خاموش سہی خوددار سہی تم نے تو کبھی چھیڑا ہوتا

جاں نثار اختر

○

ہر سمت افق پہ ہیں دھند لکے
پیمانۂ صبح جلد چھلکے

آغازِ نوائے شوق جیسے
چھیڑے کوئی ساز ہلکے ہلکے

کچھ بھید کھلے مری نظر سے
کچھ راز تری ہنسی سے جھلکے

موتی تو نہ بن سکیں گے آنسو
دامن پہ ترے اگر نہ ڈھلکے

وہ رنگ رہا نہ روشنی میں
اس سے تو حسین تھے دھند لکے

یہ منتِ مہر و ماہ کب تک
گیتی سے کہو کہ آپ چمکے

اس شیشۂ آرزو سے اختر
کیا جانئے کتنے رنگ چھلکے

علی سردار جعفری

○

سکوں میسر جو ہو تو کیونکر، ہجومِ رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظامِ دار و رسن وہی ہے

لبوں پہ مہریں لگی ہوئی ہیں زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آدابِ محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

ابھی تو خاشاک کیلئے ہے ہزار طوفان کی ضرورت
اٹھی تھی جو پیچ و تاب کھاتی یہ موجِ گنگ و جمن وہی ہے

بلند محلوں کے بام و گنبد پہ چھوٹی کرنوں کو ناچنے دو
جو کالی کٹیاؤں کو اجالا عطا کرے گی کرن وہی ہے

کوئی یہ ایوانِ حکمرانی میں جا کے میری طرف سے کہدے
زبان چھینی ہے تم نے جس کی یہ شاعرِ نعرہ زن وہی ہے

مخمور جالندھری

یہی ہیں ان کے نگار خانے، یہی ہیں ان کے محل رفیقو
جو کتنی صدیوں سے اپنے دل کی جلن سے ہیں کسک رہے ہیں

انہیں گماں ہو چلا ہے ہم ابتدا سے پہچانتے ہیں ان کو
نگاہ کی اب ذرا سی اک چھیڑ ہی سے پردے سرک رہے ہیں

زمیں اگر ان کے بند کھولے پکارتی ہے یہیں ہے سب کچھ
ادھر نہ جھانکو کہ خلد و کوثر سبھی طلسمِ فلک رہے ہیں

اٹھو وہ مشرق سے ساغرِ آفتاب مخمور تم تک آیا
کرو نہ غم کیسے کیسے حالات شام سے صبح تک رہے ہیں

ڈاکٹر مسعود حسن

ابھی چمن میں کوئی فتنہ کار باقی ہے
بہار باقی ہے زخمِ بہار باقی ہے

یہ انتظار کی گھڑیاں کنارِ جوئے چشم
امید ڈوب چکی، اعتبار باقی ہے

عجب نہیں ہے کہ شبنم سے موت ہو جائے
گلوں کی تشنہ لبی بے شمار باقی ہے

رفو کی بات پہ وہ شوخ ہنس کے یوں بولا
ابھی تو جیب و گریباں میں تار باقی ہے

مری بہار کی آسودگی میں اے مسعود!
سنا ہے تو ہی فقط بے قرار باقی ہے

عظیم قریشی

○

رنگ کہاں ہے سایہ سا ہے
نقش کہاں ہے دھوکہ سا ہے

صبح کی رنگت زردی مائل!
شام نہیں ہے دھڑکا سا ہے

سیلِ عشق تھما کب ہوگا
دریا ہے اور چڑھتا سا ہے

حسن و عشق بڑے دو کافر
دونوں میں اک جھگڑا سا ہے

دل نے بدلا روپ ہو شاید
دُور پرے جو کُہرا سا ہے

آؤ پیار سے دھولیں اس کو
نقشِ جہاں کچھ میلا سا ہے

آج عظیم کو شاداں دیکھا
شاعر ہے پر کانٹا سا ہے

حامد عزیز مدنی

○

ہزار وقت کے پرتو نظر میں ہوتے ہیں
ہم ایک حلقۂ وحشت اثر میں ہوتے ہیں

کھلا یہ دل پہ کہ تعمیرِ بام و در ہے فریب
بگولے قالبِ دیوار و در میں ہوتے ہیں

وہی ہیں آج بھی اس جسمِ نازنیں میں فسوں
جو شاخِ گل میں، جو موجِ گہر میں ہوتے ہیں

طلسمِ خوابِ زلیخا و دامِ بردہ فروش
ہزار طرح کے قصے سفر میں ہوتے ہیں

گذر رہا ہے تو آنکھیں چُرا کے یُوں نہ گذر
غلط بیاں بھی بہت رہگذر میں ہوتے ہیں

سرشتِ گل ہی میں پنہاں ہیں سارے نقش و نگار
ہنر یہی تو کفِ کوزہ گر میں ہوتے ہیں

شورؔ علیگ

مرے دل کی دھڑک اس کے تبسم پر گراں کیوں ہو
میں افسانہ ہوں اُس کا وہ مرا افسانہ خواں کیوں ہو

مرے کام آ گئی آخر مری کاشانہ بردوشی
لپکتی بجلیوں کی زد پہ میرا آشیاں کیوں ہو

کناروں سے گذر جانا ہی طوفانوں کی فطرت ہے
جہاں دُنیا ٹھہر جائے قدم میرا وہاں کیوں ہو

ترا جلوہ بھی جب تیرا ہی پردہ ہوتا جاتا ہے
تو پھر میری نگاہوں پر نگاہوں کا گماں کیوں ہو

نہ میں وارفتۂ مطرب، نہ میں جاں دادۂ ساقی
اگر محفل سے اُٹھ جاؤں تو محفل بدگماں کیوں ہو

میں جس عالم میں ہوں اپنی جگہ اے شورؔ تنہا ہوں
جُدا ہو جس کی منزل وہ رہینِ کارواں کیوں ہو

صدقؔ جائسی

کیا کرے چشم غلط انداز بے تقصیر ہے
اے شہِ خوباں کماں بھاری ہے ہلکا تیر ہے

میرا منہ چھوٹا، بڑی باتوں میں کیونکر دخل دوں
سامنے تصویرِ یوسف کے تری تصویر ہے

میں بھی دل رکھتا ہوں کیا مجھ کو نہیں شوقِ حرم
خاکِ بُت خانے کی لیکن پاؤں کی زنجیر ہے

آنکھ کے اندر نگاہِ ناز ہے کتنی غریب
آنکھ سے باہر یہی چلتی ہوئی شمشیر ہے

صدقؔ سچ پوچھو تو پوجا حسن ہی کی ہے بجا
لب کشائی میں خدا کا خوف دامن گیر ہے

خمار بارہ بنکوی

ہجر کی رت غمگین فضائیں، اُف رے محبت ہائے جوانی
جینے کے دن مرنے کی دعائیں، اُف رے محبت ہائے جوانی

وعدہ کی شب خاموش فضائیں، دل میں خلش وہ آئیں نہ آئیں
در پہ نگاہیں لب پہ دعائیں، اُف رے محبت ہائے جوانی

بہکی ہوئی گلشن کی فضائیں، بہکی ہوئی ساون کی گھٹائیں
ہاتھ میں ساغر سر پہ گھٹائیں، اُف رے محبت ہائے جوانی

رخصتِ جاناں ایک قیامت اس پہ قیامت مجھ سے اجازت
آنکھ میں آنسو لب پہ دعائیں، اُف رے محبت ہائے جوانی

ہم تھے خمار اور پہلوئے جاناں بس میں تھی جیسے گردشِ دوراں
کاش وہ دن اب یاد نہ آئیں، اُف رے محبت ہائے جوانی

نشور واحدی

نظر نظر کو ساقیِ حیات کہتے آئے ہیں
ان انکھڑیوں کو میکدہ کی رات کہتے آئے ہیں

فریبِ شوق کو تخیلات کہتے آئے ہیں
بکھر گئے تو گیسوؤں کو رات کہتے آئے ہیں

اسی کو زندگی کا ساز دے کے مطمئن ہوں میں
وہ حسن جس کو حسنِ بے ثبات کہتے آئے ہیں

یہ مخلصانِ عشق بھی عجب ادا پرست ہیں
وہ مسکرا دیے تو التفات کہتے آئے ہیں

ہنسی بجا نہیں تری یہ وعظِ ترکِ عشق پر
یہ بے خبر بھی حوصلے کی بات کہتے آئے ہیں

حیات تا ممات ایک سلسلہ ہے عشق کا
کہاں ہیں وہ جو مرگ کو نجات کہتے آئے ہیں

یہ نوجواں تو زندگی کو زندگی نہ کہہ سکے
جوانیوں میں موت کو حیات کہتے آئے ہیں

وہ ظرفِ مے جسے نہ زہر کی نظر بجھ سکی
ہم اس کو شیشۂ تجلیات کہتے آئے ہیں

غزل ہے نام حسن کے معاملاتِ خام کا
خطا ہوئی کہ دلبروں کی بات کہتے آئے ہیں

یکرنگ

(مصطفےٰ اتقی خاں)

لبِ شیریں سے تلخ کاموں کو
بولنا تلخ کام ہے تیرا

ہاتھ اُٹھا جور اور جفا سے تُو
یہی گویا سلام ہے تیرا

اگر آوے مرے گھر وہ پیارا
کروں اس ماہ کو پُتلی کا تارا

مرا دشمن ہوا یکرنگ وہ شوخ
کیا کیوں عشق میں نے آشکارا

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے
میرا صبر و قرار جاتا ہے

گر خبر یعنی ہو تو اے صیاد
ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

کلیم

محمد حسین

ہر تار پیچ زُلف کا، عالم کی جان ہے
گویا یہ اژدھا تھا کہ سب کو نگل گیا

نقاب اپنے رُخ کا جو تو باز کرتا
تو گُل اپنی خوبی پہ کیا ناز کرتا

لگتی ہے اب تو تعلق مینا سے دل کو ٹھیس
وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

قبر میں بھی لئے ہمراہ گیا اپنے کلیم
آہ کیوں دردِ دل اپنا نہ کسی کو سونپا

پیری کی بھی سیر کر گئے ہم
اس پل سے بھی بس گزر گئے ہم

واں غصے ہوئے رقیب برہم
یاں مارے ادب کے مر گئے ہم

مُحسنؔ

محمد محسن

دل مرا وابستۂ ہر تارِ زلفِ یار ہے
ہے تو دیوانہ پر اپنے کام میں ہشیار ہے

اور یہ عاجز تمہارا کچھ نہیں رکھتا، مگر
جان بلب آمدہ، حاضر ہے گر درکار ہے

کیا جانئے وہ شوخ کدھر ہے کدھر نہیں
مجھ کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں

جس دن تری گلی سے میں عزمِ سفر کیا
ہر یک قدم پہ راہ میں پتھر جگر کیا

محسنؔ مروں نہ میں تو بھلا جی کے کیا کروں
اک دل بساط میں تھا سو میں وہ بھی کھو چکا

ممتازؔ

حافظ فضلو

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

ڈروں ہوں کس لئے رنجش سے، پیار میں کیا تھا
میں اب خزاں کو جو روؤں، بہار میں کیا تھا

جفائے یار نے کس طرح کر دیا مایوس
اور ان کی خاطر امیدوار میں کیا تھا

ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک
وگرنہ ہستیِ ناپائیدار میں کیا تھا

کیونکہ سرسبز ہو شاہی و گدائی کی ہوس
رہ گئی آہ مرے دل میں خدائی کی ہوس

بال و پر توڑ کے جب تو نے قفس کو سونپا
وہیں آخر ہوئی صیاد رہائی کی ہوس

گذرا کبھی شاید کہ وہ بے باک چمن میں
آتا ہے نظر جامۂ گل چاک چمن میں

مجذوب

مرزا غلام حیدر

○

عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں
بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں

تمہارا ہم سے جو عہدِ وفا ہے اس کو تم جانو
مرا پیمان کچھ نوعِ دگر ہووے تو میں جانوں

نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی
تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں

آوے بھی مسیحا مری بالیں پہ تو کیا ہو
بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو

مجذوب ترے عجز و تکبر سے ہوں نالاں
بندہ کبھی ہو بیٹھتے ہو، گاہ خدا ہو

ماہر

فخرالدین خاں

○

چشم اس سے ترحم کی نہ رکھ رو رو کے ماہر
کب پہنچے ہے وہ دیدۂ خوں بار کسو کا

جو اس کے در پہ بیٹھے ہیں، سمجھتے ہیں وہ در کس کا
ہوئے جو اس کے آوارہ وہ کہتے ہیں کہ گھر کس کا

میں تو مانوں ترا سخن ناصح
پر نہیں دل پہ اختیار اپنا

مدت ہوئی کہ دل کی مجھ تک خبر نہ پہنچی
ملتا نہیں نشاں کچھ اس بے نشاں سے مجھکو

تو تو کب اعتبار مانے ہے
جس پہ گذرے ہے سو ہی جانے ہے

کوئی نہ بھلا کام ہوا عمر میں ہم سے
امید ہے بخشش کی مگر تیرے کرم سے

غضنفر

غضنفر علی خاں

○

جاتے ہیں وہاں سے گر کہیں ہم
ہر پھر کے پھر آئے ہیں وہیں ہم

صد حیف کہ کنجِ بیکسی میں
کوئی نہیں اور ہیں ہمیں ہم

خاموشی کی مُہر ہے دہن پر
ہیں حلقۂ غم میں جُوں نگیں ہم

آیا نہ وُہ شوخ اور گئے آہ!
حسرت ہی بھرے تہِ زمیں ہم

تکتے رہے جانبِ دراے والے
مُڑ مُڑ کے بوقتِ واپسیں ہم

قسمت میں تو ہجر ہے غضنفر
اب وُہ ہے تو آپ میں نہیں ہم

نصرت

○

بن ترے آئے پریشاں ہیں سبھی سامانِ عیش
مے کہیں، مطرب کہیں، ساقی کہیں، ساغر کہیں

کاروانِ عشق سے بچھڑا ہیں اب جاؤں کدھر
گم صدائے زنگ ہے اور چل بسے رہبر کہیں

جس کو غمِ عشقِ گُل رخاں ہو
کب اس کو ہوائے بوستاں ہو

وہ دوست جو مہرباں ہو کیا غم
گو دشمنِ جاں مرا جہاں ہو

طبیبوں نے جو دیکھا نبض کو میری تو یہ بولے
یہ جاوے گا تمہارے جی کے ساتھ آزار دیکھو گے

نہ دوگے شربتِ دیدار گر بیمار کو اپنے
تو جی دے گا تمہارا طالبِ دیدار دیکھو گے

سحر

شیخ امان علی

آسماں کو غبار ہے ہم سے
ایک دن خاک میں ملا دے گا

اس کے دینے کے ہیں ہزاروں ہاتھ
وہی دیتا ہے کوئی کیا دے گا

مے کدے سے اٹھا ہے ابر بہار
میرے دل کی لگی بجھا دے گا

اپنے مٹنے کا غم نہیں ہم کو
جو بگاڑے گا وہ بنا دے گا

اس کوچے میں بیٹھے تھے کہ بس مر کے اٹھیں گے
اب لاش پڑی ہے وہیں، مُردا نہیں اُٹھتا

چشم مے گوں نے اُنہیں نادم کیا
محتسب دوڑے شرابی جان کر

تعشق

سید مرزا

باغ میں پھولوں کو روند آئی سواری آپ کی
کس قدر ممنون ہے بادِ بہاری آپ کی

بے وفائی آپ کی غفلت شعاری آپ کی
میرے دل نے عادتیں سیکھی ہیں ساری آپ کی

میکدے میں ٹوٹے جاتے ہیں ہم لڑ لڑ کے جام
مفسدہ پرداز ہے چشمِ خماری آپ کی

آج کس پر رحم آیا کس پہ روتے ہیں حضور
ہے نصیبِ دشمناں آواز بھاری آپ کی

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا
کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

مرا پیام صبا میرے گُل سے کہہ دینا
چلی گئی مجھے بے ہوش کر کے بُو تیری

تمام رات رہا دل سے ذکرِ خیر ترا
گلہ کیا ہو تو شاہد ہے آرزو تیری

ذکی

مہدی علی خاں

○

قاصد کے ہوش گم تھے یہ طرفہ ماجرا تھا
کہتا تھا کچھ زبانی اور خط میں کچھ لکھا تھا

شکلِ حباب کیا کیا آنکھوں سے رنگ دیکھے
کیا چشمِ تر کا ساغر جامِ جہاں نما تھا

اک بات پر تمہارے سو جی سے ہم تھے قرباں
کچھ بات اب نہ پوچھو کیا جانئے وہ کیا تھا

آئی صبیح رنگ پہ سرخی شراب کی
مہتاب پر شبیہ کھنچی آفتاب کی

جوہر تو مجھ میں تھے ملکوتی صفات کے
انساں بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی

کس زندگی پہ کیجئے سامانِ بزمِ عیش
مہمان چار دن ہیں بہاریں شباب کی

قبول

مرزا مہدی علی خاں

○

یہ عشق ایسا نہیں جس کی حرارت دور ہو دل سے
رہیں گے زندہ جب تک ہم نہ اترے گا بخار اپنا

غرورِ حسن سے پھر کر نظر کرتا نہیں ظالم
پریشاں توسنِ جاناں کے پیچھے ہے غبار اپنا

ملے سب دوست دشمن اپنے، بوئے انس سے خالی
نہ گل اپنا ہوا گلزارِ عالم میں نہ خار اپنا

خزاں ہمیشہ ہے جامہ سے گل نہ باہر ہوں
اگر بہار کی دو دن ہوا ہوئی تو کیا

نہ کچھ جواب ملے گا، نہ تو پھرے گی ادھر
جو تجھ سے نامہ بری اے صبا ہوئی تو کیا

لحد میں جان سے ملنے کو جسم تڑپے گا
جو روح قیدِ بدن سے رہا ہوئی تو کیا

جسم ہلکا جو ہوا روح نے قوت پائی
عشق میں ترکِ غذا سے مری طاقت نہ گئی

سحرؔ

(راجہ) نواب علی خاں

دل ترے زلفِ مسلسل کا گرفتار ہوا
سلسلہ مل گیا زنجیر سے سودائی کا

شانہ و آئینہ اب ہاتھ سے چھٹتا ہی نہیں
خود نمائی سے بڑھا شوق خود آرائی کا

حشر کرتا ہے یہ کہنا آپ کا بالائے بام
لو سوا نیزے پہ سورج آشکارا ہو گیا

وائے ناکامی تب آیا ساقیِ پیماں شکن
جب ہماری عمر کا لبریز ساغر ہو گیا

قفس میں نالوں سے مطلب ہے یہ اسیروں کا
بہار میں نہ چھٹے ساتھ ہم صفیروں کا

بہار ہے ترے کوچے کی اس قدر دلکش
کہ پاؤں اٹھ نہیں سکتا ہے راہ گیروں کا

آبادؔ

مرزا مہدی حسن خاں

زمیں کو آسماں تیرے تصور نے بنایا ہے
بلا ہے مرتبہ دل کو ہمارے عرشِ اعظم کا

اسی حسرت میں آنکھوں سے انہیں ہر دم بہاتا ہوں
کوئی تو لختِ دل میرا نگیں ہو تیرے خاتم کا

جا کے ہو آتا ہے ہر دم یار تک پیکِ خیال
میں نہیں محتاج اب بہرِ خبر جاسوس کا

اب چھپانے سے ہمارے عیب چھپنے کے نہیں
سو جگہ سے چاک پردہ ہو گیا ناموس کا

تیس دن میں ایک دن دیکھا نہ روئے رشکِ ماہ
میں نے منہ اس چاند میں دیکھا تھا کس منحوس کا

آتا ہے جی میں چیر کے پہلو کو ایک دن
دکھلا دوں اس کو حالِ دلِ بے قرار کا

دل میں کبھی نہ گرد کدورت کو راہ دے
اس آئینہ میں کام نہیں ہے غبار کا

آہ

مرزا عنایت علی بیگ

برباد میری خاک نہ کر کوئے یار سے
اس سرزمیں سے مجھ کو نہ اے آسماں اُٹھا

کس روز رُوبرو مرے آئے وُہ بے نقاب
آنکھوں کے سامنے سے یہ پردہ کہاں اُٹھا

کیا سُوجھی ہم کو مشقِ تصور سے دُور کی
آنکھوں کے آگے پھر گئی صورت حضور کی

تم سے پری کی شکل ہے اچھی نہ حُور کی
دل دے رہا ہے مجھ کو خبر دُور دُور کی

اچھا ہُوا حرم سے نکالے گئے صنم
صورت یہی تھی شانِ خدا کے ظہور کی

تم سا حسیں زمانہ میں اب دُوسرا نہیں
اعضا ہیں سب بشر کے تو صورت ہے حُور کی

حاصل ہُوا ہے خواب میں مجھ کو وصالِ یار
یُوسف کو ڈھونڈتا ہُوں میں تعبیر کے لیے

خلیل

دوست علی

تھی کس کو صنم آپ کے آنے کی توقع
آنا مرے گھر میں ہے خدا ساز تمہارا

یاں داغ ہے واں آپ کا آئینہ مصاحب
دل سوز یہ میرا ہے وہ دمساز تمہارا

مرتا ہوں خبر لو مری اے رشکِ مسیحا
کیا حشر کو کام آئے گا اعجاز تمہارا

دیکھیں نہ تجھے صبح و مسا ہم سے نہ ہوگا
یہ اے بُتِ کافر بہ خدا ہم سے نہ ہوگا

ترجیح عبث دیتے ہو فرہاد کو ہم پر
سر پھوڑ کے مرجائیں یہ کیا ہم سے نہ ہوگا

مجرم ہیں گنہگار ہیں شرمندہ ہیں دل میں
مُنہ اس کی طرف وقتِ دُعا ہم سے نہ ہوگا

تعریفِ بُتاں کیجیے کیا حد سے زیادہ
کہہ دیجیے بندے کو خدا ہم سے نہ ہوگا!

منتہی

مرزا مہتاب بیگ

اشک کو تاثیر دی اچھا کیا
قطرۂ ناچیز کو دریا کیا

شربتِ وصلت پلایا یار نے
ہجر کے بیمار کو اچھا کیا

دستخطی دکھلاؤں گا فردِ جبیں
حشر میں پوچھا جو مجھ سے کیا کیا

تاثیرِ عشق گبر و مسلماں پہ کر گیا
ساقی شرابِ ناب سے دو جام بھر گیا

اچھا ہوا شباب کا عالم گذر گیا
اک جن چڑھا ہوا تھا جو سر سے اتر گیا

اس کا بندِ نقاب وا تو نہیں
درِ باغِ ارم کھلا تو نہیں

سر بھی حاضر ہے جانِ عاشق بھی
اور صاحب کا ادعا تو نہیں

اعظم

مرزا اعظم علی

ساقی نے دیا جام مئے بے خبری کا
اب ہوش ہے شیشے کا نہ شیشے کی پری کا

ہر ظلم رسیدہ ہے ترے جور سے راضی
شکوہ نہیں کرتا کوئی بیدادگری کا

لیلیٰ کو کھولنے دو ذرا گیسوئے دراز
مجنوں کے بند بند میں زنجیر دیکھنا

آنکھوں کی آرزو یہ ذرا کھینچئے نگاہ
یہ چاہتی ہیں آپ کی تصویر دیکھنا

کوئی محمل میں نہیں ہے، پسِ پردہ ہم ہیں
برملا قیس کو دعویٰ ہے کہ لیلیٰ ہم ہیں

اس لئے چپ ہیں کہ کوئی نہیں سننے والا
ورنہ کہنے کو سراپا لبِ گویا ہم ہیں

سوانگ لاتے ہیں نئے رنگ بدلتے ہیں نئے
یہ طلسمی ہے جہاں اس میں تماشا ہم ہیں

شرف

سید سادات حسین

ٹپک ٹپک کے کہیں گُل بنا، کہیں لالہ
چمن میں رنگ نہ لایا مرا لہو کیا کیا

زباں جو اُن کی شرف نشے میں بہکتی ہے
مزے مزے کی وہ کرتے ہیں گفتگو کیا کیا

قریبِ مرگ ہُوں للّٰہ آئینہ رکھدو
گلے سے میرے لپٹ جاؤ پھر نکھر لینا

دُعا کو ہاتھ میں اس شرط سے اُٹھاتا ہُوں
کروں جو عرض تو اُس کو قبول کر لینا

مجنوں نے میرا داغِ جگر سر پہ رکھ لیا
یہ گل وہ ہے جو طرۂ دستار ہی رہا

تو رہ گیا فقط ترے سودائی رہ گئے
یوسف رہے نہ مصر کا بازار ہی رہا

زلف اُلجھے گی تو شانہ سے سُلجھ جائے گی
دل جب اُلجھے گا تو کوئی نہیں سلجھانے کا

اسد

نواب سلیمان خاں

کُچھ بھی نہ تھے، سب کچھ ہوئے، پھر کچھ بھی نہ ہونگے
آغاز وہ ہے، اور یہ انجام ہمارا

مجھ کو وقفہ تہِ شمشیرِ اجل نے نہ دیا
دو گھڑی دل مرے قاتل کا بہلنے نہ دیا

ہم کو سمجھاتے ہیں یہ ہمدم کیا
دل ہی بس میں نہیں کریں ہم کیا

دل اپنا تم کو دے کے مفت ہم بھی بن گئے بندے
کہو، جو کچھ تو آئے تمہارے دین و ایماں میں

دلِ گبر و مومن میں تیری جگہ ہے
صنم ہے کسی کا، خدا ہے کسی کا

یہ معشوقانِ بے پروا جہاں میں کس کے ہوتے ہیں
انہیں دل دے کے عاشق آپ اپنی جان کھوتے ہیں

برسوں سجدے کئے کعبہ میں تمہاری خاطر
مدتوں دیر میں جا جا کے جبیں سائی کی

واسطی

سید فضل رسول خاں سندیلوی

حائل ہے زیست، وصل ہو اس جانِ جاں سے کیا
پردہ بغیر مرگ اُٹھے درمیاں سے کیا

آزاد مثلِ سرو ہیں باغِ جہاں میں ہم
نفع و ضرر ہے ہم کو بہار و خزاں سے کیا

پچھتا رہا ہوں کر کے کبوتر کو نامہ بر
نامہ تو لے چلا ہے کہیگا زباں سے کیا

ایسا خیالِ یار نے بے ہوش کر دیا
کچھ اپنی یاد ہے نہ مجھے اب کسی کی یاد

کاٹی تمام عمر غمِ ہجرِ یار میں
مرنے کے بعد خاک کروں زندگی کی یاد

رُسوا کیا، خراب کیا، دربدر کیا
یادش بخیر، کیا کہوں دل کی بدی کی یاد

ادا حقِ بندگی کا بھی کسی سے ہو نہیں سکتا
بڑے نافہم ہیں کرتے ہیں جو دعویٰ خدائی کا

جوش

نواب احمد حسن خان

سچ کہتے ہیں کہ نام محبت کا ہے بُرا
اُلفت جتا کے دوست کو دشمن بنا لیا

دامنِ حضرتِ یوسف کے اُڑ جائے پرزے
پاسِ عصمت ہے تجھے اس وقت زلیخا نہ ہوا

حسرتیں مُردہ دلوں کی کبھی زندہ نہ ہوئیں
نام رکھا ہے عبث تم نے مسیحا اپنا

خضر گم گردہ راہ ہیں اے جوش
چاہیے راستہ بتا دینا

تجھ جاں بلب کے پاس سے جاتے ہو گھر کہاں
پھر تم کہاں، یہ عاشقِ خستہ جگر کہاں

کہتے ہو کیا حضور کہ آئیں گے وقتِ صبح
اس شب کو خاتمہ ہے ہمارا، سحر کہاں

ان آنکھوں کی بدولت دل پہ آفت آ ہی جاتی ہے
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے

جنوں

نواب سراج الدولہ سراج جنگ علی محمد خاں

○

نہ دوا تھا مرضِ عشق دوا کیا کرتا
التجا کرکے طبیبوں سے بھلا کیا کرتا

زندگی ہجر میں تھی موت سے بدتر میری
اپنے جینے کی خدا سے میں دعا کیا کرتا

چند دن جی کے فقط فرض ادا کرنا تھا
تیرا بیمار جو کرتا نہ قضا کیا کرتا

نہیں زیبا، شکایت کیا کریں ہم خوش جمالوں کی
جفا ہوتی ہیں سب خصلتیں ان بے مثالوں کی

گرایا دیدۂ مردم سے ہم کو چشمِ گریاں نے
دکھائی زردیِ رخسار نے صورت ملالوں کی

درِ جاناں تلک موقع نہیں ملتا رسائی کا
ہمارا قصد ہے مدت سے قسمت آزمائی کا

جہاں میں چار سو شہرہ ہے جس کی بیوفائی کا
اسے دل دے کے کیوں الزام لوں ساری خدائی کا

ہوش

نواب نیاز احمد خاں

○

باغباں تو دشمنِ بلبل ہے اے خارِ چمن
تو بڑھا کر ہاتھ گلچیں کا گریباں گیر ہو

تب ہو لطفِ قید جب ڈالو گلے میں ہاتھ تم
طوق گردن میں پڑا ہو ہاتھ میں زنجیر ہو

زیست میں کیا پوچھتے ہو ہم سے حالِ بعدِ مرگ
خواب سے پہلے بیاں کیا خواب کی تعبیر ہو

ابھی تو عالمِ وحشت میں چاک کر دیتا
جو میرے ہاتھ میں دامانِ آرزو ہوتا

سمجھتے شیخ کو ہم رازدار تب تیرا
کہ لب پہ ذکرِ بتاں اور دل میں تو ہوتا

قطرۂ اشک ہوں دکھلائیے مجھ کو جلوہ
شجرِ طور نہیں ہوں جو میں جل جاؤں گا

گرم کیوں ہوتے ہو محفل میں مجھے دیکھ کے تم
شمع ساں خود ہی سحر تک میں پگھل جاؤں گا

ریحاںؔ

دیا کرشن

تہمت ہے تیغِ تیز پہ غمزہ پہ اتہام
قاتل میں کشتہ ہوں تری ترچھی نگاہ کا

عقدہ کھلتا ہی نہیں تقدیر کا
گھس گیا ناخن مری تدبیر کا

نوکِ مژگاں کی خطا اس میں نہیں
خود بنا عاشق نشانہ تیر کا

تیرے لب کو نبات کہتے ہیں
ہم بھی کیا میٹھی بات کہتے ہیں

خواہ ثابت ہوں خواہ سیارے
سب کو ہم بے ثبات کہتے ہیں

دل رنجیدہ کہتا ہے نہ بولوں یار سے لیکن
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروت آ ہی جاتی ہے

چھپائے سے نہیں چھپتا ہے ریحاں نشۂ الفت
ضرور آنکھوں میں کچھ اس مے کی رنگت آ ہی جاتی ہے

مخمورؔ

محمد جعفر لکھنوی

ترے چمن کی روش باغباں نہیں معلوم
اسیرِ تازہ ہوں طرزِ فغاں نہیں معلوم

کیا ہے شرمِ محبت نے ایسا پوشیدہ
کہ مجھ کو بھی مرا رازِ نہاں نہیں معلوم

یاروں سے میں گو جدا رہا ہوں
پر دل سے تو آشنا رہا ہوں

گلشن اک مدرسہ ہے میرا
بلبل کو سبق پڑھا رہا ہوں میں

غم ہو تو امید رکھ خوشی کی
رونا بھی دلیل ہے ہنسی کی

ہر ایک نفس کی آمد و شد
دیتی ہے خبر رواروی کی

عیشیؔ

طالب علی خاں لکھنوی

○

جلا دے طُور او سوزِ نہانی
اُٹھائے کون نازِ لن ترانی

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہتِ گُل
نسیمِ صبح تیری مہربانی

شرابِ صاف کا دے جام ساقی
مکدر ہے زلالِ زندگانی

نہ پیری میں ستا اے غضبِ عشق
اُٹھائی تھی ترے صدمے جوانی

کیا خاکِ درِ مے خانہ مجھ کو
جزاک اللہ دورِ آسمانی

شبِ غم میں مُوا جل جل کے عیشیؔ
سُنا ہے شمعِ محفل کی زبانی

غافلؔ

منور خاں

○

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

دوستی کا بھی تجھے پاس نہ آیا ہے ہے
تو نے دُشمن سے کیا میرا گلہ میرے بعد

گرم بازاریٔ اُلفت ہے مُجھی سے ورنہ
کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

مُنہ پہ لے دامنِ گُل روئیں گے مرغانِ چمن
باغ میں خاک اُڑائے گی صبا میرے بعد

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

مسرور کاکوروی

شیخ میر بخش

○

دن وصل کے، رنجِ شبِ غم بھول گئے ہیں
یہ خوش ہیں کہ اپنے تئیں ہم بھول گئے ہیں

جس دن سے گئے اپنی خبر تک نہیں بھیجی
شاید ہمیں یارانِ عدم بھول گئے ہیں

یا راحت و رنج اب ہے مساوات ہمیں کو
یا آپ ہی کچھ طرزِ ستم بھول گئے ہیں

کچھ ہوش ٹھکانے ہوں تو لیں نام کسی کا
ہم دے کے کہیں دل کی رقم بھول گئے ہیں

تو مجھ سے دشمنی بھی فلک اس قدر نہ کر
کس نے کہا ہے ہجر کی شب کو سحر نہ کر

مرنے کو زندگی تو سمجھ دردِ عشق میں
مسرور اپنی جان کا ہرگز خطر نہ کر

اختر

محمد صادق خان

○

عجب ڈھب کی یہ تعمیرِ خراب آباد ہستی ہے
کہ پستی یاں بلندی ہے، بلندی یاں کی پستی ہے

تردد کیوں تمہیں اے ساکنانِ ملکِ ہستی ہے
عدم کی راہ سیدھی ہے بلندی ہے نہ پستی ہے

وصال اس کا عوض مرنے کے گر ٹھہرے غنیمت ہے
متاعِ وصلِ جاناں، جان دینے پر بھی سستی ہے

حصولِ جاہ کی تدبیر جو ہم لوگ کرتے ہیں
ہماری سعیِ باطل دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے

سمجھ ہر ایک کو ہشیار ہم آئے تھے یاں اختر
بچشمِ غور جو دیکھا تو متوالوں کی بستی ہے

صاحب و شفیق

لچھمی نرائن

○

شمع پر پروانہ جل کر راکھ ہو
عاشقی کا نام روشن کر گیا

بہار آئی جنوں نے سر اُٹھایا ہے خدا حافظ
نسیمِ صبح نے دل کو ستایا ہے خدا حافظ

مرا دل لینے ہی تک آشنا تھا
تری آنکھیں پھرانے کے تلک تھیں

میں اپنے دردِ دل کہنے کے صدقے
ترے حُسنِ سُخن کے چُپ رہنے کے صدقے

مت کوئی روشن کرو تربت پہ مجنوں کی چراغ
رُوح جل جاوے گی دیوانے کی پروانے کے ساتھ

کیا ہوا ہے کس طرح کا ابر ہے
جس کو دل چاہے نہ ہو کیا جبر ہے

جوشش

شیخ محمد روشن

○

نہ پھولتے ہیں شگوفے نہ غنچے کھلتے ہیں
چمن میں شور پڑا کس کے مسکرانے کا

قیس پھرتا جو رہا دشت میں، دیوانہ تھا
اس کو لیلیٰ ہی کے دروازے پہ مر جانا تھا

کل بزم میں سب پر نگہِ لُطف و کرم تھی
اک میری طرف تُو نے ستمگار نہ دیکھا
جُز چشمِ بتاں میکدۂ دہر میں جوشش
ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

نگاہِ لُطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے
سلام اُس نے ہمارا لیا لیا نہ لیا

بیتاب

سنتوکھ رائے

نہ رہے باغِ جہاں میں کبھو آرام سے ہم
پھنس گئے قیدِ قفس میں جو چھٹے دام سے ہم

اپنے مذہب میں ہے اک شرطِ طریقِ اخلاص
کچھ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے ہم

بت کی بھی کچھ ہوتی نہیں کیا ہم نشیں آہیں
رخوباں یوں ہیں دکھ دیں ہم ان کو اس طرح چاہیں

مدت سے انتظار میں اپنی کٹتی ہے یاں
اب تک جو ہم نہ آئے الٰہی کہاں رہے

عشق [illegible] گا ہے عسل گو نیش ہے
نت نیا یاں ماجرا درپیش ہے

خدا کسی کو گرفتارِ زلف کا نہ کرے
نصیب میں کسی کافر کے یہ بلا نہ کرے

گرفتار

نگی بیگ

ساقی یہ غنیمت ہے جو دم جام کے گذرے
اس عالمِ فانی میں بھروسا نہیں دم کا

جستجو دنیا میں مت کر اے گرفتار اس قدر
کیا بھروسا ہے جہاں میں عمرِ بے بنیاد کا

خانہ خراب عشق کا ہو اور کیا کہوں
خوابِ عدم سے سوتوں کو ناحق جگا دیا

لطف سے تیرے تو کچھ اور نہیں پر ہم کو
ناتوانی سے ہے ہر ایک قدم پر منزل

شکایت ترے جور کی کیا کریں ہم
خدا جو دکھاتا ہے ہم دیکھتے ہیں

جگر جل گیا آتشِ غم سے اپنا
تعجب ہے آنکھوں کو نم دیکھتے ہیں

حسنؔ

خواجہ حسن

○

یہی سوزشِ عشق ہے تو الٰہی
اس آغاز کا کیونکہ انجام ہوگا

رہی بے قراری اسیروں کی یوں ہی
تو صیاد! ٹکڑے ترا دام ہوگا

موئے ہم تو پر بے قراری وہی ہے
خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا!

اگر نزع ہے جان بخشی کو آئے
تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی
حسنؔ اس نے احساں دوبارہ کیا

اُمنڈ کے آنکھ سے اک بار بہ چلے آنسو
ہنسی ہنسی میں جو ذکرِ وداعِ یار ہوا

وہ جب تلک کہ زلفیں سنوارا کیا
کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا

خاموشؔ

شاہ معین الدین

○

شکل انساں میں خدا تھا مجھے معلوم نہ تھا
حق سے ناحق میں جدا تھا مجھے معلوم نہ تھا

ایک مدت حرم و دیر کو ڈھونڈا ناحق
یم بہ بر میں چھپا تھا، مجھے معلوم نہ تھا

ہو کے خاموشؔ عجب سیر و تماشا دیکھا
رنگ بے رنگ ہوا تھا، مجھے معلوم نہ تھا

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا
عاشقاں آپ بھلے اپنا دل آرام بھلا

آشیاں اپنا گلستاں سے اُٹھا لے بلبل
باغ کو چھوڑ دے، جنگل کی ہوا لے بلبل

چہچہے کرتی ہے کیا؟ اس سے نہیں کچھ حاصل
مثلِ پروانہ پر و بال جلا لے بلبل

چڑھا ہے سُولی پہ خاموشؔ ہو کے جب منصور
سوائے حق نظر آئی نہ دار آنکھوں میں

فیض

میر شمس الدین

○

حرم میں، دیر میں جب کوئی رُوبرو آیا
مجھے یقین ہوا بس یہی کہ تُو آیا

اُڑائیں جیب کی لاکھوں ہی دھجیاں میں نے
مگر نہ قبضے میں دامانِ آرزو آیا

کسی کا کوئی بھی ممنون نہیں ہے کر انصاف
اِدھر سے میں نکل آیا اُدھر سے تُو آیا

خطِ جادہ ہوں یا میں نقشِ پا ہوں
غرض، افتادگاں کا رونما ہوں

عبث رکھتے ہیں مجھ پر تہمتِ مرگ
بہت راتوں جگا تھا، سو رہا ہوں

ذکر! اس چشم کا پھر مجھ کو بیمار
ابھی اے فیضؔ مر مر کے جیا ہوں

نہیں فرق کچھ دیر میں اور حرم میں
جو بُت چاہتے ہیں خدا چاہتا ہے

راقم

بندرابن

○

نامہ کا میرے اُس سے لے کر جواب پھرنا
پر واسطے خدا کے قاصد! شتاب پھرنا

اک وے بھی دن تھے یارب! جو تھا ہمیں میسّر
گلشن میں ساتھ اُس کے پیتے شراب پھرنا

کہے کیا دردِ دل بُلبل گلوں سے
اُڑا دیتے ہیں اُس کی بات ہنس کر

جو چاہے گوہرِ مقصود اے دل
صدف کی طرح تُو پاسِ نفس کر

مژگاں سے دل بچے تو، ٹکڑے کرے ہے ابرو
یہ کہہ کے میں نے اُس سے جب دل کی داد چاہی

کہنے لگا کہ، ترکش جس وقت ہووے خالی
تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

وفاؔ

نول رائے

○

عارض پہ تمہارے یہ پسینا
ہیرے کا ہے، لعل پر نگینا

اس غم میں بھی گر رہا سلامت
پتھر سے بھی سخت ہے یہ سینا

اس کو منظور یاں سے جانا تھا
گریہ میرا فقط بہانا تھا

دل نہ کرنا تھا اس طرح سے خراب
عاقبت وہ ترا ٹھکانا تھا

کل دل کو لیا، مگر گئے پھر آج
بس! آپ کا اعتبار دیکھا

نیچے ہے اک نگاہ پہ دل کے تئیں وفاؔ
لینا ہو گر تمہیں، تو کچھ اتنا گراں نہیں

لطفؔ

مرزا علی

○

چمن کو گل جو تری مے کشی کا دھیان رہا
ہر ایک بات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا

جو عمرِ خضر ہو شاید، تو وصل ہووے نصیب
یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا

میں کیا ہوں، باختہ رنگ اس شعلہ رو کے آگے
مہتاب کے بھی منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں

طاقت حباب ساں، اک نظارہ کی رہی ہے
ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں

اے لطفؔ! اس غزل پہ کہنا بقول سوداؔ
یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

وہ خود فروش آ گیا بارے چمن میں کل
بوئے خودی نکل گئی گل کے دماغ سے

ہووے فضائے ہستیٔ موہوم کا بُرا
کنج عدم میں کاٹتے تھے کس فراغ سے

مائل

میر محمدی

○

اتنا میں مر کے دل سے ترے دُور ہو گیا
اک دن بھی آ کے تُو نہ سرِ گور ہو گیا

نالے کو ہم نے ضبط کیا ناصحا تو کیا
منہ سے تو زرد رنگ چھپایا نہ جائے گا

اشک کی طرح گرا جب تو پھر اُٹھنا معلوم
مَیں وہ اُفتادہ نہیں ہُوں کہ سنبھل جاؤں گا

سب یار ہیں تمہارے اغیار ہیں تو ہم ہیں
آنکھوں میں یاں سبھوں کے اک خار ہیں تو ہم ہیں
چنگا بھلا ہے تُو تو، پیارے! تری بلا سے
آزار ہے تو ہم کو، بیمار ہیں تو ہم ہیں

کیا تعجب نہیں گر مر گیا مائل تیرا
یار کیا لگتا ہے انسان کے مرجانے کو

عشق

رکن الدین

○

اس کی لذت کو دل سمجھتا ہے
اس کو مَیں کیا کہوں کہ کیا دیکھا

دشت! تجھ کو قسم ہے مجنوں کی
عشق سا کوئی رہبر پا دیکھا

اپنی آنکھوں سے دیکھ لے خوش چشم
مجھ سے کیا پُوچھتا ہے کیا دیکھا

اس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم
خاک میں آپ کو ملا دیکھا!

بات کہنے کی نہیں طاقت شکایت کیا کروں
عشق رخصت دے تو شورِ حشر اب برپا کروں

باتیں نہ سُن تُو میری جل جائے گا دِوانے
میں برقِ آسماں ہُوں یا عشق کی زباں ہُوں

شاعر

بہیر لکھنو

○

بھول کر بھی ادھر نگاہ نہ کی
کہہ! ترا اس میں کیا ضرر ہوتا

دیوانہ ہے جنوں سے کہیں مر نہ جائے دل
نامِ بہار رُوبرو اس کے نہ لو عبث

رونے میں دم کے رُکنے کی گر ہے یہی طرح
تو جوشِ غم سے ہم نہیں بچتے کسی طرح

یاں تک تو عزیز تھا ترا غم
لے گور میں بھی اسے گئے ہم

کیوں نہ ہووے بہار آنکھوں میں
ہے مرا گلعذار آنکھوں میں

کیا کیا اثر دیے ہیں بُتوں کی نگاہ کو
یارب عطا ہو کچھ تو ہماری بھی آہ کو

جوہر

مادھو رام

○

کیا یاد کرکے روؤں کہ کیسا شباب تھا
کچھ بھی نہ تھا، ہوا تھی، کہانی تھی خواب تھا

اب عطر بھی ملو تو تکلّف کی بُو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا

محمل نشیں جب آپ تھے لیلےٰ کے رُوپ میں
مجنوں کے بھیس میں کوئی خانہ خراب تھا

پیری میں ایک ہی سے ہمیشہ رہیں گے دن
وہ اَور تھا زمانہ جسے انقلاب تھا

تیرا قصور وار خدا کا گناہگار
جو کچھ کہ تھا یہی دلِ خانہ خراب تھا

ذرہ سمجھ کے یوں نہ ملا مجھ کو خاک میں
اے آسمان! میں بھی کبھی آفتاب تھا

جوہر

منشی جواہر سنگھ

○

صنم بھی اس کے مظہر ہیں کروں سجدہ نہ کیوں جوہرؔ
نظر آتا ہے جو کچھ ہے نمونہ اس کی قدرت کا

ٹھہرا وصالِ وعدۂ فردائے حشر پر
دل کو یہاں تحمّلِ روزِ دگر نہ تھا

خار کی طرح ملی باغِ جہاں میں تقدیر
جس سے لپٹوں وہ چھڑا لیتا ہے دامن اپنا

ہم آئے عشقبازی کو تم آئے دلنوازی کو
کوئی اس عالمِ اسباب میں کب بے سبب آیا

سب کھینچتے ہیں نالۂ گرم اس کے واسطے
اک شمع نے لگائی ہے یہ انجمن میں آگ

وہ بادہ خوار ہوں پہنچوں گا جب لبِ کوثر
تو دیں گے ساقیٔ کوثر بھی بھر کے جام مجھے

ذاکر

ذاکر علی

○

اندوہ و درد و یاس و غم و حسرت و ملال
کیا کیا نہ ساتھ لے کے چلے اس جہاں سے ہم

ویرانیٔ چمن کا نہ صدمہ ہوا نصیب!
مر جائیں کاش پہلے ہی فصلِ خزاں سے ہم

نظروں سے آج اُن کی یکایک اُتر گئے
رونے کا ہے محل کہ گرے آسماں سے ہم

صیاد کس کو اب ہے رہائی کی آرزو
کنجِ قفس میں خوش ہیں کہیں آشیاں سے ہم

اسیری نے کیا ہے تنگ جاں سے
گلا گھٹنے لگا طوقِ گراں سے

خدائی کا ہے دعویٰ کس زباں سے
کوئی پوچھے بتانِ بے دہاں سے

جیا تنہا مثالِ خضر تو کیا!
میں در گذرا حیاتِ جاوداں سے

سحرؔ

اقبال بہادر ورما

○

کسی رنگ میں دلستانی نہیں ہے ۔۔۔ کوئی شے یہاں جاودانی نہیں ہے

ہے ٹھہراؤ بھی حرفِ فانی نہیں ہے ۔۔۔ حقیقت ہے دنیا کہانی نہیں ہے

خیالات کی شاد و آباد دنیا ۔۔۔ کسی طرح بھی آنی جانی نہیں ہے

لہو ہے لہو سب یہ توبہ کا دل میں ۔۔۔ سبو ہے مےِ ارغوانی نہیں ہے

عجب ہے یہ حالت مرے آنسوؤں کی ۔۔۔ نری آگ ہے ان میں پانی نہیں ہے

ارے مجھ میں چھپ کر یہ کیا کہہ رہے ہو ۔۔۔ مری بات میری زبانی نہیں ہے

بھرے ہیں دلوں میں گماں کیسے کیسے ۔۔۔ یہ کیا ہے اگر بدگمانی نہیں ہے

نہ جینا خوشی کا نہ مرنا خوشی کا ۔۔۔ خوشی تو ہے جب زندگانی نہیں ہے

زمیں پر ہے پورا اثر آسماں کا ۔۔۔ محبت نہیں، مہربانی نہیں ہے

خدا خود میں ہے آپ اپنی نشانی ۔۔۔ غلط ہے کہ اس کی نشانی نہیں ہے

جو اس صنف میں سحرؔ ہے مشق کم کم
غزل میں وہ جادو بیانی نہیں ہے

عزیزؔ صفی پوری

منشی ولایت علیخان

○

بلا کے بات بھی کی اور مسکرا بھی [illegible]
کیا شہید بھی قاتل نے خوں بہا بھی [illegible]

گیا جو نامہ بر، آیا بہت سر [illegible]
کہا کہ چاک کیا خط کو اور جلا بھی [illegible]

سنبھلے حضرتِ موسیٰ مگر ستم [illegible]
دکھا کے جلوۂ دیدار کچھ [illegible]

میں وہ چراغ ہوں جس کو [illegible]
قریبِ صبح کیا روشن اور بجھا بھی [illegible]

عزیزؔ اس کے کرم پر فدا نہ [illegible]
کہ عشق دے کے مجھے عشق [illegible]

احسن لکھنوی

مہدی حسن

○

دل کی وحشت نہ گئی خاک میں مل جانے سے
آندھیاں اُٹھنے لگی ہیں مرے ویرانے سے

روز کرتا ہوں درستی شکست توبہ
لے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ترے پیمانے سے

جام کے دورِ تسلسل سے ہے دُنیا قائم
چرخ نے سیکھی ہے گردش مرے پیمانے سے

مل نہ جائے کوئی رستے میں خدا کا بندہ
مُنہ لپیٹے ہوئے نکلا ہوں صنم خانے سے

ہوتی جاتی ہیں بہت وصل کی راتیں کوتاہ
آسماں دور بدل لے مرے پیمانے سے

پردۂ رازِ حقیقت جو اُٹھا دُوں احسن
شورِ تکبیر ہو پیدا ابھی بُت خانے سے

سرور

منشی دُرگا سہائے جہاں آبادی

○

کسی مستِ ناز کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گذر گئی شب آدھی دلِ بے قرار سو جا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اُٹھا لوں
تجھے سینے سے لگا لوں تجھے کر لوں پیار سو جا

یہ تری صدائے نالہ تجھے مُتہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سو جا مرے راز دار سو جا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہے، شبِ غم بُری بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم، دلِ بے قرار سو جا!

تشنہ

حافظ محمد یوسف خاں بلند شہری

ہر چند کہ ہے نشو و نما تیرے کرم سے
خالق ترے انعام بیاں ہونگے نہ ہم سے

اس پر بھی تو تقدیر کا لکھا نہیں مٹتا
رگڑی ہے جبیں ہم نے ترے نقش قدم سے

وعدے پہ قسم سوچ کے کھاؤ میرے آگے
جھوٹے نہ ٹھہر جاؤ کہیں جھوٹی قسم سے

اے تشنہ کہاں ذوق کہاں مومن و غالب
اس فن کا فقط نام ہے اب داغ کے دم سے

دل میں ہے یہ پوچھو اس سے جا کر
کیا تجھ کو ملا مجھے ستا کر

اتنا نہ ستا کہ یہ دلِ زار
فریاد کرے کسی سے جا کر

شوق

(پنڈت جگموہن ناتھ رینہ)

عشق کا راز نہ کیوں دل سے نمایاں ہو جائے
کاش یہ بھی کسی ناکام کا ارماں ہو جائے

نہیں امید کہ وہ حشر بداماں ہو جائے
ایسا دیوانہ جو خود داخل زنداں ہو جائے

درد قابو کا نہیں کاش وہ اُٹھ کر شبِ غم
سرگذشتِ دلِ ناشاد کا عنواں ہو جائے

نہ تسلی نہ دلاسا نہ کہیں نام کو صبر
حیف اس دل پہ کہ یوں بے سروساماں ہو جائے

غنچے چٹکیں کہ کھلیں پھول بڑھے جوشِ نمو
حسن پنہاں کسی عنواں سے نمایاں ہو جائے

ہو یہ وحشت کا اثر خندۂ گل سے ظاہر
پھول جب کھلنے لگیں چاک گریباں ہو جائے

چشمِ تر، نالۂ دل، سوزِ دروں، دردِ فراق
ایک مہجور کو کیا کیا سروساماں ہو جائے

شوقِ مے نوش کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا
غم میں جو دُرد بچے نذرِ حریفاں ہو جائے

طالب باغپتی

کنور محمد لطافت علی خان

پہلے تو آفتاب بنایا شباب نے
پھر اس میں چار چاند لگائے حجاب نے

ناحق کسی کو ڈال دیا پیچ و تاب میں
یہ کیا غضب کیا دلِ پُر اضطراب نے

اب کیا کہوں؟ کہوں نہ کہوں کشمکش میں ہوں
مارا ہے دلفریبیٔ طرزِ خطاب نے

نظارہ سوزِ روئے تجلّی نہیں رہا
خود دیکھنے کی چیز بنایا نقاب نے

لی کچھ ازل میں حسن سے سورج نے روشنی
سورج سے کسبِ نور کیا ماہتاب نے

نقش و نگارِ عہدِ تمنا بھی مٹ گئے
ایسا مٹا دیا دلِ خانہ خراب نے

طالب کسی کے سامنے اٹھ ہی نہیں سکی
ناکام ہی رکھا نگہِ انتخاب نے

نُور

میر نذیر علی

نہ داد ملتی تو پھر داد خواہ کیا کرتا؟
خدا کے سامنے عذرِ گناہ کیا کرتا؟

مواخذہ نہ بتوں سے تھا حشر میں منظور
خدا کو ظلم و ستم کا گواہ کیا کرتا؟

کسی میں نام کو بوئے وفا نہیں باقی
ہر ایک گُل چمنِ روزگار میں دیکھا

سفید بال ہوئے موسمِ جوانی میں
خزاں کا رنگ شروعِ بہار میں دیکھا

پاس جانا کہاں نصیب ہمیں
دُور سے دیکھنا غنیمت ہے

رات دن اس کا نام جپتے ہیں
عاشقوں کی یہی عبادت ہے

تیرے قدموں پہ دم نکل جائے
بس یہی دل میں ایک حسرت ہے

مدہوش

سنت پرشاد

○

عشق کی رَو میں کچھ اس طرح سے بہ جاتے ہیں
جو کہ کہنا نہ ہمیں چاہیے کہہ جاتے ہیں

اور جب کہنے کی ہو بات تو اُن کے آگے
دل کو ہم تھام کے خاموش سے رہ جاتے ہیں

ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رُکتے رُکتے
حُسن توفیق جو دیتا ہے تو کہہ جاتے ہیں

حسن سے سب پہ گرانی تھی بقولِ شاعر
ناتواں عشق کے اِس بار کو سہہ جاتے ہیں

بات پردے کی ہے جو حضرتِ مدہوش اے
پردۂ شعر میں کس لُطف سے کہہ جاتے ہیں

کیفی حیدرآبادی

سید رضی الدین حسن

○

ترے انداز ظالم کیا ہیں کچھ بولا نہیں جاتا
سمجھ جاتا ہوں لیکن مجھ سے سمجھایا نہیں جاتا

ترا چہرہ برابر دُور سے دیکھا نہیں جاتا
جھجکتا کیوں ہے، آ نزدیک آ، میں کھا نہیں جاتا

ترے جور و ستم بھولے، ہم اپنے درد و غم بھولے
مگر ظالم ترا یہ بھولنا بھولا نہیں جاتا

طبیعت اس کی، مرضی اس کی، دل اس کا خوشی اس کی
جہاں جی چاہے، جاتا ہے، نہیں چاہا نہیں جاتا

ذرا دل لینے والے بھی تو سوچیں اپنی گھاتوں کو
کسی پر اد بدا کر تو مرا دل آ نہیں جاتا

آسی

عبدالعلیم

تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا
منہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا

رشکِ خورشید جہاں تاب دیا دل مجھ کو
کوئی دلبر بھی اسی دل کے مقابل دینا

درد کا کوئی محل ہی نہیں جب دل کے سوا
مجھ کو ہر عضو کے بدلے ہمہ تن دل دینا

اسی کے جلوے تھے لیکن وصالِ یار نہ تھا
میں اس کے واسطے کس وقت بیقرار نہ تھا

خرامِ جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا

وفورِ بیخودیٔ بزم ہے نہ پوچھو، رات
کوئی بجز نگہِ یار ہوشیار نہ تھا

لحد کو کھول کے دیکھو کہ اب کفن بھی نہیں
کوئی لباس نہ تھا جو کہ مستعار نہ تھا

پیر مرادشاہ

یہاں ہجر میں کوئی دم دیکھتے ہیں
نہیں پھر تو مُلکِ عدم دیکھتے ہیں

جو اخلاص آپس میں ہوتے تھے یارو
سو رسم اس زمانے میں کم دیکھتے ہیں

اجل نے جو دی ہم کو فرصت تو ہم بھی
شتاب آپ کے اَقدم دیکھتے ہیں

ہم احوال پر اپنے اے بندہ پرور
تمہارا ہی لطف و کرم دیکھتے ہیں

لٹاتا ہے غیروں سے اے شوخ آنکھیں
چُراتا ہے جس وقت ہم دیکھتے ہیں

سیہ بختی ہے اپنی اس زُلف میں دل
گرفتارِ پُر پیچ و خم دیکھتے ہیں

یہاں سیرِ دل جس کو مدِ نظر ہے
وہ کب جا کے باغِ ارم دیکھتے ہیں

مُراد آج کیا ہو گیا ہے جو تیری
لبیں خشک اور چشم نم دیکھتے ہیں

وسیمؔ

سید محمد عسکری خیر آبادی

○

تیر آئیں دل میں اک دن کے لئے
حسرتیں سب بے تاب ہیں ان کے لئے

ہائے کیا آئی جوانی کیا گئی
کر گئی بدنام دو دن کے لئے

وہ گھٹا اٹھی ہے پی لو واعظو
ورنہ پھر ترسو گے اس دن کیلئے

غش ہوئے موسیٰ تو آئی یہ صدا
پردہ ہم کرتے تھے اس دن کیلئے

کاملؔ

علی میاں

○

مدار کار ہے نخوت پہ نکہت دانوں کا
ہوا کے ہاتھ میں دامن ہے بادبانوں کا

عزیز زخم جگر اس سبب سے ہے مجھ کو
کہ یادگار ہے احباب کی زبانوں کا

مٹائے نقش قدم رہرووں نے خوب کیا
کہ بیٹھنا بھی تو مشکل تھا ناتوانوں کا

خزاں میں غم شب تیرہ کا بلبلیں نہ کریں
چراغ بن کے جلے گا خس آشیانوں کا

ہمارے دل کو شکار ا نگنو، ملال نہ دو
کہ تیر خوردہ ہے افلاک کی کمانوں کا

جگر بسوانی

حکیم محمد افتخار علی خان

○

وار کرتے ہیں وہ شمشیرِ ادا سے پہلے
جان لے لیتے ہیں عاشق کی قضا سے پہلے

دل پہ کرتے ہیں جفا آپ وفا سے پہلے
روز ملتی ہے سزا ہم کو خطا سے پہلے

عشق میں موت کا احسان اُٹھانا کیسا
جان دینے کا ارادہ ہے قضا سے پہلے

دلِ ناکامِ تمنا کا ہے یہ حسرت میں حال
ناامیدی ہوئی جاتی ہے دُعا سے پہلے

ہم خطاوار سرِ حشر نہ رُسوا ہوں گے
بخش دیتا ہے وہ اقرارِ خطا سے پہلے

کوئی اندازِ جفا کرتے ہیں ایجاد اگر
پُوچھ لیتے ہیں وہ اربابِ وفا سے پہلے

خونِ دل تُو نے جگر کا نہ ملا ہو اے شوخ
ہاتھ یوں سرخ نہ ہوتے تھے حنا سے پہلے

باسط بسوانی

○

اگر پردہ دوئی ڈالے نہ رہتی درمیاں اپنا
تو میرے امتحاں کو وہ سمجھتے امتحاں اپنا

کیا یُوں رازِ دل ہم نے اشاروں میں بیاں اپنا
کہ جیسے حال کہتا ہے بہ مشکل بے زباں اپنا

وہی اک داستانِ عشق ہم دہراتے رہتے ہیں
بدلتا رہتا ہے کچھ کچھ مگر رنگِ بیاں اپنا

چھری گردن پہ رکھے رو رہے ہیں آج مقتل میں
وہی کل جو ہنسی سمجھے تھے باسطؔ امتحاں اپنا

فیروز طُغرائی

حکیم فیروز الدین

○

آ رہا ہے تیر پیہم تیر پر
آفریں ہے جذبۂ نخچیر پر

ختم ہے ہم پر اسیری عشق کی
قفل ہے ہر حلقۂ زنجیر پر

دیکھ کر خط لال آنکھیں ہوگئیں
خوب سُرخی ہے مری تحریر پر

مر مٹے ہم پر رقیبِ رُوسیہ
ظلمتیں صدقے ہوئیں تنویر پر

کاخِ ہستی ہے طلسمِ بے ثبات
رنگ ویرانی ہے اس تعمیر پر

ساتھ پیری سے جوانی کا نہیں
منحصر کیا ہے کمان و تیر پر

کہہ دیا جس نے ان آنکھوں کو غزال
صاد ہے اس شخص کی تقریر پر

کہہ تو دیں تاخیرِ وعدے کو ترے
پر اُسے تقدیم ہے تاخیر پر

دیکھ کر فیروز خوابِ زندگی
کھل گئیں آنکھیں مری تعبیر پر

جالبؔ دہلوی

سید بشارت علی

○

کسی عاشق پہ جب بیداد کرنا
ہمیں بھی او ستمگر یاد کرنا

تمہیں ظالم بنایا ظلم سہہ کر
نہ یہ محنت مری برباد کرنا

نیا عاشق ہو گر پیدا تو تم بھی
کوئی تازہ ستم ایجاد کرنا

مٹانا خاک پر لکھ کر مرا نام
بنوں جب میں تو یوں بیداد کرنا

فوق

منشی محمد الدین

سرد آج کل اس درجہ زمانے کی ہوا ہے
انجام کے احساس سے دل کانپ رہا ہے

تم دل نہ کہو اس کو وہ پتھر کا ہے ٹکڑا
جس میں نہ حمیت نہ حرارت نہ وفا ہے

وہ شکل جو آتے ہی نظر ہو گئی غائب
جادو ہے کہ بجلی کہ چھلاوہ کہ بلا ہے

ہیں وہ کہ ترے ظلم و ستم پر بھی دعا گو
تو وہ کہ مرے عجز و وفا پر بھی خفا ہے

کس ہستی موہوم پہ غافل یہ تکبر
اتنا تو سمجھ کوئی رہے گا نہ رہا ہے

کشمیر جسے کہتے ہیں سب غیرت فردوس
جب تو ہی نہیں پاس تو دوزخ سے سوا ہے

کہسار پہ یا ابر کے پھرتے ہوئے سائے
اک عالم ناشاد اب تجھے ڈھونڈ رہا ہے

گر بادلہ سر پر ہے تو مخمل ہے تہ پا
القصہ عجب منظر پر زیب ضیا ہے

آ، اور مری چشم تصور میں سما جا
آئینہ ترا دید سے بے عکس پڑا ہے

ہونے کو وہ سب کچھ ہے باندازِ حقیقت
بندہ ہے تو بندہ ہے خدا ہے تو خدا ہے

اے فوق ہیں جو دل سے محتاج رفاقت
تنہا رہ منزل میں کوئی چھوڑ گیا ہے

حامی

پیر وزیر علی شاہ

ستم کر، ظلم کر، جور و جفا کر
ہیں ممنوں رہیں، جو ہو تیری رضا کر

اگر کچھ ہے مسیحائی کا دعویٰ
تو میرے درد دل کی بھی دوا کر

خیال یار بھی پردہ نشیں ہے
کہ چھپ جاتا ہے اپنے دل میں آ کر

دل عشاق پر گرتی ہے بجلی
وہ جب کرتے ہیں باتیں مسکرا کر

نیرنگ

سید غلام بھیک

○

اک ہجوم غم و کلفت ہے خدا خیر کرے
جان پر نت نئی آفت ہے خدا خیر کرے

جائے ماندن ہمیں حاصل ہے نہ پائے رفتن
کچھ مصیبت سی مصیبت ہے خدا خیر کرے

اُچلا اُس بُتِ عیار کی باتوں کا یقیں
سادگی اپنی قیامت ہے خدا خیر کرے

دل گیا جانے دو کافر کی ہے ایماں پہ نظر
آنکھ میں اپنی مروت ہے خدا خیر کرے

ابھی تشخیص مرض میں ہے طبیبوں کو کلام
جان ادھر در پئے رخصت ہے خدا خیر کرے

رہنماؤں کو نہیں خود بھی پتہ رستے کا
راہ رو پیکر حیرت ہے خدا خیر کرے

ازلؔ

ابوالاعجاز منشی عبدالمجید

○

اس نے مژگاں کا تان کر بھالا
اپنے عاشق کو مار ہی ڈالا

عشق گیسو کو دی جگہ دل میں
سانپ کو آستین میں پالا

تیری زلفوں کا تیری آنکھوں کا
کوئی وحشی ہے کوئی متوالا

اک نیا ظلم روز کرتا ہے
کس ستمگر سے پڑ گیا پالا

بے نوائی میں خوش ہوں اپنی ازلؔ
نے غم دو دنے غم کالا

شوق نیموی

ظہیر احسن

نالے بیتاب ہیں سینے سے نکلنے کے لئے
اس ستمگر سے کوئی کہہ دے سنبھلنے کے لئے

خانۂ دل میں رہو تم جو یہاں جی گھبرائے
چلے آنا مری آنکھوں میں ٹہلنے کے لئے

شوخیاں ان کی مری بزم حیا سے بڑھ لیں
مجھ کو محفل سے ہوا حکم نکلنے کے لئے

درد تعظیم کو پہلو سے نہ کیوں کر اٹھے
دل میں آتا ہے کلیجہ کوئی ملنے کیلئے

کبھی میرا کبھی ان کا سبب ہے شکوہ دل کو
ڈھونڈتا ہے کوئی پہلو یہ مچلنے کے لئے

لاکھ رسوا ہو مگر چاہ بُری ہوتی ہے
دل کو پھر ضد ہے اسی کوچے میں چلنے کیلئے

محفل غیر میں کیوں کر شمع جلائی تم نے!
کیا وہاں کوئی نہ تھا رشک سے جلنے کیلئے

سر شوریدہ کہیں لے شوق یہاں تک دل میں
کوئی ڈھونڈتی ہے راہ نکلنے کے لئے

ناظم

مرزا ناظر حسین لکھنوی

نور کا تیرے ازل سے آفتاب آئینہ تھا
لاجواب آئینہ میں تھا لاجواب آئینہ تھا

طالع بیدار نے دیکھا کھلی آنکھوں تجھے
تھی تری تصویر تعبیر اور خواب آئینہ تھا

دیدۂ جوہر نے تھے آنکھیں ہی آنکھیں تھیں کھلی
دیکھنے والوں کی نظروں کا حجاب آئینہ تھا

تو نے یوں دیکھا کہ منہ پانی میں دیکھیں جس طرح
آب تھی آب حسن سے کیا آب آب آئینہ تھا

عکس خال و خط تھے سب گویا کتابی کے خیال
ایک مصحف تھا مگر پوری کتاب آئینہ تھا

اپنے گھر میں رہنے پر بھی دربدر پھرتا رہا
سخت حیرت ہے عجب خانہ خراب آئینہ تھا

بن کے حیرت خانہ میں آیا جو وہ صورت سوال
سامنے غائب تھے مگر حاضر جواب آئینہ تھا

صبح ہونے کو ہے دیکھیں دیکھتا ہے وہ کسے
شام سے میں جاگتا تھا محو خواب آئینہ تھا

جس نے رکھا اس کو آنکھوں ہی میں اے ناظم رکھا
مردمک تصویر تھی چشم پُر آب آئینہ تھا

احمؔد

خان احمد حسین خان

○

مجھے ڈھونڈے نہ کوئی اے ستمدر اشکباروں میں
کسی کو مجھ سے ملنا ہے تو آئے جاں نثاروں میں

دلِ پُر داغ و چشمِ خوں فشاں کے نام لیوا ہیں،
لگے ہیں ورنہ کیا سُرخاب کے پر لالہ زاروں میں

عجب مہماں نوازی ہے سرائے ملکِ فانی کی
کہ مہمانوں کو لے جا کر سلاتے ہیں مزاروں میں

فلک سمجھائے اپنے ناز پروردہ ستاروں کو
چُرا لیتے ہیں میری نیند یہ شب کو اشاروں میں

ہمارے دامنِ ہستی کے ٹکڑے ہوں خدا اے ہمدم
جو دشتِ زندگی میں ہم کو اُلجھاتے ہیں خاروں میں

میں تجھ سے پوچھتا ہوں اے تپِ فرقت کی بیہوشی
یہی تھی پاس جو بیٹھی رہی تیمارداروں میں

ہمارے دل کو دیکھو دل میں آئے داغ کو دیکھو
نہ دیکھو ماہِ کامل کو نہ جاؤ لالہ زاروں میں

بہت خوش ہو گا سن کر چھوٹنے والا مرا احمد
مری تربت بھی یاروں کو نہیں ملتی مزاروں میں

سجّاد

سجاد علی انصاری

○

آنکھ جب تک فریب کار نہ تھی
پھول میں شوخیٔ بہار نہ تھی

اس سے پہلے بھی تیری خاموشی
تھی مگر ایسی طرفہ کار نہ تھی

یاس پہ تُو نے کر دیا مجبور
ورنہ امید مجھ پہ بار نہ تھی

میں نے دیکھا تری نگاہوں کو
ان میں وہ شانِ اعتبار نہ تھی

○

کس طرف لے کے چلا شوق کا انداز مجھے
آج کیوں روک رہی ہے تری آواز مجھے

خار زاروں میں بھی نظر آتی ہے شادابیٔ گُل
لیے جاتا ہے کدھر حُسنِ فسوں ساز مجھے؟

مجھ کو افسونِ محبت نے مٹا کر چھوڑا
تُو سمجھتا ہی رہا شعبدہ پرداز مجھے

جس کے ہر رنگ پہ ہے خوبیٔ انجام نثار
یاد آتی ہے وہ نیرنگیٔ آغاز مجھے

شیدا

رام رچھپال سنگھ دہلوی

قیامت ڈھائیں گے رفتار سے اصلا نہ مانیں گے
وہ جب تک حشر ہی برپا نہ ہو لے گا نہ مانیں گے

نہ مانو گے تو روزِ حشر تم پچھتاؤ گے دیکھو
مناؤ گے مگر عشاقِ بے پروا نہ مانیں گے

وہ موسیٰ تھا کہ فقرہ چل گیا واں لن ترانی کا
تمہارے طالبِ دیدار یہ دعویٰ نہ مانیں گے

بجز عشقِ بتاں عشقِ خدا ہو، ہو نہیں سکتا
اگر ہم مان بھی لیں حضرتِ شیدا نہ مانیں گے

شمس مینائی

ابوالمعانی شیخ عبدالرحمن امرتسری

سناؤں کیا کسی کو میں سنے گا کوئی کیا میری
نہ وہ عالم ہے اب میرا نہ وہ دلبستگی میری

گئے وہ دن کہ میں اور وہ شریکِ بزم ہوتے تھے
سنا کرتے تھے اہلِ دل کبھی اُن کی کبھی میری

یہ منظر آخرِ شب کا ہے دیکھو چشمِ عبرت سے
کہ ہے مہمان کوئی دم کی شمعِ زندگی میری

نہ پوچھو کچھ بہ ظاہر داریاں رہنے بھی دو صاحب
کسی کو کیا کٹی جیسی کٹی ہاں کٹ گئی میری

نہیں تو ایک ساعت کیلئے بھولا نہیں تجھ کو میں
مگر کہئے تمہیں بھی یاد کیا آتی کبھی میری

غضب ہے ہوتے ہوئے آنکھیں دکھائی کچھ نہیں دیتا
سیاہی سے بدل کر رہ گئی ہے روشنی میری

یہ فیضِ صحبتِ اہلِ سخن ہے کچھ جو لکھتا ہوں
نہیں تو شمس کیا اردو مرا کیا فارسی میری

اشک

داجد علی خاں عرف اچھن صاحب رامپوری

○

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہ گزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھئے
میری نظر کہیں ہے تو اُن کی نظر کہیں

اِن ہمدموں کی کارگزاری نہ پوچھئے
دل سے بنا بنا کے ادھر کی اُدھر کہیں

اے رازداں یہ سب نزے کہنے کی بات ہے
رکھتے ہیں ورنہ کان بھی دیوار و در کہیں

اس نکتہ چیں کو حال سُنانے چلے تو اشک
اپنی زباں جواب نہ دے وقت پر کہیں

اظہرامرتسری

خدابخش

○

یہ روزِ قیامت ہے تکمیلِ تمنا کر
یا آج بھی دھوکا دے یا وعدۂ فردا کر

یا پردے سے باہر آ جلوے کو بھی رسوا کر
یا عشق کی رُسوائی چُھپ چُھپ کے نہ دیکھا کر

یہ میرا سیہ خانہ یہ ہجر کی تاریکی
آ تو بھی یہاں روشن شمعِ رُخِ زیبا کر

اے ساقیٔ مے خانہ اک ساغرِ بادہ سے
مفلس کو سکندر کر نادار کو دارا کر

مفہومِ تمنا پر آتی ہے ہنسی مجھ کو
جس وقت وُہ کہتے ہیں اظہارِ تمنا کر

امروز کی محفل میں پینے دے مجھے واعظ
تو بیٹھ کے مسجد میں اندیشۂ فردا کر

مَیں طالبِ جلوہ ہوں وہ کہتے ہیں اے اظہر
سورج کی نگاہوں سے شبنم کو نہ دیکھا کر

عابد شاہجہانپوری

عابد حسین

راز عالم سے آشنا تھی نظر
ہم اُٹھے میکدے سے جب پی کر

دُور ہوں انقلابِ عالم سے
میری دُنیا میں شام ہے نہ سحر

آپ اور پرسشِ دلِ غم گیں
یہ بھی شاید ہے اک فریبِ نظر

اب یہ عالم ہے وحشتِ دل کا
لوٹ آتا ہوں دو قدم چل کر

سرگذشتِ نگاہ کیا کہیے
جیسے اک برق جیسے اک محشر

کوئی آیا میں سمجھا آپ آئے
اللہ اللہ یہ بے خودیٔ نظر

عرق آلودہ ہے جبینِ حسیں
جیسے شبنم گری ہو پھولوں پر

ذرّے تو دے رہے ہیں اے عابد
رشکِ فردوس ہے فضائے سحر

عیش

جان محمد خان غوری فیروزپوری

ہم یوں تڑپ رہے ہیں ترے آستاں سے دُور
جیسے کوئی اسیرِ قفس آشیاں سے دُور

تُو ہر مقام پہ ہے نگاہوں کے سامنے
میں ہر مقام پہ ہوں ترے آستاں سے دُور

منزل جُدا، خیال جدا، شوقِ دل جُدا
میں کارواں کے ساتھ ہوں یا کارواں سے دُور

بزمِ جہاں کی سیر بہت کر چکا ہوں میں
اے عشق لے چل اَور کہیں اس جہاں سے دُور

جنت کی جستجو ہے جسے چل کے دیکھ لے
نزدیک ہے کہ پیرِ مغاں کی دُکاں سے دُور

ایک ایک سے زیادہ ہیں دُنیا میں کم نصیب
بلبل چمن سے، ہم ہیں ترے آستاں سے دُور

اُن کا خیال عیش پھر اُن کا خیال ہے
رہتے جہاں میں رہ کے ہوں رہتے جہاں سے دُور

نیرؔ واسطی

حکیم سیّد علی احمد

پھر ہجر و فراق کی گھڑی ہے
عمرِ غمِ آرزو بڑی ہے

پلکوں پہ مچل رہے ہیں انجم
کس چاند سے آنکھ جا لڑی ہے

آجاؤ کہ ایک بار ہنس لیں
رونے کو تو زندگی پڑی ہے

یہ ظلمتِ شب یہ جوشِ گریہ
برسات کی رات کی جھڑی ہے

جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

نیرؔ کو سلامِ غم مبارک
منزل مگر عشق کی کڑی ہے

عبرتؔ

محمد تبارک علی صدیقی

گو میسر تھا پھولوں کا سایا
پھر بھی کانٹوں کو ہنسنا نہ آیا

بے نیازانہ گذرے چمن سے
ہم نے پھولوں سے دامن بچایا

ان کی آنکھیں اور اشکِ محبت
یہ ستارہ کہاں جھلملایا

ان کی آواز پر بڑھ رہا ہوں
اب نہ منزل نہ منزل کا سایا

درد گہوارۂ زندگی ہے
غم نے دل کو تھپک کر سلایا

یہ کہیں میرا دل تو نہیں ہے
ان کی مژگاں پہ کیا جگمگایا

اشک آنکھوں میں آئے اُمنڈ کر
پرسشِ غم نے طوفاں اُٹھایا

میرا کردار ہی مجھ کو عبرتؔ
عرش سے فرش پر کھینچ لایا

ہادیؔ مچھلی شہری

○

شوریدگی سرہاں جائے گی نہ یوں سر سے
تھپٹ ہی عنایت ہو ساقی مجھے ساغر سے

نقاشِ غمِ پنہاں ہے کون سوا اس کے
زیبائشِ داماں ہے نوکِ مژۂ تر سے

دُنیائے محبت میں اک حشر سا برپا ہے
بالیدگیٔ غم سے شوریدگیٔ سر سے

مانا کہ نصیبوں کا ہوتا ہے لکھا پُورا
ٹکراؤں میں سر کب تک بے درد ترے در سے

اے پائے طلب لے چل اے جوششِ وفا کام آ
سودائے محبت کو کچھ کام ہے اس در سے

بدنام نہ ہو جائے اندازِ ستم کاری
کیوں آنکھ چراتے ہو میرے دلِ مضطر سے

لاتا ہے غمِ فرقت کچھ اور ارادوں سے
سر پھوڑ کے دیوانے جاتے ہیں ترے در سے

بیکار گئی کوشش تدبیر نہ کام آئی
کچھ بس نہ چلا ہادیؔ آخر کو مقدر سے

رساؔ جالندھری

کبیر خاں

○

لرزاں ہے ایک برق سی جلوہ کہیں جسے
دھوکا نہیں نگاہ کا دھوکا کہیں جسے

پھیلی ہے ان لبوں پہ تبسم کی روشنی
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا کہیں جسے

اللہ میرے عشق کا انجام ہو بخیر
دیکھوں وہ خواب، خوابِ زلیخا کہیں جسے

دِل کی رگوں میں دوڑ کے بیتاب کر گئی
ہلکی سی ایک لہر تمنا کہیں جسے

نقاش کوئی ایسی بھی تصویر کھینچنا
بگڑے ہوئے نصیب کا نقشا کہیں جسے

آخر ٹپک کے آنکھ سے دامن پہ آ رہی
وہ اک لہو کی بوند کلیجا کہیں جسے

روتی ہے بے کسی کہ ہوا ہے وبالِ دوش
خوں گشتہ حسرتوں کا جنازا کہیں جسے

اپنے تجھے جو کہتے ہیں اچھا تو کیا رساؔ
اچھا وہی ہے غیر بھی اچھا کہیں جسے

وفاؔ

پنڈت میلا رام

○

التفاتِ عام ہے وجہِ پریشانی مجھے
کس قدر مہنگی پڑی ہے ان کی ارزانی مجھے

میں ہوں اور آزارِ استقبالِ دشمن صبح و شام
یعنی اس نے دی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے

سعیِ لاحاصل ہے دل کی کوششِ اخفائے راز
کر گئی رسوا نگاہوں کی پریشانی مجھے

بحرِ ہستی ہے مری نظروں میں اک دشتِ سراب
ریت کا ہوتا ہے دھوکا دیکھ کر پانی سے مجھے

تیرے جلووں کا تو ہر اک ذرہ ہے آئینہ دار
مانعِ نظارہ ہے خود میری حیرانی مجھے

اس قدر نا پید ہیں اہلِ کمال اب اے وفاؔ
کوئی اپنا بھی نظر آتا نہیں ثانی مجھے

نظیرؔ

اصغر حسین خاں

○

تاریخ میں جب تک مرا افسانہ رہے گا
فرزانہ جو ہو گا ترا دیوانہ رہے گا

شغلِ دف و چنگ و مے و پیمانہ رہے گا
ہم ہیں تو یہی جلسۂ رندانہ رہے گا

یہ شہرِ محبت بھی عجب شعبدہ گر ہے
آباد بھی ہو جائے تو ویرانہ رہے گا

تم آپ نہ آؤ گے تو میں پہنچوں گا آکر
اک رات بھی بے شمع نہ پروانہ رہے گا

چلتے ہوئے دو جام ہیں ساقی تری آنکھیں
اب کس کو سرِ ساغر و پیمانہ رہے گا

کیا غم ہے جو اٹھوایا ہے مجھ کو دمِ آخر
اب اس کی گلی میں مرا افسانہ رہے گا

گر ہیں یہی افکارِ نظیرؔ اہلِ حرم کے
کعبہ میں بھی اندازِ صنم خانہ رہے گا

طالب بدایونی

○

دل سے ترا خیال بھلایا نہ جائے گا
پتھر کا نقش ہے یہ مٹایا نہ جائے گا

اے یاس اب نہ خانۂ دل کو تباہ کر
اجڑا جو یہ نگر تو بسایا نہ جائے گا

اس کی تجلیاں ہیں مری آنکھ کا حجاب
پردہ وہ آپڑا کہ اٹھایا نہ جائے گا

ہم سے نہ ہوگی بندگیٔ ماسوا کبھی
یہ سر کسی کے در پہ جھکایا نہ جائے گا

جاتے ہیں اُس سے کہنے کو ہم اپنا حالِ دل
پوچھا گر اس نے حال بتایا نہ جائے گا

دل میں نہ چھپ سکے گا کبھی رازِ حُسن و عشق
شعلوں کو خار و خس میں چھپایا نہ جائے گا

طالب بغیر عشق و محبت کے دہر میں
ہستی کو لازوال بنایا نہ جائے گا

ثاقب زیروی

محمد صدیق

○

دل و نظر پہ مسلط ہے اک سکوں دشمن
بدل رہی ہے محبت جنوں کا پیراہن

بنی ہے زمزمۂ شوقِ تلب کی دھڑکن
یہ کس کے پاؤں کی آہٹ ہوئی پسِ چلمن

نگاہِ شوق ہے اور ان کا عارضِ روشن
مچل رہی ہے دمِ صبح آئنہ پہ کرن

یہ کون حُسنِ بہاراں ادھر سے گزرا ہے
مہک رہے ہیں ابھی تک گلوں کے پیراہن

نظر کو شوقِ نظارا ہے دل میں خودداری
دل و نگاہ کے رشتہ میں پڑ گئی الجھن

یہ اتفاق ہے یا معجزہ گناہوں کا
کہاں وہ رحمتِ کامل، کہاں میں تردامن

رہِ طلب میں کوئی کس پہ اعتبار کرے
جنوں خرد کا مخالف۔ خرد جنوں دشمن

وہ آنسوؤں پہ مرے مسکرا دیے ثاقب
بکھر گئے مری حدِ نگاہ تک گلشن

حرماں خیرآبادی

فرید احمد

○

آہ اس گھڑی مجھ کو آپ یاد آتے ہیں
صبح و شام جب مل کر کچھ پیام لاتے ہیں

جذبۂ محبت میں کیا طلسم ہے یا رب؟
ورنہ سحر تو اکثر بن کے ٹوٹ جاتے ہیں

کیا چمن میں پھر کوئی غیرتِ بہار آیا؟
پھول مسکراتے ہیں خار گنگناتے ہیں

کچھ تو لطف دیتی ہے آرزوئے دیرینہ
ہم جبھی تو آنکھوں سے اشکِ خوں بہاتے ہیں

آپ کی جفاؤں سے عذر کا کسے یارا
بس یہی قیامت ہے آپ بھول جاتے ہیں

اک غریقِ اُلفت کو خطرۂ تلاطم کیا
یعنی ڈوبنے والے آپ ڈوب جاتے ہیں

جس کو ایک اِک ساعت زندگی کی بھاری ہے
اس تباہ انساں کو آپ آزماتے ہیں؟

دل میں عشقِ رفتہ کی یاد تک نہیں باقی
اک شکستہ خاطر کو کیا یونہی ستاتے ہیں؟

اپنے دل کی حالت پہ رحم کیجیے حرماں
آپ کی کہانی ہے آپ ہی سناتے ہیں

عاصی کرنالی

○

میں بھی پابندِ وفا ہوں مجھ پہ بھی بیداد ہو
مجھ سے لوگوں نے کہا ہے تم ستم ایجاد ہو

آپ اس کی خوش مذاقی کا تصور کیجیے
بجلیاں گرنے سے جس کا آشیاں برباد ہو

آؤ لکھ دیں وقت کی تاریخ کا اک باب ہم
کچھ مرا افسانہ ہو کچھ آپ کی روداد ہو

وہ فضا وہ سرمئی شب، وہ تری پہلی نظر
او تغافل آشنا، شاید تجھے کچھ یاد ہو

دیکھتا ہوں حُسن بھی کچھ زندہ دل ہے یا نہیں
وہ ستم فرمائیے جو آپ کی ایجاد ہو

یُوں غمِ دوراں کو ہنستے کھیلتے دیجے شکست
مُسکرا دیجے اگر دل مائلِ فریاد ہو

ایک تارا ٹوٹ کر سارے اُفق پر چھا گیا
ہو کوئی برباد تو اس شان سے برباد ہو

شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے عاصی کا وجود
جب وہ کہتے ہیں کہ عاصی اک غزل ارشاد ہو

لطیف انور گورداسپوری

راہِ وفا میں خاک خود اپنی اُڑا کے دیکھ
پھر دیکھنا ہے تجھکو تو سب کچھ لُٹا کے دیکھ

گرداب ہے قریب کہ ساحل قریب ہے
اے ناخدا، بچا کے خدارا بچا کے دیکھ

دل مطمئن نہیں ہے حکایاتِ طُور سے
اِک بار اَور میری نظر آزما کے دیکھ

اے بادِ صبح غنچے ابھی تک ہیں محوِ خواب
رنگِ بہار ان کو ذرا گدگدا کے دیکھ

دیکھا نہیں ہے تو نے اگر ظرفِ بادہ نوش
اے پیرِ میکدہ کبھی مجھ کو پلا کے دیکھ

کشتی کا رُخ بدلتا رہا کیوں ہوا کے ساتھ
ہر موجِ حشر خیز کو ساحل بنا کے دیکھ

منظور

چودھری منظور احمد

کل قیس کے لب پر تھی اب میری زبانی ہے
رودادِ محبت بھی اک رام کہانی ہے

یہ مست نظر توبہ، یہ چال معاذ اللہ
اُڑتے ہوئے شعلے میں بہتا ہوا پانی ہے

اک گوشۂ عزلت میں اک بامِ تماشا پہ
یہ میری تمنا ہے وہ تیری جوانی ہے

اک دُودِ چراغِ دل اک بُوئے گلِ رعنا
یہ میرا فسانہ ہے وُہ تیری کہانی ہے

کرنوں کا قلم لے کر خورشید کے پردے میں
اے برقِ نظر تیری تصویر بنانی ہے

یہ کلبۂ غم جس کی تصویر سے ہے روشن
قندیلِ فلک انجم کو وہ شمع دکھانی ہے

آ دید سے پھولوں کی دامانِ نظر بھر لیں
خوش رنگ مناظر ہیں اور صبح سہانی ہے

گلزار میں اے مہوش! کچھ دیر ٹھہر جانا
خوشبو ترے بالوں کی غنچوں میں بسانی ہے

کچھ روز کی مہلت دے منظور کو محفل میں
اے موت ابھی دل کی روداد سنانی ہے

پیام شاہجہانپوری

محمد یمین خان

جو مصائب میں سے ہنس ہنس کے گذر جاتے ہیں
منزلیں ساتھ ہی رہتی ہیں جدھر جاتے ہیں

بات جب ہے کہ خزاں میں بھی ہو گلشن پہ بہار
موسم گل میں تو کانٹے بھی نکھر جاتے ہیں

ہم بھلا تیری جفا سے کبھی منہ پھیریں گے
ہم تو وہ لوگ ہیں جو بات پہ مر جاتے ہیں

لوٹ کر میرا سکوں اپنا بچا کر دامن
ٹھہریئے میرے حضور! آپ کدھر جاتے ہیں

کیا خبر کون ہیں آتے ہیں کہاں سے یہ لوگ
جب گذرتے ہیں تو رستے بھی سنور جاتے ہیں

کوثر نیازی

محمد حیات خاں

زہر اہل ہے چشمۂ حیواں ترے بغیر
صبح وطن ہے شام غریباں ترے بغیر

کٹتے نہیں کسی طرح لمحاتِ زندگی
رک سی گئی ہے گردش دوراں ترے بغیر

"دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو"
ہے دشمن سکوں سر و ساماں ترے بغیر

کیا اب حیات و موت کی قدریں بدل گئیں
کچھ لوگ زندہ ہیں غم جاناں ترے بغیر

تو بھی عجیب چیز ہے اے ابتلائے دہر!
پختہ نہ ہو سکا کوئی انساں ترے بغیر

اک روز میرے طالع بیدار آہی جا!
جینا ہے ایک خواب پریشاں ترے بغیر

اے رحمتِ تمام! نگاہ کرم ادھر
کیسے کٹے گا عرصۂ زنداں ترے بغیر

کشوری منہاس

غلام حسن

○

کہیں بھی خیر نہیں اپنے آشیانے کی
یہ کہہ رہی ہے پریشاں ہوا زمانے کی

جو رُو جبین جھیل چکیں سختیاں زمانے کی
تلاش اُن کو بھی ہے اب مرے فسانے کی

شگوفے باغ میں پھُولے نہیں سماتے ہیں
خبر بہار نے دی ہے یہ کس کے آنے کی

جو سمجھے جورِ حوادث کو زندگی کا نشاں
مٹا سکیں اُسے کیا گردشیں زمانے کی

یہ بے بسی کا ہے عالم کہ کچھ نہیں معلوم
کشش کہاں لیے جاتی ہے آب و دانے کی

ذرا میں عمرِ گذشتہ سے پُوچھ لُوں تو کہوں
مجھے تو یاد نہیں تلخیاں زمانے کی

ہمارے سامنے سب کچھ ہے مثلِ آئینہ
"قسم نہ کھاؤ ضرورت نہیں بہانے کی"

بتا نہ دو انہیں کشوریؔ کہ یہ زباں نہیں
سند جو ڈھونڈتے پھرتے ہیں لغت گانے کی

تبسّم

عبدالرشید

○

غمِ دل کو عطائے دلبراں کہنا ہی پڑتا ہے
بمجبوری زمیں کو آسماں کہنا ہی پڑتا ہے

حقیقت میں ہم اپنے حال سے خود بھی نہیں واقف
مگر یاروں کو اپنے رازداں کہنا ہی پڑتا ہے

یہ مانا منتشر تنکے چمن میں بے حقیقت ہیں
انہیں ترتیب دے کر آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

فنا کر دے حواس و ہوش کو جس مُحسن کا جلوہ
تکلم ساتھ دے تو اس کو "جاں" کہنا ہی پڑتا ہے

دروغِ مصلحت آمیز ہے مجبُور کا مذہب
یہاں ظالم کو اکثر مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

پیا جاتا ہے خونِ مزدور کا بزمِ امارت میں
مگر اس کو شرابِ ارغواں کہنا ہی پڑتا ہے

تبسّم! بادشاہی حرص و خواہش کی غلامی ہے
غلامِ نفس کو شاہِ زماں کہنا ہی پڑتا ہے!

ضیا جعفری

سید عنایت علی شاہ

○

فضا میں پھیلتے جاتے ہیں رات کے سائے
خدا کرے کوئی گاتی ہوئی سحر آئے

اک ایسا دور بھی آیا ہے درد مندوں پر
فقط خوشی کے تصور سے اشک بھر آئے

تبسمِ لبِ شیریں کہ جاگ اُٹھیں کلیاں
پیامِ زیرِ لب ایسا کہ پھول مُسکائے

ہم اپنی بیکسیِ غم پہ شب بہت روئے
کھلی جو چاندنی تم بار بار یاد آئے

بہارِ نو کی حکایت ہے لالہ زاروں میں
شرارِ گل سے نہ دامن ترا بھڑک جائے

یہ شبنمی سا بدن پیرہن کے سائے میں
کہ جیسے چاند کسی جھیل میں اُتر آئے

یہ کارواں بھی ہراساں ہے رات بھی تاریک
جو تیرگی ہو مسلسل کوئی کدھر جائے

ولی

سید شاہ ولی الرحمٰن کاکوی (بہاری)

○

حسن صبیح ہے غضب قہر ہے گیسوئے دراز
خالِ سیاہ ہے ستم فتنہ ہے چشمِ سحر ساز

نعمتِ لازوال ہے عشق نے کر دیا غنی!
جان ہے وقفِ بیخودی، دل ہے رہینِ سوز و ساز

اشک فشاں ہے چشمِ زار در پہ ہوں تیرے سجدہ بار
مذہبِ عشق میں یہی اپنا وضو ہے اور نماز

برق بھی بے قرار ہے ہائے رے تیری شوخیاں
حشر بھی پائمال ہے اُف رے ترا خرامِ ناز

دیر میں وُہ حرم میں وُہ مسجد و مے کدہ میں وُہ
عالمِ عشق میں نہیں فرقِ حقیقت و مجاز

میری جبینِ سجدہ ریز بن گئی جزوِ خاکِ در
تو بھی ہوئی نہ ملتفت تیری ادائے بے نیاز

شاہ و گدا کی کیا تمیز مسلکِ حُسن و عشق میں
ہے دلِ غزنوی یہاں بستۂ گیسوئے ایاز

آخرِ شب ہے اے ولی اور وُہ محوِ خواب ہیں
اپنا فسانۂ الم ختم کر اب زباں دراز

اختر اورینوی

پروفیسر اختر احمد

○

پہلے تو بہت نادان تھے وہ اب اُن کی شرارت کیا کہئے
اُس شوخ ادا کی باتوں میں جملوں کی لطافت کیا کہئے

تھم تھم کے وہ رونا آنکھوں کا اور زخم جگر کا ہنس دینا
آنا وہ تصور میں اُن کا اور چُپکے سے رخصت کیا کہئے

ہوتے وہ مرے کیا کہنا تھا حاصل نہ ہوا مجھ کو یہ شرف
کیا راز ہو افشا الفت کا اب حرف محبت کیا کہئے

اختر بھی تڑپتا ہے تیری چاہت کی کہانی کو سُن کر
دُکھ درد یہ سب کے سہتا ہے شاعر کی بھی حالت کیا کہئے

جگر

سید شاہ نصیر الدین (بہاری)

○

اس قدر ہیں سب کی نظروں میں جو بے توقیر ہوں
بانگ بے ہنگام ہوں یا آہ بے تاثیر ہوں

وہ ملا دل آہ جو کھلنے نہ پائے گا کبھی
گلشن ہستی میں گویا غنچۂ تصویر ہوں

زندگی بھر لاکھ تم دامن بچاتے ہی چلے
خاک ہو کر اب یہ ہمت ہے کہ دامنگیر ہوں

کیوں مٹاتا ہے فلک کیا دیکھتا سُنتا نہیں
صانع قدرت کی میں اک بولتی تصویر ہوں

کوئی کتنا ہی جگائے ہوں گا اب بیدار تک
بختِ خفتہ یعنی میں سوئی ہوئی تقدیر ہوں

تمنّا عمادی

مولانا محی الدین مجیبی (پھلواروی)

جس گلی سے لوگ لائے تھے بصد مشکل مجھے
لو وہیں پھر لے چلا کم بخت میرا دل مجھے

رُخ تو میرا پھیر دے اے موجِ دریا اس طرف
دُور ہی سے کچھ کہے شاید لبِ ساحل مجھے

خاک تو ہیں ہوں مگر خاکسترِ پروانہ ہوں
جانیے اک یادگارِ گرمیٔ محفل مجھے

ناتواں ہوں کس طرح دوڑوں ذرا تھم سارباں
کچھ اشارے کر رہا ہے پردۂ محمل مجھے

جاگتے میں کون آتا دل ہی کتنا چور کا
حشر پہنچا دیکھ کر سویا ہوا غافل مجھے

لوگ کرتے ہیں تمنّا کس لیے کسبِ ہنر
آتی تحصیلِ ہنر سے کیا ہوا حاصل مجھے

محمود عالم وفا

ٹھہر جا اے دلِ مضطر ذرا آہ و فغاں کر لوں
نگہ جب ظلم پر در پے ہے نعش کو بھی جواں کر لوں

غلط ہے جستجوئے آستاں اے غیرتِ سجدہ
مزا جب ہے کہ پیدا ہر جگہ اِک آستاں کر لوں

بہار آئی کھلے غنچے، ہنسا گُل، کونپلیں پھوٹیں
مگر اتنی کہاں فرصت کہ سیرِ بوستاں کر لوں

بڑے صناعِ عالم ہو بڑے مختارِ مطلق ہو
شاد و دست قدرت کے مرے دستِ پریشاں کو

زہے قسمت یہیں موجود ہر سامانِ وحشت ہے
جنوں میں کس لیے گھر چھوڑ کر جاؤں بیاباں کو

تمہاری بے بسی پر خود مجھے اب رحم آتا ہے
بڑے ناوک فگن نکلے نکالو نوکِ پیکاں کو

شمس منیری

پروفیسر حافظ شمس الدین

○

مرے غم الم کو نہ پوچھئے مجھے چین ہے نہ قرار ہے
ہے خزاں رسیدہ ریاضِ دل مجھے کیا امیدِ بہار ہے

اسے ڈھیرِ خاک کا جان کے نہ مٹا کہ پھر نہ ملے گا یہ
یہ نشانِ راہ ہے بیخبر کسی راہ رو کا مزار ہے

جو جلائے تجھ کو تو آگ ہے جو دکھائے راہ تو روشنی
فقط ایک فرق مجاز ہے وہی نُور ہے وہی نار ہے

کہو غم نصیب اسے یا خوشی، رہی شمسؔ حالتِ دل وہی
یہی وہ ریاض ہے واقعی کہ خزاں بھی جس کی بہار ہے

غم نہیں حسرت نہیں وحشت نہیں
وہ بھی کیا دل جس میں کیفیت نہیں

درد دل کہنے کی طاقت تھی کبھی
اور اب سننے کی بھی طاقت نہیں

کیا کرے گا کوئی عزت آپ کی
آپ اپنے دل میں جب عزت نہیں

ہے غزل میں شمسؔ اک لطفِ زباں
اس میں مضموں کی اگر وسعت نہیں

بیدلؔ

پروفیسر عبدالمنان

○

جھکی کس آستانے کی زمیں پر
نشاں خنجر کا ہے اپنی جبیں پر

لبوں پر آ گیا آخر تبسم
نہ زور ان کا چلا چینِ جبیں پر

وہ دل جو تھا حریفِ شوخیٔ ناز
ہوا قربان چشمِ سرمگیں پر

یہ الزام مصیبت تیرا ناصح
غلط ہے عشقِ راحت آفریں پر

کہا یہ کس نے میں مایوس لوٹا
غبارِ آستاں تو ہے جبیں پر

کیا جس وقت ضبطِ نالہ بیدلؔ
قیامت ہو گئی قلبِ حزیں پر

منیر نیازی

○

یہ لڑکی جو اس وقت سرِ بام کھڑی ہے
اُڑتا ہوا بادل ہے کہ پھولوں کی لڑی ہے

شرماتے ہوئے بندِ قبا کھولے ہیں اس نے
یہ شب کے اندھیروں کے مہکنے کی گھڑی ہے

اک پیرہنِ سُرخ کا جلوہ ہے نظر میں
اِک شکل نگینے کی طرح دل میں جڑی ہے

کھلتا تھا کبھی جس میں تمنا کا شگوفہ
کھڑکی وہ بڑی دیر سے ویران پڑی ہے

طاؤس کی آواز سے روشن ہے شبِ تار
صد نغمۂ ناہید یہ ساون کی جھڑی ہے

بشیر منذر

○

آکے بادیدۂ تر جائیں گے
تُجھ پہ کچھ تہمتیں دھر جائینگے

موت لے جائیگی مہ پاروں کو
ہائے یہ لوگ بھی مر جائینگے

کم ہوئیں وسعتیں ویرانوں کی
تیرے دیوانے کدھر جائیں گے

چشمِ لیلےٰ سے گرے ہیں تو کیا
دلِ مجنوں میں اُتر جائیں گے

درِ مے خانہ ذرا وا کردو
صورتِ دورِ گذر جائیں گے

دلِ بیتاب! کوئی بات نہیں
یہ زمانے بھی گذر جائیں گے

اُردو غزل اور متغزّلین

اس مضمون کے دو حصّے ہیں :

پہلے حصّہ میں غزل پر جتنے ممتاز اہلِ قلم کی آرا مل سکی ہیں ، انھیں یکجا کر دیا ہے۔ مولانا حالؔی اور کلیم الدین احمد کے مضامین اس لیے مفصّل دے دیے ہیں کہ حالؔی نے پرانی غزل سے روگردانی کا نعرہ بلند کیا اور کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن قرار دے دیا۔ بہرحال اس موضوع پر اتنی مخالف اور موافق آرا اکٹھی کر دی گئی ہیں کہ آپ بآسانی اردو غزل کے مستقبل کے بارے میں خود کوئی فیصلہ کر لیں گے۔

دوسرے حصّے میں تذکرہ نویسوں نے ممتاز شعرا کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، اُسے بھی یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ شاعر کے بارے میں تمام ناقدین کی آرا کا ایک نظر میں علم ہو جائے۔

(ادارہ)

اُردو غزل اور متغزّلین

حالی

(۱)

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ الا ماشاء اللہ۔ بلکہ جدا جدا خیالات الگ الگ بیتوں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ اس صنف کا زیادہ تر رواج موجودہ حیثیت کے ساتھ اول ایران میں اور کوئی ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں ہوا ہے۔ اگرچہ غزل کی اصل وضع جیسا کہ لفظ غزل سے پایا جاتا ہے محض عشقیہ مضامین کے لیے ہوئی تھی مگر ایک مدت کے بعد وہ اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہی۔ ایران میں اکثر اور ہندوستان میں چند شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جنھوں نے غزل میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تصوف اور اخلاق و مواعظ کو بھی شامل کر لیا ہے۔

اگرچہ اس لحاظ سے کہ غزل کی حالت فی زماننا نہایت ابتر ہے وہ محض ایک بے سود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ شاعر کو بسیط اور طولانی مسلسل نظمیں لکھنے کا ہمیشہ موقع نہیں مل سکتا اور اس کی قوت متخیلہ بے کار بھی نہیں رہ سکتی اس لیے بسیط خیالات جو وقتاً فوقتاً شاعر کے ذہن میں فی الواقع گزرتے ہیں یا تازہ کیفیات جو اس کا دل روزمرہ کسی واقعہ کو دیکھ کر یا کسی حالت کو دیکھ کر متکیف ہوتا ہے ان کے اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جا سکتا ہے اور چند بسیط خیالات جو ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ وہ غزل کے سلسلے میں بشرطیکہ ردیف اور قافیہ کی ناقابل برداشت قیدیں کسی قدر ہلکی کر دی جائیں منسلک ہو سکتے ہیں۔ ردیف اور قافیہ کی بابت اگر وقت نے مساعدت کی تو ہم پھر کسی موقع پر اپنی رائے ظاہر کریں گے۔ یہاں نفس غزل کے متعلق چند باتیں بیان کرتے ہیں۔

غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ قوم کے لکھے پڑھے اور اَن پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارہ رکھتے ہیں۔ وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں اور عید و تہوار کی مجلسوں میں، لہو و لعب کی صحبتوں میں تکیوں میں اور رنڈیوں میں برابر گائی جاتی ہیں۔ اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں۔ جو لوگ کتاب کے مطالعہ سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں۔ حسن اتفاق سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو جاتے ہیں۔ کوئی کلام یاد نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور مسلسل بیان منقطع ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اس قدر رائج اور مرغوب خاص و عام ہو اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے۔ اس لیے ہر نیک شعرا کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ لیکن غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔

غزل میں جو عام دلفریبی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ جو کان ٹھپے ٹھمری سے مانوس ہو جاتے ہیں وہ دھرپت اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے۔ داستان سننے والوں کی پیاس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی۔ بوالہوسی اور کامجوئی کی باتوں میں جو مزا ہے وہ خالص عشق و محبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اوباش والواط کی لولی لطیفوں میں جو چٹخارہ ہے وہ [illegible] باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہو سکتا ہے۔ جن مذاقوں پر ہزل و مطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا۔ جو لوگ مسی کاجل، کنگھی چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حسن فانی کی حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن زمانہ باآواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ ہوگی۔

غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا ہے یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں جیسے سعدی، رومی، خسرو، حافظ، عراقی، مغربی، احمد جام اور جامی وغیرہم۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا۔ ہم نے حیات سعدی میں کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ان کی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردہ میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شرابور تھے۔ ان کے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جس کو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل سن کر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے۔ وہ خال و خط کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بدمستی کو دنیادار مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں۔ وہ رندی و بدنامی و رسوائی کو صوفیوں کی دلق طمع اور زاہدوں کے زہد ریائی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کوئی گناہ مکر و ریا سے، کوئی حماقت غرور مال و جاہ سے، کوئی شرک خود پرستی و نفس پرستی سے اور کوئی دھوکا دنیا سے بڑھ کر نہیں بتاتے۔ ان کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں اور اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دل سے نکلا ہے۔

ان لوگوں کی غزل گو بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ ہو لیکن وہ اس حالت کے بالکل مناسب تھی جبکہ قوم نے دنیا کو اور دنیا نے قوم کو شکار کر رکھا تھا۔ ان کے اشعار ان لوگوں کے حق میں تازیانہ کا حکم رکھتے تھے جو حب دنیا اور حب جاہ میں منہمک، خدا سے غافل اور بادۂ نخوت میں مدہوش تھے۔ ان سے ظالم، طماع، حریص اور بخیل عبرت حاصل کرتے تھے۔ وہ ریاکار زاہدوں، واعظوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے۔ وہ سادہ لوح امیروں کو عیار فقیروں کے دام تزویر سے بچاتے تھے۔ وہ اہل اللہ اور ارباب عشق و محبت کو نفس امارہ کی چوریوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبہ کرتے تھے۔

اردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن عاشقانہ خیالات نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے غزل گویوں کے ہر طبقہ میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز گھٹتا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔ ہم بجائے اس کے کہ غزل گوئی کے موجودہ طریقہ پر نکتہ چینی کریں، زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عام طور پر اس کی اصلاح کے متعلق اہل وطن کی خدمت میں چند مشورے پیش کریں۔

(۱) غزل کے لیے یہ ایک ضروری سی بات ٹھہرا لی گئی ہے کہ اس کی بنا عشقیہ مضامین پر رکھی جائے اور حق یہ ہے کہ اگر غزل میں عشق و محبت کی چاشنی نہ رکھی جائے تو حالت موجودہ میں اس کا سرسبز اور مقبول ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسا شراب میں سرکہ بن جانے کے بعد سرور قائم رہنا۔ لیکن اصل اور نقل میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ جو کیفیت عشق میں ہے وہ نقش میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو غزلیں محض تقلیداً اتفاقاً

نکلی جاتی ہیں ان میں اتنا ہی اثر ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک بھانڈ کی نقل میں جو مجنوں یا فرہاد بن کر مجلس میں آئے۔ اثر قائل اور سامعین کی حالت کا تابع ہے۔ اگر قائل اور سامع میں یا کم سے کم صرف قائل کے دل میں فی الواقع کوئی کیفیت موجود ہے تو اس کیفیت کا بیان ضرور موثر ہوگا۔ جو شخص فی الواقع مظلوم یا مصیبت زدہ ہے جب وہ اپنی سرگزشت بیان کرے گا ضرور اس کے بیان سے لوگوں کے دل پر چوٹ لگے گی۔ لیکن اگر یہی بیان کسی ایسے شخص کی زبان سے سرزد ہوگا جس کی حالت خود اس کی تکذیب کرتی ہے تو اس سے سوائے اس کے کہ لوگوں کو ہنسی آئے اور کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا۔ پس ایک پارسا نوجوان جس کو ہوا و ہوس کی کبھی ہوا تک نہیں لگی یا ایک ستر برس کا پیر مرد جس میں ابوالہوسی کی قابلیت نہیں رہی ان کو ہرگز زیبا نہیں معلوم ہوتا کہ غزل میں شاہد بازی اور ہوا پرستی کے مضمون باندھ کر پہلا اپنے اوپر بہتان باندھے اور دوسرا اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرے۔

محبت کچھ ہوا و ہوس اور شاہد بازی و کام جوئی پر موقوف نہیں۔ بندہ کو خدا کے ساتھ، اولاد کو ماں باپ کے ساتھ، ماں باپ کو اولاد کے ساتھ، بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ، خاوند کو بی بی کے ساتھ، بی بی کو خاوند کے ساتھ، نوکر کو آقا کے ساتھ، رعیت کو بادشاہ کے ساتھ، دوستوں کو دوستوں کے ساتھ، آدمی کو جانور کے ساتھ، مکین کو مکان کے ساتھ، وطن کے ساتھ، ملک کے ساتھ، قوم کے ساتھ، خاندان کے ساتھ، غرض کہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دل بستگی ہو سکتی ہے۔ پس جبکہ عشق و محبت میں اس قدر احاطہ اور جامعیت ہے اور جبکہ عشق کا اعلان کم ظرفی اور معشوق کا پتہ بتانا بے غیرتی ہے تو کیا ضرور ہے کہ عشق کو محض ہوائے نفسانی اور خواہش حیوانی میں محدود کر دیا جائے اور ایسے سر مکتوم کو فاش کر کے اپنی تنگ ظرفی اور بے حوصلگی ظاہر کی جائے۔

اسی لیے ہماری یہ رائے ہے کہ غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر حاوی ہوں اور جہاں تک ہو سکے کوئی ایسا لفظ نہ آنے پائے جس سے کھلم کھلا مطلوب کا مرد یا عورت ہونا پایا جائے مثلاً کلاہ، چیرہ، دستار، جامہ، قبا، سبزہ و خط، مسیں بھیگنا، زرگر پسر، مطرب پسر، مغبچہ، ترسا بچہ وغیرہ وغیرہ یا مثلاً کرتی، مہندی، چوڑیاں، چوٹی، موباف، آرسی، انجن وغیرہ۔

اگرچہ جیسا کہ حیات سعدی کے خاتمہ میں ہم نے مفصل بیان کیا ہے امرد کا مطلوب مرد کو قرار دینا جو ایران اور ہندوستان کی شاعری میں مروج ہے یہ محض ایک غلط فہمی اور قومی حمیت کے خیال پر مبنی ہے نہ کہ حقائق و واقعات پر۔ لیکن پھر بھی یہ ایک ایسا قبیح اور نالائق دستور ہے جو قومی اخلاق کو داغ لگاتا ہے لہٰذا اس کو جہاں تک جلد ممکن ہو ترک کرنا چاہیے اور اس بات کا خیال بالکل چھوڑ دینا چاہیے کہ ایران اور ہندوستان کے تمام شعرائے نامور اسی طریقہ پر غزل کہتے چلے آئے ہیں۔ ہر زمانہ کا اقتضا الگ ہوتا ہے۔ جو فحش اور بے حیائی کی باتیں ایران اور ہندوستان کے بڑے بڑے استادوں کے کلام میں موجود ہیں، اگر ہم آج ویسی باتیں ان کی تقلید کریں تو قانوناً مجرم ٹھہرتے ہیں۔ پس جیسا ہم نے ان کی بہت سی خرافات مواخذۂ عدالت کے خوف سے چھوڑ دی ہیں ان کی ایک اور خرافات محض عقل اور اخلاق کے حکم سے بھی چھوڑنی چاہیے۔

اسی طرح غزل میں ایسے الفاظ استعمال کرنے جو عورتوں کے لوازمات اور خصوصیات پر دلالت کریں اس قوم کی حالت کے بالکل نامناسب ہیں جو پردہ کے قاعدہ کی پابند ہو کیونکہ اگر معشوق کوئی منکوحہ یا مخطوبہ ہے تو اس کے حسن و جمال کی تعریف کرنی اور اس کے کرشمہ و ناز و انداز کی تصویر کھینچنی گویا اپنے ننگ و ناموس کو اپنوں اور بیگانوں سے آشکار و ظاہر کرنا ہے اور اگر کوئی بازاری بیسوا ہے تو اپنی نالائقی اور بے حیائی کا ڈھنڈورا پیٹنا ہے۔ اسی بنا پر ایران میں جتنے متانت اور برگزیدہ اور اعلیٰ درجے کے غزل گو گزرے ہیں ان کی غزل میں عورتوں کی خصوصیات اس قدر کم پائی جاتی ہیں کہ گویا بالکل نہیں ہیں اور اتنی بات اب تک ہندوستان میں بھی موجود ہے کہ غزل میں مطلوب کبھی مرد کو اور کبھی عورت کو قرار دیتے

اور کبھی مرد کی اور کبھی عورت کی خصوصیات کا بھی ذکر کرتے ہیں، لیکن کبھی مطلوب کے لیے افعال یا صفات مونث نہیں لاتے بلکہ ہمیشہ مذکر لاتے ہیں۔ مثلاً یوں کبھی نہیں کہتے کہ وہ روزنِ دیوار سے جھانکتی تھی، یا وہ پری ہمارا دل لے گئی، یا وہ آرسی میں منہ دیکھتی تھی، یا وہ بالے پہن رہی تھی، یا وہ اپنی صورت کی متوالی ہے، یا وہ عاشق کا دل جلانے والی ہے، بلکہ ایسی حالتوں میں بھی افعال و صفات ہمیشہ مذکر ہی لاتے ہیں حالانکہ مقام تانیث کا مقتضی ہوتا ہے۔ مثلاً ذوقؔ کہتے ہیں ؎

جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزنِ دیوار سے
وائے قسمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا

یا امانت لکھنوی کہتے ہیں ؎

شانوں میں وہ پری زلف کو وا کیا کرتا
عمر زنگانوں کو گرفتارِ بلا کیا کرتا

غرض کہ کسی اردو غزل گو نے معشوق کے لیے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے فعل یا صفت مذکر (اصل، مونث) استعمال نہیں کی۔

اگر معشوق کو اطلاق کی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی خصوصیت رجال یا نسا کی غزل میں ذکر نہ کی جائے تو اس صورت میں افعال و صفات کا مذکر لانا بالکل قاعدہ کے موافق ہوگا۔ تمام دنیا کی زبانوں میں یہ قاعدہ عام معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی حکم مطلق انسان کی نسبت لگایا جاتا ہے اور مرد یا عورت کی تخصیص مقصود نہیں ہوتی تو گو نوع انسان میں ذکور و اناث دونوں داخل ہیں مگر اس حکم کا موضوع ہمیشہ فردِ کامل یعنی مذکر قرار دیا جاتا ہے نہ مونث۔ مذہب میں، فلسفہ میں، طب میں، اخلاق میں اور تمام علوم و قوانین میں یہی قاعدہ عموماً جاری ہے لیکن معشوق کا کبھی چہرہ یا قبا یا سبزۂ خط کے ساتھ اور کبھی چوٹی، مباف، آرسی اور چوڑیوں کے ساتھ ذکر کرنا اور باوجود اس کے افعال و صفات کو ہمیشہ مذکر لانا اس کے یہ معنے ہوں گے کہ معشوق نہ مرد ہے اور نہ عورت بلکہ زنانہ ہے یا ہیجڑا۔

ایسے اشعار جن میں عشق کا بیان ایسے لفظوں میں کیا گیا ہو جو محبت کے عام مفہوم پر حاوی ہوں یا جو محض عشقِ روحانی یا عشقِ الٰہی پر محمول ہو سکیں اور جن سے مطلوب کا مرد یا عورت ہونا مطلقاً نہ پایا جائے، کیا فارسی اور کیا اردو دونوں زبانوں کی غزل میں بکثرت موجود ہیں۔ خصوصاً شعرائے متصوفین کے کلام میں زیادہ تر اسی قبیل کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ پس غزل میں ہمیشہ کے لیے ایسا التزام کرنے کی خواہش کرنی کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو تکلیف مالایطاق سمجھا جائے۔

(۲) جس طرح عشقیہ مضامین غزل کے خمیر میں داخل ہیں، اسی طرح خمریات یعنی شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر اور نیز زہاد اور تمام اہلِ ظاہر پر طعن و تعریض کرنی، اپنی بے خودی و توبہ شکنی و خرابات نشینی پر فخر کرنا اور اہلِ شرع اور اہلِ تقویٰ کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے اور اسی قسم کی اور باتیں جو عقل و شرع کے خلاف ہوں یہ مضامین بھی غزل کے اجزائے غیر منفک قرار پا گئے ہیں۔ سب سے پہلے غزل میں یہ طریقہ شعرائے متصوفین نے جو اہل اللہ اور صاحبِ باطن سمجھے جاتے ہیں اختیار کیا تھا جیسے سعدیؔ، رومیؔ، حافظؔ اور خسروؔ وغیرہم۔ چونکہ ان لوگوں کی غزل نے ایران اور ہندوستان میں زیادہ رواج اور حسنِ قبول پایا اور خاص کر خواجہ حافظ کی غزل جس میں ان مضامین کی بہتات سب سے بڑھ کر ہے حد سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی، اس لیے متاخرین نے بھی ان کی تقلید سے یہی شیوہ اختیار کر لیا مگر ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں نے جو ایسے مضامین باندھے ہیں اس قدر غلو کیا ہے اس کا منشا کیا تھا۔

فقہا اور اہلِ ظاہر ہمیشہ دو فرقوں کے سخت مخالف رہے ہیں۔ ایک اہلِ باطن کے دوسرے اہلِ رائے کے۔ فقہا کے گروہ سے

ان دونوں گروہوں کو ہمیشہ سخت نقصان پہنچتے رہے ہیں۔ قتل کیے گئے ہیں، دار پر چڑھائے گئے ہیں، مشکیں بندھی ہیں، کوڑے کھائے ہیں، قیدیں بھگتی ہیں، جلاوطن کیے گئے ہیں، کتابیں جلائی گئی ہیں اور کیا کیا کچھ ہوا ہے جب کہ فقہا کی مخالفت کا ان لوگوں کے ساتھ یہ حال تھا تو یہ بھی اپنی تصنیفات میں نثر ہو یا نظم خوب دل کے بخارات نکالتے تھے۔ بقول شخصے "کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان" فقہا و واعظین ان کے اقوال و افعال پر گرفت کرتے تھے، انھوں نے ان کے اخلاق کی قلعی کھولنی شروع کی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلافِ شرع کام کرتے ہیں انھوں نے کہا شراب خوری و قمار بازی جو اکبر الکبائر ہیں وہ بھی جو فروشی و گندم نمائی سے بہتر ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ خلافِ شرع باتیں کہتے ہیں، انھوں نے کہا علانیہ کفر بکنا اس سے بہتر ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان پر اسلام۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے انھوں نے کہا کہ اوروں کو ہدایت کرنے اور آپ گمراہ رہنے سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم حقوقِ الٰہی ادا نہیں کرتے انھوں نے کہا کہ تم حقوقِ عباد میں خیانت کرتے ہو۔ الغرض شعرائے متصوفین نے جو اہلِ ظاہر پر خردہ گیریاں کی ہیں وہ اسی قسم کی تعریضات اور معارضات ہیں۔

اس کے سوا ان لوگوں کی غزل میں اکثر شراب و ساقی و جام و صراحی اور ان کے لوازمات اور خلافِ شرع الفاظ مجاز و استعارہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یا تو اس خیال سے کہ دوست کا راز اغیار پر ظاہر نہ ہو یا اس نظر سے کہ لوگوں کا حسنِ ظن جو رہزنِ طریقت ہے اس سے محفوظ رہیں یا اس لیے کہ عشق و محبت کی بطرز اس آزادانہ اور رندانہ گفتگو میں بہ نسبت سنجیدہ اور مؤدب گفتگو کے خوب کھلتی ہے اور یا اس غرض سے کہ حریفوں کو چھیڑ چھیڑ کر اور زیادہ بھڑکائیں اور ان کی زجر و ملامت جو بے گناہ ملزموں کو تحسین و آفریں سے زیادہ خوشگوار ہوتی ہے مزے لے لے کر سنیں، روحانی کیفیات کو شراب و شاہد کے پیرایہ میں بیان کرتے تھے۔ سب سے اخیر درجہ کا ثبوت مولانا روم کی اس رباعی سے ہوتا ہے ؎

دی بر سر کوئے ز آں غارت کردم	مر پاکاں را جذب زیارت کردم
شکرانہ آنکہ روزہ خوردم رمضان	در عید نماز بے طہارت کردم

شاہ ولی اللہ صاحب نے اس رباعی کی شرح لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں رمضان میں روزے کھانے کے یہ معنے ہیں کہ جب مجاہدہ نے مشاہدہ تک نوبت پہنچ گئی تو ریاضت ترک کر دی گئی اور نماز بے طہارت سے یہ مراد ہے کہ جب وصل کی عید میسر آ گئی اور جدائی کا الم جاتا رہا۔ اب حضوری سینہ کیف جو کہ حقیقتِ صلوٰۃ ہے ہر وقت رہنے لگی۔ یہاں تک کہ ظاہری طہارت اور عدمِ طہارت اور جاگتے اور سوتے غرض کہ ہر حالت میں دولتِ حضوری موجود ہے۔ خواجہ حافظ کا یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے ؎

پیرِ ما گفت خطا بر قلمِ صنع نہ رفت
آفریں بر نظرِ پاک خطا پوشش باد

دوسرے مصرع میں خطا پوش کے لفظ سے قلمِ صنع کی خطا پوشی کا خیال ذہن میں گزرتا ہے مگر فی الحقیقت یہ مطلب نہیں ہے بلکہ انسان کی عیب پوشی مقصود ہے کیونکہ قلمِ صنع میں کبھی خطا نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ اس نے لکھ دیا ہے وہ اٹل ہے اور اس سے انسان کا مجبور ہونا اور اس لیے اس کا بے خطا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا اشعار سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ بزرگوار قصداً ایسے الفاظ برتتے تھے جن سے اہلِ ظاہر کو نکتہ گیری کرنے کا موقع ملے۔ اسی لیے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

ان بزرگوں کے سوا بعضے شعرا ایسے بھی گذرے ہیں جو فی الواقع شراب پینے کے عادی تھے اور نشہ یا خمار کی حالت میں جو کیفیت ان کے دل پر گزرتی تھی یا جو اثر ان کی طبیعت یا اخلاق پر ہوتا تھا اس کو شعر میں بیان کرتے تھے۔ چونکہ شاعری کا جزوِ اعظم جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، یہ ہے کہ اس میں جو خیال باندھا جائے اس کی بنیاد اصلیت پر ہونی چاہیے اس لیے اصولِ شاعری کے موافق شراب کباب کے مضمون باندھنا صرف ان لوگوں کا حق ہونا چاہیے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات خمریات کے پیرایہ میں بطور مجاز و استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں ورنہ وہ قدما کے ایسے ہی مقلد سمجھے جائیں گے جیسا بندر انسان کا ہوتا ہے۔ نیز واعظ و زاہد وغیرہ کو تاڑنا اور ان پر نکتہ چینی کرنی انہی لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع ان کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت کی ہو۔ ہاں باوجود نہ ہونے کسی قسم کی مخالفت کے صرف ایک صورت سے واجبی طور پر ایسے مضامین باندھے جا سکتے ہیں۔ یعنی نکتہ چینی ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے معلوم ہو کہ محض ریا و مکر و سالوس کی برائی بیان کرنا مقصود ہے نہ کہ زہاد اور واعظین کی ذات پر حملہ کرنا۔ کیونکہ رذائل کی برائی اور فضائل کی خوبی بغیر اس کے دل نشین نہیں کی جا سکتی کہ کسی شخص یا گروہ کو ان کا موضوع فرض کر لیا جائے اور معقولات کو محسوسات کے پیرایہ میں ظاہر کیا جائے۔ ظلم اور عدل کا بیان واضح طور پر اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ظالم یا منصف بادشاہ کی مذمت یا تعریف کی جائے اور نامردی یا بہادری کی تصویر یونہی دکھائی جا سکتی ہے کہ ان کو کسی بزدل یا بہادر کے قالب میں ڈھالا جائے لیکن اس صورت میں ضرور ہے کہ واعظ و زاہد وغیرہ کی کسی ایسی صفت کی طرف جو عقلاً یا شرعاً قابلِ الزام ہو کچھ اشارہ کیا جائے ورنہ کہا جائے گا کہ نیکوں پر نہ اس لیے کہ وہ قابلِ الزام ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ نیک ہیں حملہ کیا جاتا ہے۔ یہاں بطورِ مثال کے ہم شیخ ابراہیم ذوق کے دو شعر لکھتے ہیں ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اس شعر میں کسی قدر اس خصلت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جو اکثر زاہدوں اور عابدوں میں ہوتی ہے کہ اوروں کو ذرا ذرا سے قصور پر ملامت کرتے ہیں اور اپنے ظاہری احکام کی پابندی پر مغرور ہو کر باطن کی اصلاح سے غافل رہتے ہیں لہٰذا اس طرزِ بیان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا مگر دوسری جگہ وہ اس طرح فرماتے ہیں ؎

ذوق زیبا ہے جو ہو ریشِ سفید شیخ پر
وسمۂ آبِ بنگ سے مہندی مئے گلرنگ سے

اس شعر میں شیخ کا کوئی گناہ یا قصور سوا اس کے کہ شیخ شیخ ہے نہیں جتلایا گیا اور شعر میں اس کے سوا اور کوئی خوبی نہیں رکھی گئی کہ ایک مقدس آدمی پر دو پھبتیاں کہہ کر رندوں اور شرابیوں کی ضیافتِ طبع کی جائے۔ ایسے اشعار ہمارے شعرا کے کلام میں بکثرت پائے جاتے ہیں اور ایسے شعروں کو اگر ہم اپنے شعرا کا حد سے زیادہ ادب کریں تو سعدی اور سوزنی کی ہزلیات سے زیادہ وقعت نہیں دے سکتے۔

(۳) مذکورہ بالا مضامین کے سوا اور جس بات کا سچا جوش اور ولولہ دل میں اٹھے خواہ اس کا منشا خوشی ہو یا غم، یا حسرت، یا ندامت، یا ہجر یا شکایت، یا صبر یا رضا، یا قناعت، یا توکل، یا رغبت، یا نفرت، یا رحم، یا انصاف، یا غصہ یا تعجب، یا امید یا ناامیدی، یا شوق، یا انتظار، یا حبِ وطن یا قومی ہمدردی، یا رجوع الی اللہ یا حمایتِ دین و مذہب، یا دنیا کی بے ثباتی اور موت کا خیال یا کوئی اور جذبہ جذباتِ انسانی میں سے اس کو بھی

غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

اگرچہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق و محبت کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا نے اس کو ہر مضمون کے لیے عام کر دیا ہے اور اب بھی اس صنف کو محض مجازاً غزل کہا جاتا ہے۔ پس ہر قسم کے خیالات جو شاعر کے دل میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوں وہ غزل یا رباعی یا قطعہ میں بیان ہو سکتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ جو خیالات اگلوں نے زمانہ کے اقتضا سے یا اپنے جذبات کے جوش میں ظاہر کیے ہیں ہم بھی وہی راگ گاتے رہیں اور انہی کے خیالات کا اعادہ کرتے رہیں۔ نہیں بلکہ ہم کو چاہیے کہ اپنا غزل کو خود اپنے خیالات اور اپنے جذبات کا آرگن بنائیں۔ ممکن ہے کہ اگلوں میں سے کسی نے دنیا کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے اور کوشش کرنے کو عبث اور فضول بتلایا ہو لیکن ہمارے دل میں اس خیال کی حقارت ہو، یا انھوں نے اس کے برعکس پاؤں توڑ کر بیٹھنے کو نامردی اور بے غیرتی کی بات سمجھا ہو لیکن ہم میں سے کسی کے دل پر اس کے برخلاف حالت طاری ہو۔ دونوں صورتوں میں ہمارے منہ سے وہی صدا نکلنی چاہیے جو ہمارے دل سے اٹھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمیں پر ایک وقت ایسا گزرے کہ مثلاً کوشش و تدبیر ہم کو محض بے سود و لاحاصل معلوم ہو اور دوسرے وقت ہمارے ہی دل میں ایک ایسا جوش پیدا ہو کہ پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دینے کا ارادہ کریں۔ ہم کو دونوں حالتوں کی تصویر اپنے اپنے موقع پر بے کم و کاست کھینچ دینی چاہیے۔ اس سے نہ صرف فطرت انسانی کے دقائق و غوامض اور جو انقلاب کہ اس کی طبیعت میں آناً فاناً پیدا ہوتے ہیں وہی منکشف ہوں گے بلکہ قومی اخلاق پر بھی عمدہ اثر ہوگا، کیونکہ جب تک ہر چیز کا اچھا اور برا دونوں پہلو نہ دکھلائے جائیں تب تک اعتدال کی خوبی جلوہ گر نہیں ہوتی۔ مثلاً صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

قناعت کن بہ نانِ خشک تا بے آرزو گردی
کہ خواہش ہائے الوانست نعمت ہائے الوان را

دوسری جگہ یہی صاحب کہتے ہیں ؎

حرفِ بیکاری مگرداں روزگارِ خویش را
پردۂ روئے توکل ساز کارِ خویش را

ظاہر ہے کہ جب تک دونوں مختلف خیال ملحوظ نہ رکھے جائیں تب تک قناعت کا وہ درجہ جو آسانی اور حرص کے بیچوں بیچ واقع ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ اخلاقی مضامین سے غزل میں وہ گرمی پیدا نہیں ہو سکتی جو عشقیہ مضامین میں ہوتی ہے۔ جو اثر شوق و آرزو اور دردِ جدائی اور کاوشِ انتظار اور رشکِ اغیار کے بیان میں ہے وہ واعظانہ پند و نصیحت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بے شک اخلاقی مضامین کو موثر پیرایہ میں بیان کرنا نہایت مشکل کام ہے اور بلاشبہ غزل جس میں سوز و گداز نہ ہو اور کچھ چلبلا اور چنچل پن نہ ہو دونوں میں کچھ کشش اور گیرائی نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارے معاصرین کے لیے سوز و گداز کا اس قدر مصالحہ موجود ہے جو صدیوں تک ختم نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے۔ آج کل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں جا بجا نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں۔ تناور درخت زمین کی تمام طاقت چوس رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تمام پودے جو ان کے گرد و پیش ہیں سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں اور یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو ڈبو کر گئے

رہ جائے گی بلکہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ ارض پہ پانی پھرتا نظر آتا ہے۔ اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ کسی واقعہ کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا۔ کبھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ بس اب کچھ نہیں۔ اس سے دلچسپ مسلسل غزل کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے۔ عشق و عاشقی کی رنگینیاں اقبال مندی کے زمانہ میں زیبا تھیں۔ اب وہ وقت گیا۔ عیش و عشرت کی رات گزر گئی اور صبح نمودار ہوئی۔ اب کالنگڑے اور بہاگ کا وقت نہیں رہا۔ اب جوگیے کی الاپ کا وقت ہے۔

اس کے سوا بڑے بڑے استادوں نے اکثر مسلسل غزلیں بھی لکھی ہیں جن میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے بلکہ ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے۔ ایسی غزلیں اگر کوئی لکھنی چاہے تو ان میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں مثلاً ہر ایک موسم کی کیفیت، صبح اور شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، میلے تماشوں کی چہل پہل، قبرستان کا سناٹا، سفر کی روئداد، وطن کی وابستگی اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں مسلسل غزل میں بہت خوبی سے بیان ہو سکتی ہیں۔

الغرض غزل کو باعتبار زمین اور خیالات کے جہاں تک ممکن ہو وسعت دینی چاہیے۔ شعر کی لوگوں کو ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ بھوک میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو اگر ہمیشہ طرح بہ طرح کے کھانے میسر نہ آئیں تو وہ تمام عمر ایک ہی کھانے پر قناعت کر سکتا ہے لیکن شعر یا راگ میں جب تک تلون اور تنوع نہ ہو ان سے جی اُکتا جاتا ہے۔ جو گویا صبح شام، رات اور دن بھیرویں ہی الاپے جائے اس کا گانا اجیرن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شعر میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے مضامین سنتے سنتے نفرت ہو جاتی ہے ؎

مکرر گرچہ شہد آمیز باشد

طبیعت را ملال انگیز باشد

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس طرح شعر میں جدت پیدا کرنی اور ہمیشہ نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی کرنی شاعر کا کمال ہے اسی طرح ایک ایک مضمون کو مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمال شاعری میں داخل ہے لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ کی صورت میں دکھایا جاتا ہے تو اس میں تازگی باقی نہیں رہتی۔ ہر مضمون کے چند محدود پہلو ہوتے ہیں۔ جب وہ تمام پہلو ہو چکتے ہیں تو اس مضمون میں تنوع کی گنجائش نہیں رہتی۔ اب بھی اگر اسی کو چھیڑے چلے جائیں گے تو بجائے تنوع کے تکرار اور اعادہ ہونے لگے گا۔ بہروپیا دو چار روپ بھر کر لوگوں کو دھوکے میں ڈال سکتا ہے مگر پھر اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ہر کوئی اس کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ بہروپیا ہے۔ ہم لوگ جب غزل لکھ کر مشاعرہ میں جاتے ہیں تو اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے الگ اچھوتے مضمون باندھ کر لے چلے ہیں مگر غزل کو دیکھیے تو وہی انگریزی مٹھائی کا بکس ہے کہ مٹھائیوں کی شکلیں مختلف ہیں لیکن مزا سب کا ایک ہے۔ فرض کرو کہ مختلف شکلوں کے متعدد سانچے تیار ہیں، کوئی مدور ہے، کوئی مستطیل، کوئی مثلث، کوئی مربع، کوئی مسدس اور کوئی مثمن، اب ہر سانچے میں موم پگھلا کر ڈالو۔ ظاہر ہے کہ ہر سانچے سے موم نئی شکل پر ڈھل کر نکلے گا۔ بعینہٖ ایسا ہی حال غزل کا ہے۔ مضمون وہی معمولی ہیں مگر بحر و ردیف و قافیہ کے اختلاف سے مختلف شکلیں پیدا کر لیتے ہیں۔

ایک مشہور شاعر کا دیوانِ غزلیات اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس میں "چاک گریباں" کا مضمون مفصلہ ذیل صورتوں میں بندھا ہوا ہے۔

۱۔ اے جنوں ہم گریباں تو چاک کر چکے اب کیا کریں کوئی اور شغل بتا۔

۲- لوگ پھر جامہ دری کرنے لگے اور ہمارا ہاتھ پھر گریبان تک جانے لگا۔

۳- بہار کے دن قریب آ گئے سو گریبان خود بخود پھٹا جاتا ہے۔

۴- اگر بہار میں میری پوشاک چھین لی جاتی تو بدن پر نہ دامن نظر آتا نہ گریبان۔

۵- اگر عقل کی پابندی نہ ہوتی تو ہم دامن اور گریبان سب پھاڑ ڈالتے۔

۶- وہ ہاتھ چھڑا کر چلا گیا میں بھی اب گریبان کو پھاڑ کر چھوڑوں گا۔

۷- اے جنوں ہم جدائی میں گریبان پھاڑتے ہیں تو ساری رات اس کے تار گنتا رہ۔

۸- اس کی تحریر سے میں ایسا دیوانہ ہوا کہ پیراہن چاک کر ڈالا۔

۹- اس کی چست قبا کا دامن دیکھ کر گریبان پھٹتے ہیں۔

۱۰- اے جنوں دامن کی طرح گریبان کے بھی لتے لے۔

۱۱- دیکھیے ہم کب تک کپڑے پھاڑتے ہیں اور کب تک ہم کو جنوں سوزن کی طرح عریاں رکھتا ہے۔

۱۲- اے جنوں اب جامہ دری مت کر ہم دامن کو پھاڑ کر کب تک گریبان میں رفو کرتے رہیں۔

۱۳- بہار میں ہاتھ کیسے بیکار رہیں آؤ گریبان ہی چاک کریں۔

۱۴- اے جنوں گریبان مجھ کو پھانسی سے بھی زیادہ تنگ کرتا ہے۔ اس کی دھجیاں اڑا دے۔

۱۵- اے جنوں اب کے سال بہار میں گریبان کو ایسا چاک کر کہ کسی سے رفو نہ ہو سکے۔

۱۶- تم تو ہاتھ سے دامن چھڑا کے نکل گئے ہم اپنا گریبان چاک کر کے نکل گئے۔

۱۷- جنوں جو حد سے بڑھا تو گریبان چاک ہو کے دامن سے نکل گئے۔

۱۸- مجھے چاک گریبانوں پر حسرت آتی ہے کہ کیسے دامنِ صحرا کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔

۱۹- ہمارے ہاتھ جنوں کی بدولت زوروں پر ہیں کہ نئے نئے گریبان چاک ہوتے ہیں۔

۲۰- اے جنوں تیرے ہاتھوں سے کتنا تنگ ہوں۔ روز نئے گریبان کہاں سے لاؤں۔

۲۱- اس کے عاشق ہمیشہ گریبان چاک رکھتے ہیں۔ گل کے گریبان میں کہیں بھی رفو ہے؟

۲۲- بہار آئی اور جنوں پھر کپڑے پھاڑنے لگا کتنے ہی گریبان چیتھڑے ہو کر اڑ گئے۔

۲۳- اے جنوں تجھ کو سودائے زلف کی قسم ہے جو گریبان کا ایک تار بھی بیکار جانے دے۔

جس دیوان سے ہم نے یہ ایک مضمون کے ۲۳ اسلوب بیان نقل کیے ہیں یہ کچھ اوپر دو سو صفحہ کا دیوان ہے۔ جب ایک مختصر دیوان کا یہ حال ہے تو اردو کے تمام دیوانوں میں دیکھنا چاہیے کہ یہی ایک مضمون کتنی شکلوں میں باندھا گیا ہوگا اور اگر فارسی کے دواوین کو بھی ان میں شامل کر لیا جائے تو میں خیال کرتا ہوں کہ اسی ایک مضمون کے اشعار سے کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں حالانکہ مضمون ایسا تنگ ہے کہ اس میں ایک دو اسلوب سے زیادہ گنجائش نہیں معلوم ہوتی۔ اسی سے قیاس ہو سکتا ہے کہ غزل کے وہ معمولی مضامین جن میں اس مضمون کی نسبت زیادہ پہلو نکل سکتے ہیں ان کی کہاں تک نوبت پہنچی ہوگی۔ جیسے جفائے یار، رشکِ اغیار، شوقِ وصل، رنجِ ہجراں، زلفِ پریشان،

چشم فتان، بت پرستی، توبہ شکنی، رندی و بادہ خواری وغیرہ وغیرہ۔ اس میں بالکل مبالغہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر تمام فارسی و اردو کی غزلیات کا خلاصہ کیا جائے اور تکرارات کو چھوڑ کر محض اصلی مضامین چھانٹے جائیں تو سو سوا سو صفحہ سے زیادہ کل مضامین کی مقدار نہ نکلے گی اور اگر یہ التزام کیا جائے کہ ہر ایک مضمون جتنے عمدہ پہلوؤں سے باندھا گیا ہو ان سب کو انتخاب کر لیا جائے تو بے شک اس سے کسی قدر مقدار بڑھ جائے گی مگر اکثر عمدہ پہلو قدما کے کلام میں نکلیں گے اور ان کے فضلات متاخرین کے کلام میں۔ یہی "چاک گریباں" کا مضمون جو متاخرین میں سے ایک نے ۲۲ طرح پر باندھا ہے میر تقی کے ہاں اس طرح بندھا ہوا ہے ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مجھ کو ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر "چاک گریباں" کا مضمون باندھا ہو۔

مذکورۂ بالا تقریر سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ متاخرین قدما کے کلام سے کوئی بات اخذ نہ کریں اور جو مضمون وہ باندھ گئے ہیں اب اس کو کسی پہلو سے نہ باندھیں یا اپنے باندھے ہوئے مضامین کا پھر اعادہ نہ کریں۔ کیونکہ بغیر اس کے نہ صرف شعر میں بلکہ ہر فن اور ہر صناعت میں کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ کعب ابن زہیر جو ایک مخضرمی شاعر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مداح ہے وہ کہتا ہے ؎

مَا أَرَانَا نَقُولُ إِلَّا مُعَارًا　　أَوْ مُعَادًا مِنْ قَوْلِنَا مَكْرُورًا

(یعنی ہم جو کچھ کہتے ہیں یا تو اوروں کے کلام سے مستعار لے کر کہتے ہیں یا اپنے ہی کلام کو بار بار دہراتے ہیں)

پس جب آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے شعر کا ایسا خیال تھا تو ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ قدما کی خوشہ چینی سے ہم کو استغنا حاصل ہے یا ہم کو یہ قدرت ہے کہ کوئی مضمون ایک دفعہ باندھ کر پھر اس کا اعادہ نہ کریں۔

عربی میں دو متناقض مثلیں مشہور ہیں۔ ایک یہ ہے کہ:

كَمْ تَرَكَ الْأَوَّلُ لِلْآخِرِ　　"یعنی اگلے بہت کچھ پچھلوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں"

اور دوسری یہ مثل ہے کہ

مَا تَرَكَ الْأَوَّلُ لِلْآخِرِ شَيْئًا　　"یعنی اگلوں نے پچھلوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا"

ان دونوں مثلوں میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ اگلے بہت سی ادھوری باتیں چھوڑ گئے ہیں تاکہ پچھلے ان کو پورا کریں لیکن انھوں نے پچھلوں کے لیے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس کا نمونہ موجود نہ ہو۔

اس بات پر تمام قوم کا اتفاق ہے کہ پچھلا شاعر جو کسی پہلے شاعر کے کلام سے کوئی مضمون اخذ کر کے اس میں کوئی ایسا لطیف اضافہ یا تبدیلی کر دے جس سے اس کی خوبی یا متانت یا فصاحت زیادہ ہو جائے وہ در حقیقت اس مضمون کو پہلے شاعر سے چھین لیتا ہے۔ مثلاً سعدی شیرازی کہتے ہیں ؎

از ورطۂ ما خبر ندارد　　آسودہ کہ بر کنارہ دریاست

اسی مضمون کو خواجہ حافظ نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل　　کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

ظاہر ہے کہ حافظ نے اس مضمون میں گویا اس کمی کو پورا کر دیا ہے جو شیخ کے بیان میں رہ گئی تھی۔ پس کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نے شیخ سے یہ مضمون چھین لیا اسی مطلب کو نظیری نے یوں تعبیر کیا ہے ؎

بر زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نوا گران نخوردہ گزند را چہ خبر

اگرچہ نظیری نے اصل مضمون پر کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا جس کے لحاظ سے کہا جائے کہ خواجہ حافظ سے مضمون چھین لیا لیکن اس نے مضمون کو ایسے بدیع اسلوب میں ادا کیا ہے کہ بالکل ایک نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔

ایک روز خواجہ حافظ کا یہی شعر ایک موقع پر پڑھا گیا۔ ایک صاحب جو شعر کا صحیح ذوق رکھتے تھے یہ شعر سن کر بولے کاش دوسرے مصرع میں بھی اسی قسم کی مشکلات اور سختیوں کا بیان ہوتا جیسی کہ پہلے مصرع میں بیان کی گئی ہیں اور اس بات کا کچھ اظہار نہ کیا جاتا کہ بے درد ہمارے حال کی کیا خبر ہے تاکہ اپنے حال میں مبتلا ہونے اور غیر کے تصور سے ذہول (ذہول: اصل) ہونے کا زیادہ ثبوت ہوتا۔ میں نے غالب مرحوم کا یہ شعر پڑھا ؎

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است

وہ یہ شعر سن کر پھڑک گئے اور کہا کہ ہاں بس میرا یہی مطلب تھا۔ ان مثالوں سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ قدما کے کلام میں بعض اوقات کوئی کمی رہ جاتی ہے جس کو پچھلے پورا کر دیتے ہیں کبھی قدما ایک مضمون کو کسی خاص اسلوب میں محدود سمجھ لیتے ہیں۔ متاخرین اس کے لیے ایک نرالا اسلوب پیدا کر دیتے ہیں اور کبھی متاخرین قدما کے اسلوب میں سے ایک خوبی کم کر کے ایک دوسری خوبی بڑھا دیتے ہیں اور اس سے شاعری کو بے انتہا ترقی ہوتی ہے۔ پس یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ شاعر اپنے محدود فکر اور تخیل پر بھروسہ کر کے قدما کی خوشہ چینی سے دست بردار ہو جائے۔

شفائی صفاہانی یا متاخرین شعرائے ایران میں سے کوئی اور شخص غزل میں کہتا ہے ؎

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن دوست
چیزے فزوں کند کہ تماشا بما رسید

قائل کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ ہماری پسند کے لیے معشوق کے معمولی بناؤ سنگار کافی نہیں ہیں۔ پس مشاطہ کو چاہیے کہ ان میں کچھ اور اضافہ کرے۔ کیونکہ اب اس کے دیکھنے کی نوبت ہم تک پہنچی ہے۔ شاعر نے مضمون میں جدت تو پیدا کی مگر بے سلیقگی۔ اول تو اس نے حبیب کو دوست قرار دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس کی محبت کا نقش اس کے دل میں نہیں بیٹھا پھر اس کو دوست کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ دوسرے اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معشوق کے حسنِ ذاتی سے کچھ دل بستگی نہیں رکھتا بلکہ ظاہری بناؤ سنگار پر فریفتہ ہے تیسرے عشق جو ہمیشہ بے قصد و بے ارادہ پیدا ہوتا ہے اس کو قصد اور ارادہ سے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مرزا غالب مدح میں کہتے ہیں ؎

زمانہ عہد میں ہے اس کے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ظاہرا یہ خیال اسی فارسی شعر سے قصداً یا بلا قصد پیدا ہوا ہے مگر مرزا نے اس مضمون کو اصل خیال کے باندھنے والے سے بالکل چھین لیا ہے جو خلل تغزل کی حالت میں اس میں موجود تھے وہ مدح کی حالت میں بالکل نہیں رہے۔ مرزا نے ممدوح کو ایک ایسے کمال

کے ساتھ موصوف کیا ہے جو تمام کمالات کی جڑ ہے۔ یعنی وہ ہر چیز کو کامل تر اور افضل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے ہر شے اپنے تئیں کامل تر حالت میں اس کو دکھانا چاہتی ہے کہ اگر یہی حال ہے تو شاید آسمان کی زیب و زینت کے لیے اور ستارے پیدا کیے جائیں۔ اس پر سوا اس کے کہ کوئی منطقی اعتراض کیا جائے اور کسی طرح کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ بخلاف فارسی شعر کے کہ اس کی بنا خود اصولِ شاعری اور آدابِ عشق و محبت کے برخلاف ہے۔ عرفی شیرازی کہتا ہے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ

ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

غالب مرحوم نے اسی مضمون کو دوسرے لباس میں اس طرح جلوہ گر کیا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اگرچہ گمان غالب ہے کہ عرفی کی رہبری اس خیال کی طرف قرآن مجید کی اس آیت سے ہوئی ہوگی "وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ" لیکن ہر حالت میں عرفی کا یہ شعر آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور جس اسلوب میں کہ یہ خیال اس سے ادا ہو گیا ہے اب اس سے بہتر اسلوب ہاتھ آنا دشوار ہے۔ بایں ہمہ مرزا کی جرأت اور تلاش بھی کچھ کم تحسین کے قابل نہیں ہے کہ جس مضمون میں مطلق اضافہ کی گنجائش نہ تھی اس میں ایک لطیف اضافہ کیا ہے جو باوجود الفاظ کی دلفریبی کے لطفِ معنی سے بھی خالی نہیں ہے۔ عرفی کا یہ مطلب ہے کہ جو باتیں عوام کو معلوم ہیں یہی درحقیقت اسرار ہیں۔ مرزا یہ کہتے ہیں کہ جو چیزیں مانعِ کشفِ راز معلوم ہوتی ہیں یہی درحقیقت کاشفِ راز ہیں۔

بہرحال اس قسم کے اقتباسات ہمیشہ متاخرین قدما کے کلام سے کرتے رہے ہیں اور چراغ سے چراغ جلتا چلا آیا ہے۔ شعرائے عرب جب کوئی اچھوتا مضمون باندھتے تھے اور لوگ متعجب ہو کر ان سے پوچھتے تھے کہ کس تقریب سے یہاں تک ذہن پہنچا تو وہ صاف صاف اپنے خیال کا ماخذ بتا دیتے تھے۔ ابو نواس نے فضل بن ربیع کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

وَلَیْسَ لِلّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ   اَنْ یَّجْمَعَ العَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ

(یعنی خدا سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ تمام عالم کو ایک شخص کی ذات میں جمع کر دے)

اس پر کسی نے اس سے پوچھا کہ یہ مضمون کیونکر سوجھا؟ ابو نواس نے صاف کہہ دیا کہ یہ خیال جریر کے اس شعر سے پیدا ہوا جو اس نے بنی تمیم کی تعریف میں کہا ہے ؎

اِذَا غَضِبَتْ عَلَیْکَ بَنُوْ تَمِیْمٍ   حَسِبْتَ النَّاسَ کُلُّھُمْ غِضَابًا

(یعنی جب بنی تمیم تجھ سے ناراض ہو جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ تمام بنی آدم تجھ سے ناراض ہیں)

شعر ہی پر کچھ موقوف نہیں بلکہ تمام علوم و فنون میں انسان نے اسی طرح ترقی کی ہے کہ اگلے جو ادھورے نقش چھوڑتے گئے پچھلے ان میں کچھ تصرف کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہر ایک علم اور ہر ایک فن کمال کے درجہ کو پہنچ گیا۔ شعر کی ترقی بھی اسی طرح متصور ہے کہ قدما کے خیالات میں کچھ کچھ معقول تصرفات ہوتے رہیں لیکن اس قسم کے تصرفات کرنے کے لیے شاعری کی پوری لیاقت ہونی چاہیے ورنہ پہلی [illegible]

ہمارے ملک کے اکثر شعرا کرتے ہیں ان سے بجائے ترقی کے روز بروز شاعری نہایت ذلیل و پست و حقیر ہوتی جاتی ہے۔

فارسی میں کم اور عربی میں زیادہ اور انگریزی میں بہت زیادہ نہ صرف نظم میں بلکہ نثر میں نظم سے بھی زیادہ ہر قسم کے بلند و لطیف اور پاکیزہ خیالات کا ذخیرہ موجود ہے پس ہمارے ہم وطنوں میں جو لوگ ایسے دماغ رکھتے ہیں کہ غیر زبانوں سے نئے خیالات اخذ کر کے ان میں عمدہ تصرفات کر سکتے ہیں وہ اپنے مبلغ فکر کے موافق تصرف کر کے اور جن کی قوتِ متخیلہ ان سے کم درجہ کی ہے وہ انہی خیالات کو بعینہٖ اپنی زبان میں صفائی اور سادگی کے ساتھ ترجمہ کر کے اردو شاعری کو سرمایہ دار بنائیں۔ سنسکرت اور بھاشا میں خیالات کا ایک دوسرا عالم ہے اور اردو زبان بہ نسبت اور زبانوں کے سنسکرت اور بھاشا کے خیالات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ اس لیے ان زبانوں سے بھی خیالات کے اخذ کرنے میں کمی نہ کریں اور جہاں تک کہ اپنی زبان میں ان کے ادا کرنے کی طاقت ہو ان کو شعر کے لباس میں ظاہر کریں اور اس طرح اردو شاعری میں ترقی کی روح پھونکیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے شعرا نے جو کہیں کہیں فارسی اشعار کا ترجمہ اردو اشعار میں کر دیا ہے ان پر لوگوں نے اعتراض کیے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی اعتراض کا محل نہیں ہے۔ ایک زبان کے شعر کا عمدہ ترجمہ دوسری زبان کے شعر میں کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ایک بزرگوار نے سارا سکندر نامہ بحری اردو میں ترجمہ کر ڈالا ہے اور ہم نے سنا ہے کہ وہ شاعر بھی تھے اور مولوی بھی۔ ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کرے میوہ زیبا جو ہر شاخ کو — کہ یوں سرامش کرے خاک کو
ہوا جب کہ آراستہ باغ خوش — بہر میوۂ شیریں و ہم ترش
بہ شادی لب پستہ خنداں ہوا — رطب اس پہ بھی تیز دنداں ہوا
ہوا چہرۂ نار زخندہ وختہ — کہ ہوں تاج پر لعل جوں دوختہ
بہ رغبت بہ ہر شاخ انجیر جار — لٹکنے لگے مرغ انجیر خوار
اٹھایا لب غنچے نے جوش نفیر — ہم از بوئے شیر و ہم از بچے نفیر

شاید اس مترجم کی نسبت تو یہ کہا جا سکے کہ وہ مشاق شاعر نہ تھا اس لیے عمدہ ترجمہ نہ کر سکا لیکن ہم مشاق شاعروں سے کہتے ہیں کہ از راہِ عنایت زیادہ نہیں تو انہی چند شعروں کو فصیح اردو نظم میں تو ذرا لکھ دیں۔ جو شخص دوسری زبان کے شعر کا اپنی زبان کے شعر میں عمدگی کے ساتھ ترجمہ کرتا ہے گو اس سے اس کی قوتِ متخیلہ کا کمال ثابت نہیں ہوتا مگر وہ ایک دوسری لیاقت کا ثبوت دیتا ہے جو ہر ایک شاعر میں نہیں ہو سکتی۔

ہمارے بعض شعرا نے بعضے ایسے خیالات کو جو فارسی اشعار میں تھے اردو میں ایسی خوبی سے ادا کیا ہے کہ من وجہٖ اصل شعر سے بڑھ گئے ہیں۔ نظیری کا شعر ہے:

بوئے یار من ازیں سست وفا می آید — گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

سودا کہتے ہیں:

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس میں شک نہیں کہ سودا نے اپنے شعر کی بنیاد نظیری کے مضمون پر رکھی ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ

اس کا ترجمہ کر دیا ہے لیکن بلاغت کے لحاظ سے سودا کا شعر نظیری سے بہت بڑھ گیا ہے۔ دوست کے یاد آنے سے بھی ممکن ہے کہ عاشق "از خود رفتہ" ہو جائے لیکن ساغرِ شراب کو دیکھ کر معشوق کی نشیلی آنکھ کے تصور سے بے خود ہو جانا قرین قیاس ہے۔ اس کے سوا "از کار شدم" میں وہ تعمیم نہیں ہے جو اس میں ہے کہ "چلا میں"۔ نہیں معلوم کہ آپے سے چلا یا دین و دنیا سے چلا یا جگہ سے چلا یا کہاں سے چلا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ "چلا میں" ہمیشہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب آدمی مدہوش و بدحواس ہو کر گرنے کو ہوتا ہے اور "از کار شدم" میں یہ بات نہیں ہے معطل ہونے، معزول ہونے، اپاہج اور نکمے ہونے کو بھی "از کار شدن" سے تعبیر کرتے ہیں۔

در محفل خود راہ مدہ ہمچو منے را

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را (ملا اعلم)

نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغض ہو جائے

دوستو دردؔ کو محفل میں نہ تم یاد کرو (خواجہ میر دردؔ)

ممکن ہے کہ خواجہ میر دردؔ نے فارسی شعر سے یہ مضمون اخذ کیا ہو لیکن یقیناً ان کا شعر فارسی شعر سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اوّل تو فارسی مطلع کے مضمون کو اپنے مقطع میں لانا جس میں خود دردؔ کا لفظ ہی شاعر کے دعوے پر دلیل کا حکم رکھتا ہے۔ پھر راہ مدہ کی جگہ یاد کرو بولنا جس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہی کہ دردؔ کا اپنی محفل میں ذکر نہ کرو، دوسرے یاد کرنے کے معنی ہیں الحاح کا اور اُن کو اپنے پاس بلانا اور بڑی خوبی دردؔ کے شعر میں یہ ہے کہ محفل میں نہ بلانے کی وجہ جو فارسی میں یقینی طور پر بیان کی گئی ہے اس کو میر دردؔ نے احتمال کی صورت میں اس طرح بیان کیا ہے، "نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغض ہو جائے" ان دونوں اسلوبوں میں ایسا ہی فرق ہے جیسے ایک شخص تو پیار سے یوں کہے کہ "بدپرہیزی سے آدمی ہلاک ہو جاتا ہے" اور دوسرا یہ کہے "دیکھو کہیں بدپرہیزی میں جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو" دوسرے اسلوب میں جیسا کہ ظاہر ہے بہ نسبت پہلے اسلوب کے زیادہ تخریف و تحذیر ہے۔

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم

باید اوّل بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی؟ (سعدی شیرازی)

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ

ان سے بھی تو پوچھیے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے؟ (میر تقی میرؔ)

میرؔ کا یہ شعر بظاہر سعدی کے شعر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے مگر سعدی کے ہاں 'خوب' کا لفظ ہے اور میرؔ کے ہاں 'پیارے' کا لفظ ہے۔ ظاہر ہے کہ 'خوب' کا محبوب ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے لیکن 'پیارے' کا پیارا ہونا ضرور ہے۔ پس سعدی کے سوال کا جواب ہو سکتا ہے مگر میرؔ کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔

بہر حال ترجمہ کرنا بشرطیکہ ترجمہ کے فرائض پورے پورے ادا ہو جائیں کوئی عیب کی بات نہیں ہو سکتی۔ سعدی جو فارسی شاعری کا ہومر ہے خود اس کے کلام میں عربی اقوال و امثال کے ترجمے یا ان کا ماحصل موجود ہے مثلاً:

سعدی	اقوالِ عربی
ا۔ سگ بدریائے ہفتگانہ بشوے چونکہ تر شد پلید تر باشد	اَلْکَلْبُ نَجِسٌ مَا یَکُوْنُ اِذَا اغْتَسَلَ

سعدی	اقوال عربی
۲- ترا خامشی اے خداوند ہوش وقار است و نا اہل را پردہ پوش	اَلصَّمْتُ زِیْنَۃُ الْعَالِمِ وَ سَتْرُ الْجَاهِلِ
۳- تو بجائے پدر چہ کردی خیر تا ہمہ چشم داری از پسرت	رَاعِ اَبَاكَ يُرَاعِ اِبْنُكَ
۴- شپرہ گر نورِ آفتاب نخواہد رونقِ بازارِ آفتاب نکاہد	سَنَاءُ ذُكَاءٍ لَا يَزُوْلُ مِنْ دُعَاءِ الْخَفَاشِ
۵- نیک بخت آنکہ خورد و کشت و بد بخت آنکہ مرد و ہشت	اَلسَّعِيْدُ مَنْ اَكَلَ وَ زَرَعَ وَ الشَّقِيُّ مَنْ مَاتَ وَ وَدَعَ
۶- پادشاہاں بخردمنداں محتاج تر اند کہ خردمنداں بہ پادشاہاں	اَلسُّلْطَانُ اَحْوَجُ اِلَى الْعُقَلَاءِ مِنَ الْعُقَلَاءِ اِلَى السُّلْطَانِ

اہل یورپ جو آج قریب قریب کل علوم و فنون و صنائع کے تمام دنیا سے فائق ہیں۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دنیا میں کوئی مشہور قوم ایسی نہیں جس کی شاعری اور دانش کا لب لباب ان کی زبانوں میں موجود نہ ہو۔ پس ہم کو بھی چاہیے کہ جس قوم اور جس زبان کے خیالات ہم کو بہم پہنچیں ان سے جہاں تک ممکن ہو فائدہ اٹھائیں اور صرف انہی چند فرسودہ اور بوسیدہ خیالات پر جو صدیوں سے ہمارے پڑھتے چلے آتے ہیں قناعت کر کے نہ بیٹھے رہیں کیونکہ علم و ہنر میں قناعت ویسی ہی قابلِ ملامت ہے جیسی مال و دولت میں حرص۔

(۴) جس طرح ہماری غزل کے مضامین محدود ہیں اسی طرح اس کی زبان بھی ایک خاص دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ چند معمولی مضمون جب صدیوں تک برابر رٹے جاتے ہیں تو زبان کا ایک خاص حصہ ان کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے جو کہ زبانوں پر بار بار آنے اور کانوں سے بار بار سننے کے سبب زیادہ مانوس اور گوارا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ جو انہی کے ہم معنی ہوں استعمال کیے جائیں تو غریب اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

عشقیہ مضامین ہمارے ہاں کچھ غزل ہی کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے بلکہ قصیدے اور مثنوی میں بھی برابر انہی کا عمل دخل رہا ہے۔ فارسی اور اردو زبانوں میں چند کے سوا کل مثنویاں عشقیہ مضامین پر لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح قصائد کی تمہیدوں میں بھی زیادہ تر یہی رنگ اختیار کیا گیا ہے۔ واسوخت تو عشق کی پسلی ہی سے پیدا ہوا ہے لیکن چونکہ قصیدہ و مثنوی اور واسوخت کا میدان وسیع ہے لہٰذا ان میں غریب اور اجنبی الفاظ کی بہت کچھ کھپت ہو سکتی ہے۔ بخلاف غزل کے کہ یہاں ایک لفظ بھی غیر مانوس ہو تو وہ معلوم ہوتا ہے۔ گلاب کے تختہ میں کانٹے بھی پھولوں کے ساتھ نبھ جاتے ہیں مگر گلدستہ میں ایک کانٹا بھی کھٹکتا ہے اسی واسطے جن بزرگوں نے غزل کی بنیاد تصوف اور اخلاق پر رکھی ہے ان کو بھی وہی زبان اختیار کرنی پڑی ہے جو غزل میں عموماً برتی جاتی ہے۔ عشقیہ مضامین میں جو الفاظ حقیقی معنوں پر اطلاق کیے جاتے تھے انہی الفاظ کو ان بزرگوں نے مجاز و استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے اور رمز و کنایہ و تمثیل میں اپنے اصلی خیالات ظاہر کیے ہیں۔ پس غزل میں ضرور ہے کہ بہ نسبت اور اصناف کے سادگی اور صفائی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔ آج تک فارسی یا اردو میں [illegible]

غزل مقبول ہوتی ہے وہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے اس اصول کو نصب العین رکھا ہے۔ اردو میں ولی سے لے کر انشا اور مصحفی تک عموماً سب کی غزل میں صفائی، سادگی، روزمرہ کی پابندی، بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے۔ ان کے بعد دلی میں مومن، غالب، مجروح اور شیفتہ وغیرہ کے ہاں فارسی ترکیبوں نے اردو غزل میں بلاشک زیادہ دخل پایا مگر یہ لوگ بھی اعلیٰ درجہ کا شعر اسی کو سمجھتے تھے جس میں پاکیزہ اور بلند خیال ٹھیٹ اردو کے محاورہ میں ادا ہو جاتا تھا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ہر غزل میں اعلیٰ درجہ کا شعر ایک دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا باقی بھرتی ہوتی ہے۔ اگلے شعراء بھرتی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ ایک دو شعر اچھا نکل آیا باقی کم وزن اور پھیکے شعروں سے غزل کا نصاب پورا کر دیا۔ ہم لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنے بھرتی کے اشعار کو فارسی ترکیبوں سے چست کر دیتے ہیں تاکہ بادی النظر میں حقیر نہ معلوم ہوں۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ اکثر معمولی خیالات کو جو مدت سے مختلف شکلوں میں بندھتے چلے آتے تھے بہت کم باندھتے تھے بلکہ ہر شعر میں جدت پیدا کرنی چاہتے تھے اس لیے اردو روزمرہ کا رشتہ اکثر ہاتھ سے جاتا رہتا تھا۔ بایں ہمہ غزلیت کی شان ان کے تمام کلام میں پائی جاتی ہے اور صاف و با محاورہ اور دلربا اشعار ان کے ہاں بھی نسبتاً اتنے ہی نکل سکتے ہیں جتنے کہ قدما کی غزلیات میں۔ ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی سے اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی، روزمرہ کی پابندی اور محاورہ کی بہتات کے طرز ادا میں ایک شوخی اور چٹپٹا پن ہے جو انہی شخص کا حصہ ہے مگر نہایت تعجب ہے کہ لکھنؤ میں متاخرین نے سادگی اور صفائی کا غزل میں بہت کم خیال رکھا ہے باوجودیکہ زبان کے لحاظ سے دلی اور لکھنؤ میں کوئی معتدبہ فرق نہیں معلوم ہوتا اس کے سوا شجاع الدولہ کے زمانہ سے سعادت علی خاں کے وقت تک اردو کے تمام نامور شعراء کا جمگھٹ لکھنؤ ہی میں رہا یہاں تک کہ میر، سودا، سوز، جرأت، مصحفی اور انشاء وغیرہ اخیر دم تک وہیں رہے اور وہیں مرے مگر متاخرین کی غزل میں ان کی طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور لکھنؤ کو زمانہ موافق ہوا اور دلی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعراء لکھنؤ ہی میں جا بسے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم متعدبہ نے بھی ایک خاص حد تک ترقی کی۔ اس وقت نیچرل طور پر اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان اور رطب و طعم میں بھی ہم دلی سے فائق ہیں۔ لیکن زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لیے ضرور تھا کہ اپنی اور دلی کی زبان میں کوئی امر مابہ الامتیاز پیدا کرتے چونکہ منطق و فلسفہ و طب و علم کلام وغیرہ کی ممارست زیادہ تھی خود بخود طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور ان کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے یہاں تک کہ سیدھی سادی اردو امرا اور اہل علم کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہو گئی بلکہ جیسا ثقات سے سنا گیا ہے معیوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر غالب آگیا۔ نظم میں جرأت اور ناسخ کے دیوان کا، نثر میں باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا مقابلہ کرنے سے اس کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ بایں ہمہ انصاف یہ ہے کہ مرثیے اور مثنوی میں خاص خاص شخصوں پر (جیسا کہ آگے بیان کیا جائے گا) زمانہ کے اقتضا نے کچھ اثر نہیں کیا۔ انھوں نے زبان کے اصلی جوہر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اس کو بزرگوں کا تبرک سمجھ کر اس انقلاب کے زمانہ میں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا۔

بہرحال غزل میں زبان اور بیان کی صفائی کی غرض سے چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ غزل کو محض عشقیات میں اور عشقیات کو محض ہوا و ہوس کے مضامین میں محدود رکھنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس کو ہر قسم کے جذبات کا آرگن بنانا چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ غزل میں معمولی مضامین بندھتے بندھتے اس کی ایک خاص زبان قرار پا گئی ہے

اردو وہ اس قدر کانوں میں رچ گئی ہے کہ اگر دفعتاً اس میں کثرت سے غیر مانوس اور اجنبی ترکیبیں اور اسلوبِ بیان داخل ہو جائیں تو غزل ایسی ہی مہمل ہو جائے جیسی کہ بعض شعراء کی غزل عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اختیار کرنے سے ہو گئی ہے حالانکہ غزل کو باعتبار معنی کے وسعت دینا بظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ زبان اور طریقۂ بیان کو بھی وسعت دی جائے۔ پس ضرور ہے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ طریقۂ بیان میں دفعتاً کوئی بڑی تبدیلی واقع نہ ہو اور باوجود اس کے غزل میں ہر قسم کے خیالات عمدگی کے ساتھ ادا ہو سکیں۔

آج کل دیکھا جاتا ہے کہ شعر کے لباس میں اکثر نئے خیالات جو ہمارے اگلے شعراء نے کبھی نہیں باندھے تھے ظاہر کیے جاتے ہیں مگر چونکہ وہ اس خاص زبان میں جو شعراء کی کثرتِ استعمال سے کانوں میں رچ گئی ہے ادا نہیں کیے جاتے بلکہ نئے خیالات جن الفاظ میں براہِ راست ظاہر ہونا چاہتے ہیں انہی الفاظ میں ظاہر کر دیے جاتے ہیں۔ اس لیے وہ مقبولِ خاص و عام نہیں ہوتے۔

لیکن نئی طرز کی عام شاعری اگر سردست مقبول نہ ہو تو کچھ ہرج نہیں۔ جب لوگوں کے مذاق رفتہ رفتہ اس سے آشنا ہو جائیں گے اور نیچرل باتوں کی لذت اور حلاوت سے واقف ہوں گے اس وقت وہ خود بخود مقبول ہو جائے گی۔ البتہ غزل کو ابتدا ہی سے جہاں تک ممکن ہو عام پسند اور مطبوعِ طبائع بنانا ضرور ہے کیونکہ یہی ایسی صنف ہے جو خاص و عام کی زبان پر جاری ہوتی ہے۔ اسی کے اشعار ہر شخص کو بآسانی یاد رہ سکتے ہیں اور یہی تمام خوشی کے جلسوں اور سماع کی مجلسوں اور یاروں کی صحبتوں میں گائی اور پڑھی جاتی ہے۔ پس ملک میں نیچرل شاعری پھیلانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ غزل میں ہر قسم کے لطیف و پاکیزہ خیالات بیان کیے جائیں۔ اس کو تمام انسانی جذبات کے ظاہر کرنے کا آلہ بنایا جائے اور باوجود اس کے اس کو ایسے لباس میں ظاہر کیا جائے جو بادی النظر میں اجنبی اور غیر مانوس نہ ہو۔

سب سے بڑی دلیل اس بات کی کہ نئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات بھی اول اول اسی زبان اور روزمرہ میں ادا ہونے چاہئیں جس میں پرانے اور پست خیالات ادا کیے جاتے تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کلامِ الٰہی میں تمام روحانی اور اخلاقی باتیں ویسے ہی محاورات و تشبیہات و استعارات و تمثیلات میں بیان کی گئی ہیں جن میں شعرائے جاہلیت عشقیات و خمریات اور تفاخر و مدح و ذم وغیرہ کے مضامین بیان کرتے تھے۔

یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں دفعتاً ایک نمایاں ترقی اور وسعت پیدا ہو جائے مگر زبان میں دفعتاً پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ نامعلوم طور پر بیان کے اسلوب آہستہ آہستہ اضافہ کیے جاتے ہیں اور ان کو رفتہ رفتہ پبلک کے کانوں سے مانوس کیا جاتا ہے اور قدیم اسلوب جو کانوں میں رچ گئے ہیں ان کو بدستور قائم و برقرار رکھا جاتا ہے یہاں تک کہ اگر علم کی ترقی سے بہت سے قدیم شاعرانہ خیالات محض غلط اور بے بنیاد ثابت ہو جائیں تو بھی جن الفاظ کے ذریعہ سے وہ خیالات ظاہر کیے جاتے تھے وہ الفاظ ترک نہیں کیے جاتے۔ فرض کرو کہ آسمان کا وجود اور اس کا گردش کرنا، زمین کا ساکن ہونا، پانی اور ہوا کا بسیط ہونا، عناصر کا چار میں منحصر ہونا، جامِ جم کا جہاں نما ہونا، ظلمات میں چشمۂ حیواں کا مخفی ہونا، سیمرغ اور دیو و پری کا موجود ہونا اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں علمِ انسانی کی ترقی سے غلط ثابت ہو جائیں تو بھی شاعر کا یہ کام نہیں ہے کہ ان خیالات سے بالکل دستبردار ہو جائے بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ حقائق و واقعات اور سچے اور نیچرل خیالات کو انہی غلط اور بے اصل باتوں کے پیرایہ میں بیان کرے اور اس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز ٹوٹنے نہ دے ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اس نے اپنے منتر میں سے وہی اکھر بھلا دیے ہیں جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے۔

بہر حال جو لوگ اردو شاعری کو ترقی دینا یا یوں کہو کہ اس کو صفحۂ روزگار پر قائم رکھنا چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اصنافِ سخن

ہیں عموماً اور غزل میں خصوصاً اس اصول کو ملحوظ رکھیں کہ سلسلۂ سخن میں نئے اسلوب جہاں تک ممکن ہو کم اختیار کیے جائیں اور غیر مانوس الفاظ کم برتے جائیں مگر بالعموم طور پر رفتہ رفتہ ان کو گھٹاتے رہیں اور زیادہ تر کلام کی بنا قدیم اسلوبوں اور معمولی الفاظ و محاورات پر رکھیں مگر الفاظ کے حقیقی معنوں ہی پر قناعت نہ کریں بلکہ ان کو کبھی حقیقی معنوں میں، کبھی مجازی معنوں میں، کبھی استعارہ اور کنایہ کے طور پر اور کبھی تمثیل کے پیرایہ میں استعمال کریں ورنہ ہر قسم کے خیالات ایک نپی تلی [illegible] اصل زبان میں کیونکر ادا کیے جا سکتے ہیں۔

استعارہ و کنایہ اور تمثیل کی تعریف اور ان کی قسمیں علم بیان کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہاں ہم صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ استعارہ بلاغت کا ایک رکنِ اعظم ہے اور شاعری کو اس کے ساتھ وہی نسبت ہے جو قالب کو روح کے ساتھ۔ کنایہ اور تمثیل کا حال بھی استعارہ ہی کے قریب قریب ہے۔ یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں۔ جہاں اصل زبان کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے وہاں شاعر انہی کی مدد سے اپنے دل کے جذبات اور دقیق خیالات عمدگی کے ساتھ ادا کر جاتا ہے اور جہاں اس کا اپنا منتر کارگر ہوتا نظر نہیں آتا وہاں انہی کے زور سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے۔

بعض مضامین فی نفسہٖ ایسے دلچسپ اور دلکش ہوتے ہیں کہ ان کو محض صفائی اور سادگی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان ان کو ادا کرتے وقت رہ جاتی ہے اور معمولی اسلوب ان میں اثر پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایسے مقام پر اگر استعارہ اور کنایہ یا تمثیل وغیرہ سے مدد نہ لی جائے تو شعر شعر نہیں رہتا بلکہ معمولی بات چیت ہو جاتی ہے۔ مثلاً داغ کہتے ہیں:

گیا تھا کہہ کے اب آتا ہوں قاصد کو تو موت آئی
دلِ بیتاب واں جا کر کہیں تو بھی نہ مر رہنا

اس شعر میں دیر لگنے کو موت آنے اور مر رہنے سے تعبیر کیا۔ اگر یہ دونوں لفظ نہ ہوں بلکہ اس طرح بیان کیا جائے کہ قاصد نے تو بہت دیر لگائی، اے دل کہیں تو بھی دیر نہ لگانا تو شعر میں کچھ جان باقی نہیں رہتی۔ یا مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دوسرے مصرع میں طنزاً بطور استعارہ کے "دیر پشیماں" کی جگہ "زود پشیماں" کہا گیا ہے جس سے شعر میں جان پڑ گئی ہے۔ یہ ایسا ہی استعارہ ہے جیسا قرآن مجید میں "أَنْذِرْهُمْ" کی جگہ "بَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ" فرمایا ہے۔ اسی طرح میر تقی کہتے ہیں:

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

یہاں بھی "اعتماد نہیں ہے" کی جگہ طنزاً "اعتماد ہے" کہا گیا ہے۔ مرزا غالب کہتے ہیں:

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

دوسرے مصرع کا اصل مدعا یہ تھا کہ وفاداری ایسی عمدہ صفت ہے کہ اگر برہمن استواری کے ساتھ ساری عمر بت خانہ میں نباہ دے تو اس کے ساتھ وہ برتاؤ کرنا چاہیے جو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے مسلمان کے ساتھ کرنا زیبا ہے۔ اس مطلب کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ اگر وہ بت خانہ میں مرے تو اس کو کعبہ میں دفن کرنا چاہیے۔ جو خوبی اس طرزِ بیان میں ہے وہ ظاہر ہے۔ دوسری جگہ مرزا غالب کہتے ہیں:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دوسرے مصرع میں بطور کنایہ کے "خوف معلوم ہوا" کی جگہ "گھر یاد آیا" کہا گیا ہے کیوں کہ جنگل میں خوف معلوم ہونے کو گھر یاد آنا لازم ہے اور چونکہ اس میں صنعت ایہام بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس لیے شعر میں اور زیادہ لطف پیدا ہو گیا ہے یعنی اس میں یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ ہمارا گھر اس قدر ویران ہے کہ دشت کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے۔ مرزا غالب کا فارسی شعر ہے ۔

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

اس شعر میں اپنی مشکلات اور مصیبتوں کو بطور تمثیل کے بیان کیا ہے۔ جس حالت کو شاعر نے اس عنوان سے بیان کیا ہے وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اگر اس کو صاف اور سیدھے طور پر جیسی کہ وہ ہے بیان کیا جائے تو وہ ہرگز دو مصرعوں میں نہیں سما سکتی اور باوجود اس کے جس ہیبت ناک صورت میں اس کو تمثیل کا پیرایہ ظاہر کرتا ہے یہ بات ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ مرزا غالب کا اردو شعر ہے ۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس شعر میں بھی اس بات کو کہ آدمی نے جہاں ہوش سنبھالا اور تعلقات دنیوی میں پھنسا بطور تمثیل کے بیان کیا ہے اور اس عنوان سے بیان کی خوبی ظاہر ہے۔

بہرحال شاعر کا یہ ضروری فرض ہے کہ مجاز و استعارہ و کنایہ و تمثیل وغیرہ کے استعمال پر قدرت حاصل کرے تاکہ ہر دو کے جیسے مضمون کو آب و تاب کے ساتھ بیان کر سکے لیکن استعارہ وغیرہ میں اس بات کا خیال ضرور ہے کہ مجازی معنی فہم سے بعید نہ ہوں ورنہ شعر چیستان اور معما بن جائے گا۔ مثلاً شاہ نصیر کہتے ہیں ۔

چرائی چادر مہتاب شب میکش نے جیحوں پر
کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

چادر مہتاب چرانے سے چاندنی کا لطف اٹھانا اور اس سے متمتع ہونا مراد رکھا ہے جو نہایت بعید الفہم ہے۔ جن لوگوں نے استعارہ وغیرہ کے استعمال میں مذکورہ بالا اصول کو ملحوظ نہیں رکھا، ان کا کلام ہمیشہ نامقبول اور متروک رہا ہے جیسے بدر چاچی کے قصائد جن میں نہایت بعید الفہم استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ کہیں آہوئے مادہ سے آفتاب مراد لی ہے کہیں اشک زلیخا سے کواکب، کہیں انگلی سے برج عقرب کہیں برگ بنفشہ سے حروف، کہیں آب خنک سے پیالہ، کہیں موج دریا سے پانچ انگلیاں اور اسی طرح کہیں زمین سے آسمان اور کہیں آسمان سے زمین۔

اردو میں شعراء نے استعارہ کا استعمال زیادہ تر محاورات کے ضمن میں کیا ہے کیونکہ اکثر محاورات کی بنیاد اگر غور کر کے دیکھا جائے تو استعارہ پر ہوتی ہے مثلاً جی اچٹنا۔ اس میں جی کو ان چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو سخت چیز پر لگ کر اچٹ جاتی ہیں جیسے کنکر پتھر گیند وغیرہ یا مثلاً جی بٹنا۔ اس میں جی کو ایسی چیز سے تشبیہ دی گئی ہے جو منقسم اور متفرق ہو سکے۔ آنکھ لگنا، دل کھلنا، غصہ بھڑکنا، کام چلنا اور اسی طرح ہزاروں محاورے استعارہ پر مبنی ہیں اور یہ وہ استعارے ہیں جن میں شعراء کی کارستانی کو کچھ دخل نہیں ہے بلکہ نیچرل طور پر بغیر فکر اور تصنع کے اہل زبان

کے منہ سے وقتاً فوقتاً نکل کر زبان کا جزو بن گئے ہیں۔ کنایہ بھی زیادہ تر محاورات ہی کے ضمن میں استعمال ہوا ہے مگر اردو شعرا نے تمثیل کو بہت کم برتا ہے۔ البتہ نئی طرز کی شاعری میں اس کا کچھ کچھ رواج ہو چلا ہے اور ضرورت نے لوگوں کو اس کے برتنے پر مجبور کیا ہے چونکہ اس موقع پر استعارہ کی تقریب سے محاورہ کا ذکر آگیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محاورہ کے متعلق چند ضروری باتیں بیان کی جائیں۔

(ب) محاورہ لغت میں مطلقاً بات چیت کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ بات چیت اہلِ زبان کے روزمرہ کے موافق ہو خواہ مخالف لیکن اصطلاح میں خاص اہلِ زبان کے روزمرہ یا بول چال یا اسلوبِ بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ محاورہ تقریباً ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے کیونکہ مفرد الفاظ کو روزمرہ یا بول چال یا اسلوبِ بیان نہیں کہا جاتا۔ بخلاف لغت کے کہ اس کا اطلاق ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو (۱۹) بمنزلہ مفرد کے ہیں کیا جاتا ہے۔ مثلاً پانچ اور سات دو لفظ ہیں جن پر الگ الگ لغت کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر ان میں سے ہر ایک کو محاورہ نہیں کہا جائے گا بلکہ دونوں کو ملا کر جب "پانچ سات" بولیں گے تب محاورہ کہا جائے گا۔ یہ بھی ضرور ہے کہ وہ ترکیب جس پر محاورہ کا اطلاق کیا جائے، قیاسی نہ ہو بلکہ معلوم ہو کہ اہلِ زبان اس کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر پانچ سات یا سات آٹھ یا آٹھ سات پر قیاس کر کے چھ آٹھ یا آٹھ چھ یا سات نو بولا جائے گا تو اس کو محاورہ نہیں کہیں گے۔ کیونکہ اہلِ زبان کبھی اس طرح نہیں بولتے یا مثلاً بلاناغہ پر قیاس کر کے اس کی جگہ بے ناغہ، ہر روز کی جگہ ہر دن، روز روز کی جگہ دن دن یا آئے روز بولنا، ان میں سے کسی کو محاورہ نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہ الفاظ اہلِ زبان کی بول چال میں کبھی نہیں آتے۔

کبھی محاورہ کا اطلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اتارنا اس کے حقیقی معنے کسی جسم کو اوپر سے نیچے لانے کے ہیں مثلاً گھوڑے سے سوار کو اتارنا، کھونٹی سے کپڑا اتارنا، کوٹھے پر سے پلنگ اتارنا، لیکن ان میں سے کسی پر محاورہ کے یہ دوسرے معنی صادق نہیں آتے۔ کیونکہ ان سب مثالوں میں اتارنا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں نقشہ اتارنا، نقل اتارنا، دل سے اتارنا، دل میں اتارنا، اُتارا اتارنا، پہنچا اتارنا، یہ سب محاورے کہلائیں گے کیونکہ ان سب مثالوں میں اتارنے کا اطلاق مجازی معنوں پر کیا گیا ہے۔ یا مثلاً کھانا اس کے حقیقی معنے کسی چیز کو دانتوں سے چبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اتارنے کے ہیں۔ مثلاً روٹی کھانا، دوا کھانا، افیم کھانا وغیرہ۔ لیکن ان میں سے کسی کو دوسرے معنی کے لحاظ سے محاورہ نہیں کہا جائے گا، کیونکہ ان سب مثالوں میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ ہاں غم کھانا، قسم کھانا، دھوکا کھانا، پچھاڑیں کھانا، ٹھوکر کھانا، یہ سب محاورے کہلائیں گے۔

محاورے کے جو معنے ہم نے اوّل بیان کیے ہیں وہ عام ہیں یعنی دوسرے معنوں کو بھی شامل ہیں لیکن دوسرے معنے پہلے معنے سے خاص ہیں۔ پس جس ترکیب کو پہلے (دوسرے) معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے گا اس کو دوسرے (پہلے) معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ جس ترکیب کو پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہا جائے اس کو دوسرے معنوں کے لحاظ سے بھی محاورہ کہا جائے۔ مثلاً تین پانچ کرنا (یعنی جھگڑا قضیہ کرنا) اس کو دونوں معنوں کے لحاظ سے محاورہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ترکیب اہلِ زبان کی بول چال کے بھی موافق ہے اور نیز اس میں "تین پانچ" کا لفظ اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔ لیکن روٹی کھانا یا میوہ کھانا یا پانچ سات یا دس بارہ وغیرہ پہلے معنوں کے لحاظ سے محاورہ قرار پا سکتے ہیں نہ دوسرے معنوں کے لحاظ سے کیونکہ یہ تمام ترکیبیں اہلِ زبان کی بول چال کے مطابق تو ضرور ہیں مگر ان میں کوئی لفظ مجازی معنوں میں مستعمل نہیں ہوا۔ آئندہ ہم دونوں معنوں میں تمیز کے لیے پہلی قسم کے محاورہ پر روزمرہ کا اور دوسری قسم پر محاورہ کا اطلاق کریں گے۔

روزمرہ اور محاورہ میں من حیث الاستعمال ایک اور بھی فرق ہے روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو تقریر و تحریر اور نظم و نثر میں ضروری سمجھی گئی ہے۔ یہاں تک کہ کلام میں جس قدر روزمرہ کی پابندی کم ہوگی، اسی قدر وہ فصاحت کے درجے سے ساقط سمجھا جائے گا مثلاً "کلکتہ سے پشاور تک سات آٹھ کوس پر ایک پختہ سرا اور ایک کوس پر مینار بنا ہوا تھا۔" یہ جملہ روزمرہ کے موافق نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ یوں ہونا چاہیے "کلکتہ سے پشاور تک سات سات آٹھ آٹھ کوس پر ایک ایک پختہ سرا اور کوس کوس بھر پر ایک ایک مینار بنا ہوا تھا" یا مثلاً "آج تک ان سے ملنے کا موقع نہ ملا" یہاں "نہ ملا" کی جگہ "نہیں ملا" چاہیے یا "وہ خاوند کے مرنے سے زندہ درگور رہ گئی" یہاں "زندہ درگور ہو گئی" چاہیے یا ؎

"سو گئے جب بخت تب بیدار آنکھیں ہو گئیں"

یہاں "ہو گئیں" کی جگہ "ہوئیں" چاہیے یا ؎

"دیکھتے ہی دیکھتے یہ کیا ہوا"

یہاں "کیا" "ہو گیا" چاہیے۔

الغرض نظم ہو یا نثر دونوں میں روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو نہایت ضروری ہے مگر محاورہ کا ایسا حال نہیں ہے محاورہ اگر عمدہ طور سے باندھا جائے تو بلاشبہ پست شعر کو بلند اور بلند کو بلند تر کر دیتا ہے لیکن ہر شعر میں محاورہ باندھنا ضروری نہیں بلکہ ممکن ہے کہ شعر بغیر محاورہ کے بھی فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ درجہ پر واقع ہو اور ممکن ہے کہ ایک پست اور ادنیٰ درجے کے شعر میں بے تمیزی سے کوئی لطیف و پاکیزہ محاورہ رکھ دیا گیا ہو۔ ایک مشہور شاعر کا شعر ہے ؎

گوہر اشک سے لبریز ہے سارا دامن   آج کل دامن دولت ہے ہمارا دامن

اس شعر میں کوئی محاورہ نہیں باندھا گیا باوجود اس کے شعر تعریف کے قابل ہے۔ دوسری جگہ یہی شاعر کہتا ہے ؎

ان کا خط دیکھتے ہیں جب صیاد
طوطے ہاتھوں کے اڑا کرتے ہیں

اس شعر میں نہ کوئی خوبی ہے نہ مضمون ہے، صرف ایک محاورہ بندھا ہوا ہے اور وہ بھی روزمرہ کے خلاف یعنی "اڑ جاتے ہیں" کی جگہ "اڑا کرتے ہیں"۔ محاورہ کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہیے جیسے کوئی خوبصورت عضو بدن انسان میں اور روزمرہ کو ایسا جاننا چاہیے جیسے تناسب اعضا بدن انسان میں۔ جس طرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے حسن بشری کامل نہیں سمجھا جا سکتا اسی طرح بغیر روزمرہ کی پابندی کے محض محاورات کے جا و بے جا رکھ دینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔

شعر کی معنوی خوبی کا اندازہ اہل زبان اور غیر اہل زبان دونوں کر سکتے ہیں لیکن لفظی خوبیوں کا اندازہ کرنا صرف اہل زبان کا حصہ ہے اہل زبان عموماً اس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں روزمرہ کا لحاظ کیا گیا ہو اور اگر روزمرہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ ان کو اور بھی زیادہ مزا دیتی ہے مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق ہے۔ عوام محاورہ یا روزمرہ کے ہر شعر کو سن کر سر دھننے لگتے ہیں اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی مبتذل یا رکیک اور سبک ہو اور اگرچہ محاورہ کیسا ہی بے سلیقگی سے باندھا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن اسلوبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں جب انہی اسلوبوں میں وزن کی گھلاوٹ اور قافیوں کا تناسب دیکھتے ہیں اور معمولی بات چیت کو شعر کے سانچے میں ڈھلا ہوا پاتے ہیں تو ان کو ایک نوع کا تعجب اور تعجب کے ساتھ خوشی پیدا ہوتی ہے مگر خواص کی پسند اور تحسین کے لیے صرف روزمرہ

کا وزن کے سانچے میں ڈھال دینا کافی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک محض تک بندی اور معمولی بات جیت کو موزوں کر دینا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ دیکھتے ہیں کہ ایک سنجیدہ مضمون معمولی روزمرہ میں کمال خوبی اور صفائی اور بے تکلفی سے ادا کیا گیا ہے تو بلاشبہ ان کو بے انتہا تعجب اور حیرت ہوتی ہے کیونکہ فنِ شعر میں اور خاص کر اردو زبان میں کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور روزمرہ میں پورا پورا ادا ہو جائے۔ جن لوگوں نے روزمرہ کی پابندی کو سب چیزوں سے مقدم سمجھا ہے۔ اُن کے کلام کو بھی جب نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو جا بجا فروگذاشتیں اور کسریں نظر آتی ہیں۔ پس جب کوئی شعر باوجود مضمون کی متانت اور سنجیدگی کے روزمرہ اور محاورہ میں بھی پورا اتر جائے تو لامحالہ اس سے ہر صاحبِ ذوق کو تعجب ہوتا ہے۔ مثلاً میر انشاء اللہ خاں اس بات کو کہ افسردگی کے عالم میں خوشی اور عیش و عشرت کی چھیڑ چھاڑ سخت ناگوار گزرتی ہے۔ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

یا مثلاً مرزا غالب اتنے بڑے مضمون کو کہ (میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا تو اول خاموش کھڑا رہا۔ پاسباں نے سائل سمجھ کر کچھ نہ کہا جب معشوق کے دیکھنے کا حد سے زیادہ شوق ہوا اور صبر کی طاقت نہ رہی تو پاسباں کے قدموں پر گر پڑا۔ اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے) دو مصرعوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

یا مثلاً مرزا غالب کہتے ہیں ؎

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

قاعدہ ہے کہ جب تک انسان عشق و محبت کو چھپاتا ہے اس کو ہر ایک بات کا پاس و لحاظ رہتا ہے لیکن جب راز فاش ہو جاتا ہے تو پھر اس کو کسی سے شرم اور حجاب نہیں رہتا۔ اس شعر میں یہی مضمون ادا کیا گیا ہے۔ دھویا جانا، بے حیا اور بے لحاظ ہو جانے کو کہتے ہیں اور پاک، آزاد اور شہدے کو کہتے ہیں۔ رونے کے سبب دھویا جانا اور دھوئے جانے کے سبب پاک ہونا۔ باوجود ان لفظی مناسبتوں اور محاورہ کی نشست اور روزمرہ کی صفائی کے مضمون پورا پورا ادا ہو گیا ہے اور کوئی بات اَن نیچرل نہیں۔ یا مثلاً مومن خاں کہتے ہیں ؎

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

آنکھیں چرانا، اغماض و تغافل کرنا ہے، کھویا جانا شرمندہ اور کھسیانا ہونا، پا جانا سمجھ جانا یا تاڑ جانا۔ یہ معنی ظاہر ہیں۔ اس شعر کا مضمون بھی بالکل نیچرل ہے اور محاورات کی نشست اور روزمرہ کی صفائی قابلِ تعریف ہے۔ اگرچہ اس کا ماخذ مرزا غالب کا یہ شعر ہے ؎

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مگر مومن کے ہاں زیادہ صفائی سے بندھا ہے۔ اسی قبیل کے یہ اشعار ہیں ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو
(ذوق)

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے یقیں یاں رہ گیا واں رہ گیا
(آتش)

جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد
ہمیں آگے اس کے قدم دیکھتے ہیں
(میر)

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی
(شیفتہ)

یوں وفا اٹھ گئی زمانے سے
کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں
(داغ)

الغرض روزمرہ کی پابندی تمام اصنافِ سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً جہاں تک ہو سکے نہایت ضروری چیز ہے اور محاورہ بھی بشرطیکہ سلیقے سے باندھا جائے شعر کا زیور ہے۔

(ج) صنائع و بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا سر رشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا کیونکہ مخاطب کے دل میں یہ خیال گزرنا کہ شاعر نے شعر کی ترتیب میں تصنع کیا ہے اور الفاظ میں اپنی کاریگری ظاہر کرنی چاہی ہے بالکل شعر کی تاثیر کو زائل کر دیتا ہے پس صنائع کی پابندی اور التزام سے تمام اصنافِ سخن میں عموماً اور غزل میں خصوصاً ہمیشہ بچنا چاہیے۔ صنعتیں جیسا کہ علمِ بلاغت میں مفصل مذکور ہے، دو قسم کی قرار دی گئی ہیں ایک معنوی جیسے طباق (مثلاً) عکس، توریہ، حسنِ تعلیل، تجاہلِ عارفانہ، تعجب وغیرہ دوسری لفظی جیسے تجنیس، رد العجز علی الصدر، منقوط غیر منقوط، رقطا، خیفا، مقطع، موصل، ترصیع وغیرہ۔ پہلی قسم کی کل صنعتیں اور دوسری قسم کی خاص خاص صنائع عربی اور فارسی کے تمام نامور شعرا نے برتی ہیں مگر کبھی ان کا التزام نہیں کیا اور کلام کی بنیاد ان پر نہیں رکھی۔ ہاں اگر حسنِ اتفاق سے کبھی کوئی ایسا مناسب لفظ سوجھ گیا جس سے معنی مقصود میں خلل واقع نہ ہو اور بیان میں زیادہ حسن پیدا ہو جائے ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، جیسے خواجہ حافظ کہتے ہیں ؎

بزیرِ دلق ملمع کمندہا دارند
درازدستی ایں کوتہ آستیناں بیں

اس شعر میں دراز اور کوتہ کے لحاظ سے صنعتِ طباق اور دست و آستیں کے اعتبار سے مراعاۃ النظیر ہے مگر دونوں صنعتیں ایسی بے تکلف اور مناسب طور پر واقع ہوئی ہیں کہ معنی مقصود میں بجائے اس کے کہ مخل ہوں اور زیادہ قوت پیدا کر دی ہے اور شعر کا حسن دوبالا کر دیا ہے یا جیسے میر تقی کہتے ہیں ؎

میر جی چشم پر آب ہیں دونوں
ایک خانہ خراب ہیں دونوں

اس میں ایک کا لفظ ایسا بے ساختہ اور بے تکلف واقع ہوا ہے کہ گویا شاعر نے اس کا قصد ہی نہیں کیا۔ یہاں ایک کے معنی ہیں نہایت بے مثل لاجواب، چھٹا ہوا جیسے کہتے ہیں وہ ایک بدذات ہے یا وہ لوگ ایک شہرہ پشت ہیں۔ دو والے کے مقابلہ میں

ایک نے کے لفظ نے اگر شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے ورنہ نفسِ مضمون کے لحاظ سے اس کی کچھ بھی حقیقت نہ تھی۔ یہاں فی الحقیقت محض مراعاۃ النظیر نے اس شعر میں اعلیٰ درجہ کی بلاغت پیدا نہیں کی بلکہ اس بات نے پیدا کی ہے کہ دو چیزوں پر لفظ ایک کا اطلاق ایسی خوبی اور بے تکلفی سے ہوا ہے کہ اس سے بہتر تصور میں نہیں آسکتا ورنہ ایک شعر یا ایک مصرعہ میں ایک اور دو کا جمع کر دینا کہ اسی کا نام مراعاۃ النظیر ہے کوئی بڑی بات نہ تھی۔

حسنِ مطلع

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

اس شعر میں بھی آگ اور پانی کا مقابلہ نہایت بے تکلفی سے واقع ہوا ہے۔ پس اگر اس قسم کی مناسبت لفظی اتفاق سے شعر میں پیدا ہو جائے تو یہ شاعری کا زیور ہے مگر قصداً ایسی رعایتوں کی جستجو کرنے سے آخر کار شاعری شاعری نہیں رہتی بلکہ مسخرا پن ہو جاتا ہے۔

ایک مشہور شاعر فرماتے ہیں ؎

مرغِ دل کو توڑے گی بلی ترے دروازہ کی
رخت تن کو کترے گا چوہا تمھاری ناک کا

چونکہ بلی کے لیے چوہا لانا واجبات سے تھا اس لیے جب اصلی چوہا نہ ملا ناچار ناک ہی کے چوہے پر قناعت کی۔

کھانے کی اصلی خوبی یہ ہے کہ لذیذ ہو، مفید ہو، جزوِ بدن بننے کے لائق ہو، بو باس اور رنگ و روپ بھی اچھا رکھتا ہو اگر باوجود ان سب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی حال شعر کا ہے۔ شعر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ نیچرل ہو، موثر ہو، لفظاً اور معناً خوب ہو۔ اگر اس کے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اس میں پائی جائے تو اور بہتر ہے ورنہ اس کی کچھ ضرورت نہیں۔

ہر زبان میں صنعتِ الفاظ (اگر ہمارا قیاس غلط نہیں ہے) متقدمین کی نسبت متاخرین کے کلام میں زیادہ پائی گئی کیونکہ اکثر متاخرین انھی مضامین کو دہراتے ہیں جو ان سے پہلے قدما باندھ گئے ہیں۔ پس ناچار وہ صنعتِ الفاظ کو کام میں نہ لائیں تو انھی معمولی باتوں میں کوئی کرشمہ نہیں رکھ سکتے۔

متاخرین میں صنائع کا خیال زیادہ تر اس سبب سے پیدا ہوتا ہے کہ قدما کے کلام میں کچھ اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن میں باوجود حسنِ معنی کے اتفاق سے کوئی لفظی مناسبت بھی پیدا ہو گئی ہے چونکہ وہ اشعار عموماً پسند کیے جاتے ہیں بعض لوگ غلطی سے خیال کر لیتے ہیں کہ ان کی مقبولیت کا سبب وہی لفظی مناسبت ہے اور بس۔ اب وہ بہ تکلف انھی صنعتوں کو اپنے کلام میں جا و بے جا استعمال کرنا شروع کرتے ہیں اور جو اصلی خوبی قدما کے کلام میں ہوتی ہے اس کا مطلق خیال نہیں کرتے۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ ایک جامہ زیب اور حسین آدمی جس پر کوئی لباس برا نہیں معلوم ہوتا، اتفاق سے بسنت کی ٹوپی اور زرکار چوبی انگرکھا پہن کر نکلے اور لوگ اس کی ریس سے ویسے ہی کپڑے پہننے لگیں اور یہ نہ سمجھیں کہ اس کی زیبائش کا اصلی سبب حسن و جمال ہے نہ بسنت کی ٹوپی اور زرکار چوبی انگرکھا۔

صنعتِ الفاظ نے ہماری شاعری بلکہ ہمارے تمام لٹریچر کو بے انتہا صدمہ پہنچایا ہے جس کی تفصیل کے لیے ایک مجلد کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جس طرح عجائبِ قدرت کی تعظیم ہوتے ہوتے آخر کار دنیا میں عجائب پرستی ہونے لگی اور خدا کا خیال جاتا رہا۔ اسی طرح ہمارے لٹریچر میں صنائعِ لفظی کی رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے آخر کار محض الفاظ پرستی باقی رہ گئی اور معنی کا خیال بالکل جاتا رہا۔ صنائع و بدائع کی پابندی

دلی کے شعراء میں عموماً بہت کم پائی جاتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بالکل نہیں پائی جاتی۔ البتہ لکھنؤ کے بعض شعراء نے اس کا سخت پابندی کے ساتھ التزام کیا ہے اور بمقابلہ اہلِ دہلی لکھنؤ کے عام شعراء بھی رعایتِ لفظی کا زیادہ خیال کرتے ہیں لیکن پھر بھی فارسی کے مقابلہ میں اُردو شاعری اس آفت سے بہت محفوظ ہے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے وہ بیہودہ لفظی صنعتیں جن میں معنی سے بالکل قطع نظر کرلی جاتی ہے اور محض ایک لفظوں کا گورکھ دھندا بنایا جاتا ہے جیسے منقوط، غیر منقوط، رقطا، خیفا، ذوقافتین، ذوبحرین، وغیرہ وغیرہ اُردو شاعری میں کمیاب ہیں مگر بجائے صنائع لفظی کے اُردو غزل میں ایک اور روگ پیدا ہوگیا ہے جو صنائع سے بھی زیادہ معنی کا خون کرنے والا ہے۔

(د) سنگلاخ زمینوں میں لکھنؤ اور دلی کے شعرائے متاخرین نے ہزارہا غزل لکھی ہے۔ میر، سودا، جرأت، درد اور اثر کے ہاں ایسی زمینوں میں بہت کم غزلیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ابتداء مصحفی اور انشا کے وقت سے ہوئی ہے اور شاہ نصیر نے سب سے زیادہ اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ ذوق کا بھی ابتدائی شاعری میں اس کا بہت لپکا رہا ہے۔ ظفر کے کلام میں بھی ایسی زمینیں بہت ہیں۔ البتہ غالب، مومن، مرحوم شیفتہ، داغ وغیرہ نے ایسی زمینیں بہت کم اختیار کی ہیں۔ لکھنؤ کے شعراء نے بھی سخت زمینوں میں بے انتہا غزلیں لکھی ہیں۔

جو لوگ شاعری کے فرائض پورے پورے ادا کرنے چاہتے ہیں وہ اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ شعر کے سرانجام دینے میں کوئی چیز ایسی مشکل نہیں جیسا مضمون شعر کے لیے مناسب قافیہ بہم پہنچانا۔ اسی لیے جب کسی کو سخت دقت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ اس کا قافیہ تنگ ہوگیا۔ اسی قافیہ کی مشکلات سے بچنے کے لیے یورپ کے شعراء نے آخر کار ایک بلینک ورس یعنی نظم غیر مقفی نکال لی ہے اور اب زیادہ تر وہاں اسی طرح کی نظم پر شاعری کا دارومدار ہے۔ ہمارے ہاں اس پر طرہ یہ ہے کہ قافیہ کے پیچھے ایک ردیف کا دُم چھلا اور لگا لیا گیا ہے۔ اگرچہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے لیکن غزل میں اور خاص کر اردو غزل میں تو اس کو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو قافیہ کو۔ اگر تمام اُردو دیوانوں میں غیر مُردف غزلیں تلاش کی جائیں تو ایسی غزلیں شاید گنتی کی نکلیں۔ پس جب کہ ردیف اور قافیہ کی گھاٹی خود دشوار گذار ہے تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور ناقابلِ گذر بنانا انھی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور شاعری کا مآل محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور بس!

جہاں تک سنگلاخ زمینوں کا استقرا کیا جاتا ہے ان میں یا تو ردیف اور قافیہ ایسا اختیار کیا جاتا ہے جن میں باہم دگر کچھ مناسبت نہ ہو۔ مثلاً تقریر پشت آئینہ، انجیر پشت آئینہ، تدبیر پشت آئینہ اور جبل کی نکھی، مخمل کی مکھی، دھل اور عسس کی تیلیاں، مگس کی تیلیاں، نفس کی تیلیاں یا ردیف ایسی لمبی اختیار کرتے ہیں جو ایک آدھ سے زیادہ شعروں میں معقول طور پر نہیں آ سکتی جیسے فلک پر بجلی زمیں پر باراں، سرِ جادہ، ہار گئے ہیں، نگاہ خدنگ، نگاہ کماں، غرض یہ کہ قصداً ایسی طرح تجویز کرتے ہیں جس میں عمدہ مضمون بندھنا تو یقیناً ناممکن ہو اور بامعنی شعر نکالنا بھی نہایت مشاق و ماہر استادوں کے سوا عام شعراء کے لیے قریب ناممکن کے ہو۔ ایسی زمینوں میں بڑا کمال شاعر کا یہ سمجھا جاتا ہے کہ قافیہ اور ردیف میں جو منافرت ہو وہ بظاہر جاتی رہے گویا تیل اور پانی کو ملایا جاتا ہے۔ ایسی غزلوں میں اور امیر خسرو کی انمل میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق معلوم ہوتا ہے۔ امیر خسرو نے کھیر، چرخہ، ڈھول اور کتا ان چار چیزوں کا اس طرح پیوند ملایا ہے۔

کھیر بکاؤلی مقنن سے چڑھ کر رہا جلا ۔ آیا کٹ کی گیا تو بیٹھی وصول بجا

ایک شاعر گلگیر اور پشت آئینہ کو اس طرح پیوند دیتا ہے :-

آ رہی پہنے ہوئے وہ گل جو بیوے شمع کا
ہم انگوٹھے کو کہیں گلگیر پشتِ آئینہ

ایک اور شاعر نے گل اور مکھی کو اس طرح گانٹھا ہے :-

صنعت لعبت چین دیکھ ولا جا کر تو
دیکھنی گر تجھے منظور ہو گل کی مکھی

اسی پر قیاس کر لینا چاہیے کہ کل سنگلاخ زمینوں میں اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا کہ دو بے میل چیزوں میں میل ثابت کیا جائے۔ پس شاعر کو چاہیے کہ ہمیشہ ردیف ایسی اختیار کرے جو قافیہ سے میل کھاتی ہوئی ہو اور ردیف و قافیہ دونوں مل کر دو مختصر کلموں سے زیادہ نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ مردّف غزلیں لکھنی کم کرنی چاہئیں اور سر دست محض قافیہ پر قناعت کرنی چاہیے۔ قافیہ ایسا اختیار کرنا چاہیے جس کے لیے قدر ضرورت سے دس گنے بلکہ بیس گنے زیادہ الفاظ موجود ہوں ورنہ مضمون کو قوافی کا تابع کرنا پڑے گا۔ قافیے مضمون کے تابع نہ ہوں گے۔ جتنے نامور شعراء گذرے ہیں انھوں نے یہی اصول ملحوظ رکھا ہے اور ہمیشہ ایسی زمینیں اختیار کی ہیں جن میں ہر قسم کے مضمون کی گنجائش ہو۔

مولانا عبد السلام ندوی

اُردو غزل گوئی کے چار دور ہیں اور چاروں کی خصوصیات الگ الگ ہیں۔

قدماء کے پہلے اور دوسرے دور کی زبان نہایت ثقیل اور مکروہ ہے اور ان میں لفظی غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ تاریخ شعرائے اُردو میں شاہ مبارک آبرو کے حال میں لکھا ہے :

"مگر استعمال الفاظ مکروہ کا اور نہ پروا کرنا بار یک باتوں کا یعنی جائز رکھنا قافیہ سین اور صاد کا اس کے کلام سے دریافت ہوتا ہے۔ نہ صرف اسی کے کلام میں بلکہ اس کے ہم عہدوں کے کلام میں اس سے زیادہ ہے۔" (تاریخ شعرائے اُردو صفحہ ۱۰)

ایک نامعلوم الاسم قلمی تذکرے میں جو انجمن اُردو لکھنؤ کی نمائش میں پیش کیا گیا تھا شاہ حاتم کے حالات میں لکھا ہے :-

"زبانش با زبان ولی رکنی مناسبت دارد"

سودا صحیح زبان میں لکھی مصحفی اپنے تذکرے میں ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

"و بعضے بسبب دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعض اشعارش بجہل دستوراتش نیز نسبت میدہند"

تذکرہ مہر جہاں تاب میں ہے :

"در بیشتر اشعارش الفاظ رکیکہ ہندیہ اندراج یافتہ و سہل انگاری بعضے از کلمات را بچشم صحت ملاحظہ نفرمودہ"

لیکن قدماء کے تیسرے دور میں جب مناظرہ کا عام رواج ہوا اور شعراء میں باہم رد و قدح ہونے لگی تو صحتِ الفاظ کی طرف کسی قدر توجہ دی گئی اور اس قسم کی غلطیوں پر اعتراضات کیے جانے لگے۔ چنانچہ میر محسنؔ منشی بندرابن راقمؔ کے اس مصرعے پر ؎

"کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں"

ان الفاظ میں نکتہ چینی کرتے ہیں:

"اغلب کہ ایں شعر بے اصلاح باشد، چرا کہ از افتادن عین ناموزوں می شود۔ و دریں جا عین می افتد و ایں خطا است، و روا نیست۔ فقیر چنیں بہتر می شود ؎

میر! تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں"

شیخ معین الدین معینؔ کے تذکرے میں فرماتے ہیں:

خوش ہم عریانی سے اتنے ہیں برنگِ بوئے گل

نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم

"خوش ہم عریانی، ناموزوں است۔ چرا کہ میم بار را چناں پیچیدہ است کہ عین را چوں چشمِ غزال از میاں رم کردہ است۔ و ایں سخت عیب است۔"

بالخصوص سعادت خاں رنگینؔ نے اس طرف زیادہ توجہ کی اور اپنے معاصرین کے کلام پر اس حیثیت سے سخت نکتہ چینیاں کیں چنانچہ تذکرۂ مہر جہاں تاب میں ہے:

"ہر چند کملائے ہم عہدش از ایراد بعض الفاظ رکیکہ ہندی و ننگی نشست آں بعد رفع کلمات ثقیلہ قدماء جائز و انستند، در شعر خود با درج کردند آں ہمہ از اشعار خود برانداخت و ازیں جا است کہ کسے از قدماء و ہم عہدانش نبودہ کہ در شعرش قباحتے بر نیاوردہ و اعتراض لغو نمودہ و بلاحظہ آں مباحث و دخلہایش پیدا است کہ اعتراض بے جا نہ بود" (تذکرۂ مہر جہاں تاب "تذکرۂ رنگین")

اسی دور نے ترقی کر کے متوسطین کے زمانے میں شیخ ناسخؔ جیسا مصلح زبان و مجدد فن پیدا کیا جنھوں نے الفاظ کی تنقیح و تہذیب نہایت مکمل طور پر کر دی اور ان کے بعد کے شعراء اسی زبان کی پیروی کرتے ہیں البتہ دورِ جدید کے بعض شعراء ان قیود کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے۔ ان مکروہ، ثقیل اور غلط الفاظ کے ساتھ قدماء بعض مضامین بھی نہایت سبک اور مبتذل باندھتے ہیں مثلاً ؎

پڑ پڑ کے کھینے کا سارا یہ ہے خلاصہ — شاید کبھی وہ سر کا بیٹھے جا کے پاس آ (آبروؔ)

دی ہے دریا اوپر مجھے پچھی — لا اوتارا ہے میں اسے کس گھاٹ (آبروؔ)

یارو وہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا — رام اس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا (احسنؔ)

ولیؔ، میر دردؔ اور میر سوزؔ کے کلام میں بے شبہ اس قسم کے الفاظ اور مضامین نہیں پائے جاتے لیکن سوداؔ، میرؔ اور قائمؔ کا کلام اس داغ سے پاک نہیں ہے۔

غالباً اس زمانے میں ہجو گوئی کا جو عام رواج ہو گیا تھا اسی نے اس زمانے میں اس قسم کی فحش اور مبتذل زبان پیدا کر دی تھی۔

وجہ ہے کہ غزل میں بھی جہاں جہاں ہجو و بدگوئی کا موقع آیا ہے وہیں اسی قسم کی زبان استعمال کی گئی ہے۔ مثلاً واعظ، محتسب اور رقیب کو جہاں جہاں صلواتیں سنائی گئی ہیں اسی قسم کی زبان میں سنائی گئی ہیں۔ لیکن قدماء کے تیسرے دور میں زبان کسی قدر فحش الفاظ سے پاک ہوئی اور متوسطین کے دور میں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ناسخ نے زبان کو نہایت مہذب اور شائستہ بنا دیا اور آج تمام شعراء اسی زبان کے مقلد ہیں بلکہ دورِ جدید کے شعراء بوسہ اور وصل وغیرہ کا نام بھی لینا پسند نہیں کرتے۔

غالباً انہی خصوصیات کا اثر یہ ہے کہ قدماء کے کلام میں سخت ناہمواری پائی جاتی ہے مثلاً ایک غزل میں ایک شعر نہایت بلند اور دوسرا انتہائی پست ہوتا ہے۔ ایک شعر کی زبان نہایت شیریں، لطیف اور نرم ہوتی ہے اور دوسرے میں فحاشی اور بدزبانی پائی جاتی ہے۔ ایک شعر نہایت مہذب اور باوقار ہوتا ہے لیکن دوسرے شعر میں ابتذال اور رکیکی موجود ہوتی ہے۔ صرف خواجہ میر درد ایک ایسے بزرگ ہیں جن کا کلام اوّل سے آخر تک اس قدر ہموار ہے کہ اس میں انتخاب کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ میر حسن ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چوں کلامِ حافظ سراپا انتخاب۔"

ایک نامعلوم الاسم تذکرے کی عبارت جو انجمن اُردو لکھنؤ کی نمائش میں پیش کیا گیا تھا اس سے زیادہ صاف ہے:

"دیوانِ ریختہ اش اگرچہ از ہزار بیت متجاوز نیست لیکن ہمہ یکدست و احتیاج بہ انتخاب ندارد۔"

ان کے علاوہ اور جتنے قدیم شعرا ہیں سب کے کلام میں نشیب و فراز موجود ہے چنانچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سودا کے حال میں لکھتے ہیں:

"قدماء ما مانند فصحائے متاخرین پیرامونِ خاطر و جاگزینِ دل نہ این بود کہ ہر شعر دل پسند برآید، و ہر بیت خاطر نشین، لہٰذا در کلام ایشان رطب و یابس واقع شدہ، چہ در قصیدہ و چہ در غزل۔"

میر کی نسبت بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ:

"پستش بنہایت پست و بلندش بسیار بلند۔"

اگرچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے چنانچہ گلشنِ بےخار میں لکھتے ہیں:

"پستش اگرچہ اندک پست است، اما بلندش بسیار بلند۔"

تاہم جیسا کہ اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے ان کو بھی اس سے انکار نہیں کہ ان کے کلام میں جابجا پستی پائی جاتی ہے لیکن قدماء کے تیسرے دور میں سب سے پہلے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے مصحفی نے اس طرف توجہ کی اور متوسطین میں ناسخ و آتش نے زمینِ شعر کو بالکل ہموار کر دیا اور شعرائے دلّی کی فارسی ترکیبوں نے اس ہمواری میں اور اضافہ کیا۔ چنانچہ مولانا حالی اپنے دیوان کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"ان کے بعد دلّی میں مومن، غالب، آزردہ اور شیفتہ وغیرہ کے یہاں فارسی ترکیبوں نے اردو غزل میں زیادہ دخل پایا۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ غزل میں اعلیٰ درجہ کا شعر ایک یا دو سے زیادہ نہیں نکل سکتا۔ باقی بھرتی ہوتی ہے۔ اگلے شعراء شترگربگی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔

ایک دو شعر اچھا نکل آیا، باقی کم وزن اور پھسپھسے شعروں سے غزل کا نصاب پورا کر دیا بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ اپنے بھرتی کے اشعار کو فارسی ترکیبوں سے چست کر دیتے ہیں تاکہ بادی النظر میں خفیف نہ معلوم ہوں۔" (مقدمہ حالی مطبوعہ نامی پریس صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸)

لیکن غلطی سے دورِ جدید کے بعض شعراء انہی فارسی ترکیبوں کو اصلی زیور سمجھتے ہیں۔

قدماء کے دورِ اوّل کی ایک امتیازی خصوصیت ایہام گوئی یعنی رعایتِ لفظی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مرزا جانِ جاناں نے اردو شاعری کو فارسی قالب میں ڈھالنا چاہا تو سب سے پہلے راستے سے اسی سنگِ راہ کو دور کیا اور ان کے بعد تمام مصلحین شاعری نے بھی یہی روش اختیار کی لیکن با ایں ہمہ یہ خصوصیت کچھ نہ کچھ ہر دور میں قائم رہی میر مصلحین شاعری کے زمرے میں شامل ہیں لیکن یہ صنعت ان کو نہایت مرغوب ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

یاں پلیتھن نکل گیا واں غیر — اپنی تکلی چلائے جاتا ہے

یہ ہمدمی کہ دعویٰ اس کے لب خنداں سے — بس کچھ نہ چلا ورنہ پستے کو چپ جاتا

انھوں نے خود نکات الشعراء میں لکھا ہے:

"اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم است مگر بسیار شستگی بستہ شود۔"

مصحفی اگرچہ بجائے خود اس صنعت کو پسند نہیں کرتے چنانچہ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"اما فقیر اشعارِ ایہام را دوست ندارد"

✤

اس کے بعد ناسخ و آتش کا زمانہ آیا تو انھوں نے نہایت وسعت کے ساتھ اس سرمایۂ محفوظ سے کام لیا اور ان کے بعد ایک مدت تک اہلِ لکھنؤ اس صنعت میں کمالات دکھاتے رہے بالخصوص امانت لکھنوی اس شریعت کے خاتم المرسلین قرار پائے۔

✤

اس زمانے میں فارسی شاعری کا سب سے بڑا عیب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں مرد کو معشوق بنایا گیا جس سے متعدد غیر فطری مضامین پیدا ہو گئے لیکن یہ عیب اردو کے شعرائے قدیم میں فارسی شاعری سے بھی زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔

✤

شعرائے لکھنؤ نے زنانہ خصوصیات کو زیادہ نمایاں کیا یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے یہاں انگیا، کرتی، دوپٹہ، مہندی، پازیب اور چھاگل وغیرہ کے مضامین بکثرت پائے جاتے ہیں۔ البتہ شعرائے دہلی کا کلام ان دونوں قسم کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رہا بالخصوص مولانا حالی کی اصلاح کے بعد دورِ جدید کے شعراء نے ایک وجودِ مطلق کو اپنا معشوق قرار دیا جو مرد اور عورت دونوں پر یکساں صادق آ سکتا ہے۔

لیکن اگر ان معائب سے قطع نظر کر لی جائے تو قدما کا کلام متعدد حیثیتوں سے موجودہ مذاق کے بالکل مطابق ہے مثلاً اردو شاعری کی اصلاح کے متعلق جدید تعلیم یافتہ گروہ کا ایک مطالبہ یہ ہے کہ اردو اور فارسی زبان میں ردیف کا التزام گویا ایک زائد چیز

ہو گیا ہے جس سے شاعری کی پابندیاں بڑھ جاتی ہیں اور اظہارِ خیال کے لیے میدان تنگ ہو جاتا ہے۔

اس لیے ردیف کو بالائے طاق رکھ کر صرف قافیہ کا التزام کر لینا چاہیے اور قدما نے ان کے اس مطالبے کو بہت کچھ پورا کر دیا ہے۔

✣

جس طرح صوفیہ کے نزدیک شریعت کے ظاہری اور باطنی دو رُخ ہیں اسی طرح محققین کے نزدیک شاعری بھی خارجی اور داخلی دو حصوں میں منقسم ہے۔ خارجی شاعری میں اشیاء کے ظاہری خال و خط نمایاں کیے جاتے ہیں اس لیے اس سے صرف مناظرِ قدرت، وصف نگاری، مداحی اور واقعہ نگاری میں کام لیا جا سکتا ہے کیونکہ ان تمام اصناف میں شاعر صرف انھی چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے جو محسوس طور پر نظر آتی ہے۔ خود اس کو اپنے اندرونی جذبات کی آمیزش سے ان تمام چیزوں کو علیحدہ رکھنا پڑتا ہے لیکن غزل تمام تر شاعر کے اندرونی جذبات و کیفیات کی تشریح ہوتی ہے اس لیے اس میں صرف شاعری کے داخلی پہلو سے کام لیا جا سکتا ہے اور قدما کے کلام کا اصلی امتیازی وصف یہی ہے کہ انھوں نے شاعری کے ان دونوں حصوں کو بالکل الگ الگ رکھا یعنی قصائد وغیرہ میں خارجی حصے سے کام لیا ہے اور غزل کو تمام تر جذبات و کیفیات سے لبریز کر دیا۔

غزل کی یہی حقیقت ہے جس کو ولی نے نہایت اختصار کے ساتھ ایک شعر میں بیان کیا ہے ؂

ولی شعر میرا سراپا ہے درد ‏ ‏ ‏ ‏ خط و خال کی بات ہے خال خال

اور ولی کے بعد میرؔ، سوداؔ، دردؔ، سوزؔ اور مصحفیؔ وغیرہ نے اسی متن کی تفسیر کی ہے۔

✣

قدما کے دور میں سب سے پہلے مصحفیؔ، انشاؔ اور جرأتؔ نے اس طرز میں کسی قدر تغیر پیدا کیا اور خارجی مضامین یعنی خال خال خط و خال کے ذکر سے بھی غزل کو آشنا کیا اس کے بعد متوسطین کے دور میں ناسخؔ، آتشؔ اور ان کے تلامذہ نے اپنی تمام تر توجہ انھی خارجی اوصاف کی طرف مبذول کر دی اور متاخرین اساتذۂ لکھنؤ کے زمانے تک وہاں کے تمام شعرا زلف و گیسو کے پھندے میں اُلجھے رہے لیکن اساتذۂ دہلی نے قدما کی روش کو بدستور قائم رکھا اس لیے ان کی غزلیں حدودِ غزل سرائی سے باہر ہونے نہ پائیں۔

✣

شعرائے لکھنؤ میں جلالؔ نے بھی کم و بیش قدما ہی کے طرز کا تتبع کیا ہے۔

✣

اور شعرائے دورِ جدید کی گرم بازاری تو تمام تر اسی طرز کی بدولت ہے۔

(شعرالہند)

پروفیسر حامد حسن قادری

غزل کے معنی ہیں عشق و مجازی کا ذکر کرنا۔ شاعری میں غزل اس نظم کو کہتے ہیں جس میں حسن و عشق، اخلاق و تصوف وغیرہ مختلف مضامین ہوں اور ہر شعر الگ مضمون کا ہو۔

غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔ اس کو مطلع کہتے ہیں۔ اگر ایک کے بعد دوسرا مطلع ہو تو اس کو حسنِ مطلع کہتے ہیں۔ سب مطلع شروع میں ایک دوسرے کے بعد ہوتے ہیں۔ باقی اشعار میں صرف دوسرے مصرعے میں قافیہ ہوتا ہے۔ آخری شعر میں شاعر کا تخلص ہوتا ہے، اس کو مقطع کہتے ہیں۔ غزل کے عمدہ شعر کو شاہ بیت یا بیت الغزل کہتے ہیں۔

اردو شاعری فارسی شاعری کی تقلید ہے اور فارسی عربی کی۔ عربی قصائد کی تشبیب میں غزل بھی شامل تھی یعنی قصیدوں کی تمہید میں عاشقانہ مضامین لکھتے تھے اور اس کو غزل و تغزل کہتے تھے لیکن یہ تمہید غزل مسلسل ہوتی تھی۔ فارسی والوں نے اس ٹکڑے کو غزل کے نام سے مستقل صنفِ شاعری بنا لیا۔ رفتہ رفتہ غزل عشق و محبت کے مضامین تک محدود نہ رہی بلکہ مختلف و متضاد مضامین لکھے گئے۔ ایک شعر میں محبت، دوسرے میں نفرت، تیسرے میں وصل، چوتھے میں ہجر، پانچویں میں اخلاق، چھٹے میں تصوف۔ اس طرح پر غزل تمام اقسام کے مضامین و خیالات کا مجموعہ ہو گئی اور یہ رنگا رنگی غزل کی مقبولیت کا سبب بن گئی۔

(پہلا دور) جس وقت اُردو زبان بنی اور بول چال میں آنی شروع ہوئی اسی وقت سے فارسی شاعروں نے ایسی غزلیں کہنی شروع کر دی تھیں جن میں آدھا مصرع فارسی آدھا اُردو یا ایک مصرع فارسی ایک اُردو ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو دہلوی (وفات [illegible]) کی بعض غزلیں اسی طرح کی موجود ہیں۔ مثلاً امیر خسرو کی غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

بگا ایک از دل دو چشمِ جادو بصد فریبم بہرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

اس کے بعد اُردو ہی میں غزلیں لکھی جانے لگیں۔ کبیر داس (وفات ۱۴۹۸ء) مشہور درویش اور شاعر گذرے ہیں۔ ان کی غزل کا مطلع ہے ؎

ہمن ہے عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا
رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا

اس کے بعد اکبر و جہانگیر کے زمانے میں بھی بعض شعراء نے غزلیں لکھیں۔ اسی زمانے میں دکن کی سلطنتِ گولکنڈہ کا بادشاہ محمد قلی قطب شاہ (وفات ۱۶۱۱ء) بڑا زبردست اُردو شاعر تھا۔ اس کا کلیاتِ نظم جس میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، رباعیاں، مرثیے سب کچھ ہیں، حیدرآباد کے سرکاری کتب خانہ آصفیہ میں محفوظ ہے۔ اس کے دو شعر یہ ہیں ؎

قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند   دوانے کو کچھ پند دیا جاتے نا

مجھ عشق کے گدا کوں او رنگ شاہی دیا   سب عاشقاں منج انگے ہیں طفل جوں دبستاں

(دوسرا دور) قطب شاہ کے زمانے کے بعد غزل کا سب سے بڑا شاعر ولی اورنگ آبادی ہے۔ ولی کے کلام میں پہلے دکنی الفاظ اور محاورے زیادہ ہوتے تھے۔ جب وہ دہلی آئے تو یہاں کی زبان لکھنے لگے۔ شروع میں ولی نے بھاشا کی شاعری کو انداز بیان اور خیالات و جذبات اختیار کئے اور ایسے شعر بھی لکھے ؎

ہر دگی جو گہاتے ہیں انھیں گھر بار کیا کرنا   ہو جوگن جو کوئی پی کی اسے سنسار کیا کرنا

پھر ولی کا اثر قبول کیا اور ایسا بھی کہا ؎

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

اس دور کے اور شاعر آبرو، ناجی، مضمون، یکرنگ، آرزو وغیرہ ہیں۔ اس زمانے میں ایہام گوئی اور رعایتِ لفظی کا بہت شوق و رواج تھا۔ مثلاً یکرنگ کا شعر ہے ؎

اس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال
یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں

(تیسرا دور) اس زمانے میں شاہ حاتم دہلوی (۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۲ء) نے غزل کی زبان، الفاظ، محاوروں میں اصلاح کی۔ مرزا جانجاناں دہلوی (۱۶۹۹ء تا ۱۷۸۱ء) نے ایہام گوئی کو ترک کیا اور سلاست و واقعیت، لطف و تاثیر کا خیال رکھا۔ مثلاً ؎

ستم سے تیرے میں جاتا ہوں پھر نہ کہیو تو — کہ آشنائی کا حاتم نباہ بھی نہ کیا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم — کہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانجاں اپنا

(چوتھا دور) اس دور کے تین شاعر غزل گوئی میں سب سے مشہور ہیں۔ سودا، درد، میر۔ ان کے بعد میر سوز، میر حسن، یقین، بیان کا درجہ ہے۔ اس زمانے میں جس قدر خوبیاں اور دلکشیاں زبان و بیان، سادگی، صفائی، لطف و اثر کے اعتبار سے پیدا ہوئیں اس سے پہلے اور اس کے بعد نظیر نہیں ملتی۔ مثلاً ؎

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں — یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی — جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

(پانچواں دور) اس زمانے کے شاعر گزشتہ دور والوں کے ساتھی ہیں لیکن ان سے کچھ چھوٹے یعنی مصحفی، میر، اثر، جرأت، انشا، رنگین وغیرہ۔ ان شاعروں کی غزل میں اکثر وہی خوبیاں ہیں جو پہلے تھیں، صرف میر تقی کا سوز و گداز، میر درد کا تصوف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جرأت، انشا و رنگین نے ادنیٰ جذبات اور بازاری معاملات و زبان کا اضافہ کر دیا ہے۔ زبان پہلے سے کچھ زیادہ صاف و پختہ ہو گئی ہے۔ نمونہ یہ ہے ؎

پھٹ چکا جب سے گریباں اپنا — ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
مصحفی یار کے گھر کے آگے — ہم نے کتنے پہرے بیٹھے ہیں

دلِ وحشی کو خواہش ہے تمہارے در پہ آنے کی
دوانہ ہے ولیکن بات کرتا ہے ٹھکانے کی

(چھٹا دور) یہ زمانہ جو ۱۸۱۰ء سے شروع ہوتا ہے، زمانۂ انقلاب ہے۔ دہلی کے قدیم شاعروں کی سی سادگی اور شیرینی

ختم ہوگئی۔ لکھنؤ کی شاعری اور اس کے ساتھ مضمون آفرینی، تصنع، آورد شروع ہوگئی۔ لیکن ناسخ لکھنوی نے زبان اور شاعری میں اصلاح کر کے اور قاعدے مقرر کر کے بالکل صحیح و فصیح بنا دیا اور بیہودہ مضامین بھی ترک کر دیے۔ اس زمانے کے مشہور شاعر نصیر دہلوی، ناسخ لکھنوی، آتش لکھنوی، شہید بریلوی وغیرہ ہیں۔

(ساتواں دور) یہ زمانہ غزل میں بلند مضامین، نازک خیالات اور نئے نئے انداز بیان کا ہے۔ دہلی کے شعرا مومن، ذوق، غالب کی غزلیں زبان یا بیان کے اعتبار سے اُردو میں نہایت قیمتی جواہر ہیں۔ لکھنؤ میں وزیر، رند، صبا، رشک وغیرہ نے اپنے استادوں سے بہتر مضامین نہیں پیدا کیے لیکن زبان و محاورات کو اور زیادہ صاف کر دیا۔

(آٹھواں دور) اس زمانہ میں (جو ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک ہے) ناسخ اور وزیر کی سی مضمون آفرینی بھی نہیں ہے اور مومن و غالب کی سی نزاکت اور باریکیٔ خیال بھی نہیں بلکہ یہ سب خوبیاں کسی قدر کم اور معتدل طریقے سے پہلے سے زیادہ دلکش زبان کے ساتھ مل گئی ہیں۔ دہلی کے داغ، حالی، ظہیر، انور وغیرہ اور لکھنؤ کے امیر، جلال، تسلیم وغیرہ مشہور غزل گو شعرا ہیں۔

(نواں دور) موجودہ بیسویں صدی کے شروع میں یعنی امیر، داغ، جلال کے انتقال کے بعد قدیم طرز کی غزل کے ساتھ ساتھ جدید رنگ کی غزل گوئی بھی جاری ہوگئی۔ جو شاعر پرانے انداز و خیالات کے دلدادہ تھے مثلاً بیخود، سائل، ریاض، جلیل، مضطر وغیرہ وہ اپنی طرز پر قائم رہے لیکن بعض بزرگ شعرا مثلاً شاد عظیم آبادی، صفی لکھنوی نے پامال روش کو چھوڑ کر غزل کو پاکیزہ اور سنجیدہ بنا دیا۔ رشک و رقابت کے مضامین، معشوق کے حلیہ اور زیب و زینت کا ذکر، پست و ادنیٰ جذبات و معاملات سب ترک کر دیے اور غزل کو روحانی کیف و نشاط سے بھر دیا۔ یہ بزرگ غزل جدید کے پیش رو ہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں ان سے کم عمر شاعر بھی ہیں جن کی شاعری بیسویں صدی ہی میں شروع ہوئی مثلاً حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، صفدر مرزاپوری، فانی بدایونی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی وغیرہ۔ ان شعراء نے اس سنجیدگی و پاکیزگی، روحانیت و حقیقت، نزاکت و لطافت کو جو شاد و صفی نے شروع کی تھی اپنے مذاق و طبیعت اور فکر و تخیل کے ذریعے سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ (تاریخ و تنقید ادبیات اُردو)

ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب

میں غزل کی خوبیوں کا دل سے قائل ہوں مگر نہ غزل گوئی پر ایسا فریفتہ ہوں کہ شاعر اور متشاعر میں امتیاز نہ کر سکوں، نہ غزل کا ایسا شیفتہ ہوں کہ مسلسل نظموں سے لطف اندوز نہ ہو سکوں۔ اُردو شاعری میں جو نئے تجربے کیے جا رہے ہیں، جو نئے میدان نکالے جا رہے ہیں، جو نئی نئی شکلیں اختیار کی جا رہی ہیں ان میں سے بعض چیزوں کو انفرادی طور پر غلط یا مضر سمجھنے کے باوجود مجموعی طور سے ان کو اُردو شاعری کی حیات کے آثار اور ترقی کے اسباب سمجھ کر ان کی قدر کرتا ہوں، مگر ہمارے وہ شاعر جو قدیم اصنافِ سخن میں دادِ سخنوری دے چکے ہیں اور کمالِ شاعری صرف کر چکے ہیں ان کے کارناموں کو غلط فہمی کی بدولت مٹتے نہیں دیکھ سکتا اور شاعری کا جو سرمایہ ہماری زبان نے دو تین صدیوں کی طویل مدت میں جمع کیا ہے اس کو تلف ہوتے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔

(نگار، انتقاد نمبر ۱۹۳۶ء)

نیاز فتحپوری

لفظ "غزل" کے لغوی معنی اس قدر عام و مشہور ہو چکے ہیں کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، جس نے محبت کی ہے اسے تو خیر جاننا ہی چاہیے لیکن جو اس کوچہ سے نابلد ہے، اس کو بھی سماعی یا قیاسی طور پر معلوم ہوگا کہ "محبوب سے باتیں کرنے کا نام غزل و تغزل ہے یا مغازلہ اگر یہ گفتگو باہمدگر ہو" اب غور طلب امر یہ ہے کہ "محبوب سے ایک عاشق کیا باتیں کر سکتا ہے اور ان باتوں کا انداز و لب و لہجہ کیا ہونا چاہیے"؟

محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے اور اسی احساس و تاثر کے اظہار کا نام شعر ہے۔ ہم کسی پھول کو دیکھتے ہیں اور اس کے رنگ و بو سے متاثر ہو کر اس کی تعریف کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے، ہم شفق کی رنگینی سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ ہم قوس قزح کو دیکھتے ہیں اور بے اختیارانہ کلمات تحسین زبان سے نکل جاتے ہیں یہ بھی شعر ہے۔ اس طرح کائنات میں قدرت کے جتنے مظاہر و آثار ہیں وہ سب انسان کے احساس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور جو کیفیت ان سے پیدا ہوتی ہے اس کو ظاہر کر دینا شعر ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس اظہار میں ترنم کو قائم رکھا جائے اور اسی ترنم کے پیدا کرنے کے لیے مخصوص لب و لہجہ اور مخصوص اوزان مقرر کیے گئے ہیں۔

پھر اگر یہی جذبہ پسندیدگی افراد نوع انسانی سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے لیکن جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے۔ اس جذبہ سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ محبت، ماں، بھائی، اولاد اور عزیز و احباب سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں، اس کا تعلق صرف ایسے فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی و روحانی محبت بھی ہے جسے (INTELLECTUAL LOVE) کہتے ہیں، لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیت سے علیحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے مان لیا جائے کہ اس عنقا کا وجود ممکن ہے تو بھی اس کا غزل گوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔

الغرض تغزل کا تعلق میرے نزدیک صرف اُن جذبات محبت سے ہے جو اس گوشت و پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بظاہر معلوم ہوگا کہ یہ نہایت محدود چیز ہے، عاشق نے کہا "میں تم پر جان دیتا ہوں" معشوق نے کہا "میری بلا سے" چلیے قصہ ختم ہو گیا لیکن اگر آپ اس سلسلہ میں ان تمام کیفیات و جزئیات پر نگاہ ڈالیں جو اسی ایک خواہش جنسی سے متعلق ہو سکتے ہیں تو آپ کو اس کی وسعت کا اعتراف کرنا پڑے گا......

دور حاضر کی غزل گوئی خواہ وہ لکھنؤ میں ہو یا لکھنؤ سے باہر، بالکل دہلوی رنگ کی ہے اور اب عام احساس اس امر کا ہو چلا ہے کہ تغزل کا تعلق صرف جذبات سے ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ تاثرات کا نتیجہ نظر آئے

نہ کہ محض تصورات کا۔

(انتقادیات دوسرا حصہ)

غزل کے آپ جتنے دور چاہیں قائم کریں، لیکن ولی اور میر کے زمانے سے لے کر چند سال پہلے تک "حسن و جمال" کا ذکر خالص عشق و محبت کی زبان میں کم و بیش ہر دور میں غرض مشترک کی حیثیت سے پایا جاتا تھا۔ لیکن اب کچھ زمانہ سے "درحسن اس پریوش" کا ختم ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن "وہ بیان اپنا" ضرور بدلتا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ تبدیلی دفعتاً نہیں ہوئی، بلکہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے آہستہ آہستہ ہر دور میں کچھ تغیر ہوا اور اس تغیر کا اثر چونکہ موضوع شاعری پر بھی پڑا، اس لیے غزل کی زبان اور اس کا اسلوب بیان بھی بدلتا رہا، لیکن اب اس تغیر نے چونکہ انقلاب کی صورت اختیار کر کے غزل گوئی کی طرف سے انحراف و بغاوت کے جذبات لوگوں میں پیدا کر دیئے ہیں، اس لیے ہم اب اسے نمایاں طور پر محسوس کرنے لگے ہیں۔

غزل میں سب سے پہلی آمیزش فلسفہ و تصوف کی ہوئی اور اس میں شک نہیں کہ جس نے اول اول غزل گوئی میں یہ مذہب اختیار کیا وہ سخت "دنا کافر" انسان تھا جو ہمارے کرۂ زمین کے "دلبران مہوش" کی "کارگاہِ حسن و محبوبی" کو ہمیشہ کے لیے ویران کر گیا۔

(نگار۔ جنوری فروری ۱۹۴۱ء)

ڈاکٹر یوسف حسین خان

گزشتہ دو برس میں میر صاحب کے زمانے سے لے کر حسرت و جگر کے موجودہ دور تک اُردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا۔ اس سے صاف طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جاندار ہونے کی دلیل ہے۔ ہر غزل گو شاعر کے کلام میں ہمیں ایک قسم کی مخصوص فضا ملتی ہے جو اس شاعر کی داخلی کیفیات اور ان تمدنی احوال کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں اس نے نشوونما پائی ہے۔ حسرت و جگر کے ہاں حسن و عشق کے معاملات کا اظہار اس سے ایک حد تک مختلف ہے جو ہمیں میر و غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ دنیا کی ہر چیز ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ آج ہمارا لباس، ہماری معاشرت اور طرزِ فکر و احساس وہ نہیں جو اگلے زمانے کے لوگوں کا تھا۔ ہمارے موجودہ دور کا غزل گو شاعر بعض اوقات حسن و عشق کو تجریدی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ جس کی مثال اردو کے ابتدائی یا درمیانی دور کے شاعروں کے یہاں نہیں ملتی۔ وہ اب احساسِ جمال کو حیات و کائنات کے سمجھنے کے لیے بطور پیرِ قدر استعمال کرتا ہے جس سے اس کے پیشرو بڑی حد تک نابلد تھے اور اگر واقف تھے تو بالکل مبہم طور پر......

مولانا حالی نے غزل پر جو نکتہ چینی کی وہ اصلاحی تحریکات کے تحت تھی نہ کہ ادبی مقاصد کے تحت۔ انھیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے۔ عشق عقل اور اخلاق کو خراب کرنے والی چیز ہے۔ اس سے جتنا بھی اجتناب کیا جائے اتنا ہی قوم کی صلاح کی ترقی کا موجب ہوگا کہ یہ بیکاری کا مشغلہ ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر سطحی ہے۔ مولانا حالی کی نیک نیتی اور ان کے اخلاص میں شبہ نہیں۔ لیکن اس ضمن میں ان کا مشورہ قابلِ قبول نہیں۔ یہ بات ہمارے ادبی مزاج کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ مولانا حالی کے مشورہ کو قبول نہیں کیا گیا۔ اگر قبول کیا جاتا تو ہماری زبان حسرت اور جگر اور فانی اور اصغر کی زمزمہ سنجیوں سے

•

•

محروم رہتی جو ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا:۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے پچیس تیس سال میں غزل نے نظم پر اور نظم نے غزل پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ غزل کی ریزہ کاری اگرچہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہدِ جدید کی زندگی کا رجحان کلام میں تسلسل کا متوقع رہتا ہے، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ غزل میں تسلسل پیدا کیا جائے گا اور منفرد اشعار کے پس منظر میں وحدتِ احساس کی کارفرمائیاں بڑھتی جائیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی اپنے اندر رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعہ تغزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے سے قریب آجائیں گی۔

"غزل"

ڈاکٹر سید عبداللہ

غزل اپنی تعمیر و ترکیب کے لحاظ سے نہایت خوشگوار امتزاج کی متقاضی ہے۔ لفظ و معنی کا حسین و لطیف پیوند، جذبے کی سچائی اور کیفیت ـــ خونِ جگر اور لطفِ نظر کا امتزاج ایک خاص قسم کی نغمگی اور موسیقیت یہ سب ایک اعلیٰ غزل کی خصوصیات ہیں۔ غزل حسن کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ذرا سی بے اعتدالی بھی ناگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔ کامل تناسب اور موزونیت غزل کی بنیادی صفت ہے اور اعتدال و توازن اس کی اساسی شرط۔

اچھی غزل کی بڑی ظاہری خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ ساخت کے اعتبار سے متناسب ہو۔ علمائے فن نے غزل کی ساخت میں تعدادِ اشعار کو معین اور محدود کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور غزل کی طوالت کو عیب قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کا جسم ایک خاص صورت رکھتا ہے۔ جس کے حسن کے لیے ہر دوسرے جسم کی طرح تناسب کا لحاظ ضروری ہے۔ غزل کے اشعار تعداد میں جب آٹھ نو سے بڑھ جاتے ہیں تو عموماً اس کے جسم میں ڈھیلا پن، بے ڈھنگا پن اور کھوکھلا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور غزل کا جسم اپنے تناسب کو کھو بیٹھتا ہے۔ اور غزل اپنے مرکزِ ثقل سے ہٹ جاتی ہے۔

غزل میں مرکزِ ثقل سے مراد وہ مرکزی جذبہ ہے جس سے غزل کی تحریک ہوتی ہے، یا وہ خیال جو غزل کا سب سے نمایاں خیال ہوتا ہے۔ اگرچہ مشاعرے کے رواج نے غزل کو میکانکی عمل بنا دیا ہے۔ اور اس کے لیے عموماً مصرع طرح کے سوا کوئی خارجی تحریک ضروری نہیں سمجھی جاتی، مگر اصلی شاعری کسی بھی جذباتی تحریک کے بغیر نمودار نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لیے سب بڑے غزل گو وں کی غزل میں یہ نمایاں جذبہ یا مرکزی خیال (جو اس غزل کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے) صاف صاف نظر آجاتا ہے۔ یہ مرکزی جذبہ ہر اچھی غزل میں ضرور ہوتا ہے۔ باقی لہریں غزل میں اس مرکزی جذبے کے زیرِ اثر نمودار ہوتی ہیں۔

اس خاص پہلو سے غزل میں تعدادِ اشعار کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ جب غزل میں اشعار کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے تو غزل کے مرکزی جذبے کا اثر بکھر جاتا ہے۔ قوافی کے تقاضوں سے بعض اوقات متضاد اور بے آہنگ مضمون پیدا ہو جاتے ہیں۔ بالآخر جذبے کے بالمقابل دوسری لہریں اس بے ہنگم طریق سے غزل میں جمع ہو جاتی ہیں کہ غزل کا سرچشمۂ تحریک بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے غزل کی غزلیت کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

(بحث و نظر)

کلیم الدین احمد

اُردو شاعری میں ایک انقلاب رونما ہوا لیکن غزل کی اہمیت اور ہردلعزیزی میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی۔ آج بھی غزلوں کی وہی فراوانی ہے جو عصرِ حاضر کے آغاز سے پہلے تھی۔ اس کی ایک وجہ تو صنفِ غزل کی آسانی ہے۔ غزل کے لیے نہ قوتِ حاسہ کی ضرورت ہے نہ ادراک درکار ہے۔ تخیل اور قوتِ تعبیر کی بھی ضرورت نہیں۔ کسی مکمل ذاتی تجربہ کی ترجمانی مقصود نہیں۔ خیالات و جذبات موجود ہیں الفاظ، بندشیں، ترکیبیں بھی موجود ہیں، بحور و اوزان بھی موجود ہیں۔ ذرا زحمت کی اور غزل تیار ہو گئی۔ جب اس قدر سہل و آسان طریقے پر شاعر بن سکتا ہو تو پھر کوئی کسی دشوار گزار راستے کی طرف توجہ ہی کیوں کرے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو اعتراضات غزل پر کئے گئے وہ مضامینِ غزل سے وابستہ تھے۔ کسی نے صنفِ غزل کی خامیوں کو آشکارا نہ کیا اور یہ ممکن ہی کب تھا جب وہ شعوری طور پر اس کے نقائص سے آگاہ بھی نہ تھے۔ حالی و آزاد نے غزل کو حسن و عشق کی قید سے آزاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ غزل حسن و عشق کی قید سے آزاد تو نہ ہو سکی لیکن پھر کچھ زیادہ آزادی کے ساتھ فضا میں سانس لے سکی۔ نئے نئے مضامین خصوصاً اخلاقی مضامین داخلِ غزل ہو گئے۔ لیکن حالی اور آزاد کی کوششوں سے کوئی اہم تغیر پیدا نہ ہو سکا اور اُردو شعرا اپنے پرانے راستے پر چلتے رہے اس لیے ضرورت ہوئی کہ حالی اور آزاد کی تحریک کا اعادہ کیا جائے۔ شعراء کے ایک طبقہ نے از سرِ نو غزل کی حدود کو وسعت دینے کی کامیاب کوشش کی۔

سیماب کہتے ہیں:

> "ہمارے معزز شعرائے متغزلین آج بھی اپنی اکثریت کے ساتھ تفریحی و نقالی شاعری کی ترویج و تہذیب میں بدستور مصروف و منہمک ہیں۔ وہ شاعری اور مشاعروں کو صرف تحفظِ محاورہ و زبان کا ذریعہ سمجھ کر ان کے احیا کی کوشش میں مگر تمام ہیں مگر اپنے محور و ماحول سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھے۔ وہی ان کی شاعری ہے، وہی مشاعرے اور وہی ردیف و قافیہ کی طرف رنگینیاں ہیں۔"

شاعری کی حیثیت اور اس کی اہمیت سے وہ آشنا نہیں۔ شاعری اور غالباً شاعری کو وہ غزل کا مترادف سمجھتے ہیں محض ایک ذریعۂ تفریح ہے اور وقتی تفریح کے علاوہ اگر اس سے کوئی فائدہ منظور ہے تو وہ تحفظِ محاورہ و زبان کا تحفظ۔ اس لیے وہ پرانے فرسودہ خیالات و مضامین کو روزمرہ اور بامحاورہ زبان میں بیان کرتے ہیں۔ سیماب بھی حالی و آزاد کی طرح اصلیت کے فقدان پر زور دیتے ہیں اور تقلید اور نقالی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ نقطۂ نظر نیا نہیں، حالی و آزاد کا ہے۔ حالی کی طرح سیماب بھی اخلاقی معیار سے شعرائے متغزلین کو جانچتے ہیں۔ مضامین ہی نہیں، زبان پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور شعرا کی تنگ نظری کا انکشاف کرتے ہیں:

> "ٹکسالی زبان کے حامیوں کا ایک گروہ ہے جو چاہتا تو یہ ہے کہ زبان کی سالمیت پر حرف نہ آئے مگر فی الحقیقت اس کی ترقی کی راہیں بند کرنے کا خواہشمند ہے۔ نئے الفاظ، نئے معانی اور نئے اسالیبِ بیان سے حد سے زیادہ ڈرنا ایک زبان کے لیے اس سے کچھ ہی کم مہلک ہے جتنا کہ ان خطرات کی قطعی روک تھام نہ کرنا۔"

حالی نے بھی زبان کی طرف توجہ کی تھی اور جس طرح حالی نے غزل کو ابتذال سے نکالنے کے لیے چند مشورے پیش کیے تھے۔ اسی طرح سیماب بھی اپنے مشورے پیش کرتے ہیں۔ یہ حالی کے ہم خیال ہیں:

"صحیح تغزل کی روح واردات و جذبات ہیں۔ جو کیفیت حقیقتاً ہم پر طاری ہو، جو واقعات ہمارے مشاہدے اور مطالعے میں آئیں وہی ہماری غزل کا اصلی موضوع ہیں۔ فلسفۂ حسن و عشق، عرفان و حقیقت شناسی، درس و پیام، واردات و جذبات اور محاکات سب موضوعات غزل ہیں لیکن یہ تغیر صرف مضامین پر منحصر نہیں زبان میں بھی تغیر لازم ہے۔ میں زبان کی سادگی کو خیالات کی پاکیزگی اور جذبات کی بلندی کی عدم موجودگی میں غلط خیال کرتا ہوں۔ غزل کی صحیح زبان اور صورت یہی ہو سکتی ہے کہ زبان علمی، الفاظ منضبط و لطیف، پرشوکت و نغمہ بار ہوں۔ سادگی کے ساتھ مناسب فارسی تراکیب اگر بے تکلف استعمال کی جائیں تو یقیناً غزل میں بلندی پیدا ہو سکتی ہے۔"

یہ خیالات کچھ نئے نہیں اور ان خیالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید رنگِ غزل کے علمبردار واقعی کوئی جدید رنگ قائم کرنا نہیں چاہتے۔ وہ غزل میں پھر وہ اصلیت و واقعیت، وہ متنوع خیالات وہ شوکت و رفعت دیکھنا چاہتے ہیں جو میر، درد، سودا، غالب اور مومن میں موجود ہیں۔ فرسودہ خیالات، عامیانہ الفاظ غزل میں نہ ہوں۔ خیالات رفیع و بلند ہوں، جذبات ذاتی ہوں۔ اگر خیالی ہوں تو بھی دل میں محسوس کیے گئے ہوں۔ الفاظ بھی لطیف، علمی اور پرشوکت ہوں۔ سیماب اور جس طبقے کے خیالات کے وہ ترجمان ہیں صنفِ غزل کے نقائص سے واقف نہیں۔ وہ بھی غالباً حالی ہی کی طرح غزل کو شاعری کی ایک ضروری صنف سمجھتے ہیں۔ یہ وہم و گمان بھی نہیں کہ غزل اپنی صنفی خامیوں کے سبب سے "فنونِ لطیفہ میں ایک فنِ لطیف و شریف" کبھی نہیں جا سکتی اور اردو شاعری ترقی کر ہی نہیں سکتی جب تک غزل سے ایک مدت کے لیے کنارہ کشی نہ کی جائے۔ بہر کیف نئے اور پرانے رنگِ تغزل کی مثال اقبال کی ان دو غزلوں میں ملتی ہے۔ پرانا رنگ ؎

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی ... مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا ... خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا ... تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد ... مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

نیا رنگ ؎

پھر بادِ بہار آئی اقبال غزل خواں ہو ... غنچہ ہے اگر گل ہو گل ہے تو گلستاں ہو
تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت سے ... برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری — تو نغمۂ رنگیں ہے ہر گوش پہ عریاں ہو

اے رہرو فرزانہ رستے میں اگر تیرے — گلشن ہے تو شبنم ہو، صحرا ہے تو طوفاں ہو

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل غارت گرِ ساماں ہو

پہلی غزل میں خیالات محض معمولی ہیں۔ ان کو سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خیالات صرف معمولی ہی نہیں فرضی بھی ہیں۔ ان خیالات و جذبات نے شاعر کے دل میں ہیجان اور تخیل میں طوفان نہیں برپا کیا ہے اس لیے ان میں اصلیت مفقود ہے۔ اسی اصلیت کی کمی کی وجہ سے زبان اپنی سادگی کے باوجود بالکل پھیکی اور بے رنگ معلوم ہوتی ہے لیکن شعرا کا ایک معتدبہ حصہ ابھی تک اسی قسم کی شاعری کے دام میں پھنسا ہوا ہے جس کا نمونہ ان دو مصرعوں میں ملتا ہے:

(۱) "خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی"

(۲) "تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی"

اسی پر سر دھنتا ہے اور ایسی غزلوں کی بناء پر اپنے کو شاعر کہلانے کا مستحق سمجھتا ہے۔ اس قسم کی غزلیں معیارِ شاعری پر پوری اتر نہیں سکتیں۔ اگر انھیں غزلیت کے معیار سے بھی جانچا جائے تو نہایت ہی مبتذل ثابت ہوں گی۔ دوسری غزل بھی غزل ہے۔ نظم میں اقبال پھر غزل خواں ہوتے ہیں لیکن یہاں ایک دوسرا عالم ہے۔ خیالات غزل کے رسمیہ خیالات سے یکسر مختلف ہیں۔ ہر شعر میں ایک پیغامِ عمل پنہاں اور رازِ زندگی مستور ہے۔ خیالات بذاتِ خود اہم و بلند پایہ ہیں لیکن ان کی اہمیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان میں اصلیت موجود ہے۔ یہ محض فرضی اور خیالی نہیں، تقلید و نقالی کا نتیجہ نہیں اس لیے ان میں گرمیِ جذبات اور رنگِ تخیل دونوں چیزیں موجود ہیں۔ خیالات کی بلندی نے الفاظ کو بھی رفیع و بلند پایہ بنا دیا ہے۔ ایک طرف یہ رنگ ؎

بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

جس میں اگر کوئی حسن ہے بھی تو محض لفظی، مضمون عامیانہ اور طرزِ ادا بھی انفرادی نہیں اور دوسرا رنگ ایسا ؎

ساماں کی محبت میں مضمر ہے تن آسانی
مقصد ہے اگر منزل غارت گرِ ساماں ہو

جس سے ولولے بھڑک اٹھیں اور دل اولوالعزمی کی جولانگاہ بن جائے۔ صحیح جوش نے ہر ہر لفظ میں ایک بے پناہ زور ڈال دیا ہے۔

•

پرانے رنگ کے علمبردار ایک دائرۂ محدود سے نکلنا اور رنگ و اختیار کی مقررہ قیود سے باہر آنا کفرِ شاعری سمجھتے ہیں۔ اس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی میں اور اُس کوٹھی کے دھان اِس کوٹھی میں منتقل کرنا ان کا ایک مستقل مگر مہمل شغل ہے۔

"عوام ہی نہیں اکثر کہنہ مشق و قادر الکلام شعرا بھی اسی شغل میں منہمک نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ غزل سے سرِ مو بھی تجاوز کریں یا اس کے اسالیب و موضوعات میں فلسفہ و تصوف کی گنجائش پیدا ہو۔ یہ رموز تر کی ترویج کے حامی ہیں۔ رعایتِ لفظی اور

محاورہ بندی کو اصل شاعری سمجھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں لطفِ بیان کے سوا کچھ بھی نہیں اور اس معاملہ میں بھی وہ اپنے متقدمین داغ و امیر کے پایہ تک نہیں پہنچتے اس لیے وہ ناپائیدار اور نامکمل فرحت بھی جو صنفِ غزل سے حاصل ہوتی ہے ان کی غزلوں میں نہیں ملتی۔ ان غزلوں کی اہمیت محض شاعرانہ مشق کی سی ہے اور یہ مشق بھی زیادہ تحسین کے لائق نہیں۔ کیونکہ شاعر کسی جدتِ طرز یا انفرادیت کا ثبوت نہیں پیش کرتا۔ ذوق کی طرح یہ سنگلاخ زمینوں کو سرسبز و شاداب نہیں کرتے ہیں۔ چند مثالوں سے یہ نکتے واضح ہو جائیں گے:۔

۱۔ ریاض خیرآبادی

فرمائشیں شباب میں ہیں حسنِ یار کی ‏— محرم بنے نقاب عروسِ بہار کی
بے بال و پر بھی آج قفس لے کے اڑ گئے ‏— کس نے اڑائی آمدِ فصلِ بہار کی
مینائے سبز اور یہ جامِ زمردیں ‏— کون ان کے ہوتے سیر کرے سبزہ زار کی
خم کیا ہے گھر بھی کوئی جو بھر دے شراب سے ‏— نیت کبھی بھرے گی نہ مجھ بادہ خوار کی
یہ شوخیاں نہیں ہیں تیری اے نگاہِ شوخ ‏— یہ بے قراریاں ہیں دلِ بے قرار کی

زبان صاف و سادہ و پاکیزہ ہے۔ خیالات و جذبات میں کوئی جدت یا اصلیت نہیں۔ جو شعرائے متقدمین کہہ چکے ہیں انہی خیالات کی تکرار مقصود ہے اور ساری توجہ محض زبان پر صرف کی گئی ہے۔ مطلع میں خیال کی طرف یک قلم توجہ نہیں۔ چند الفاظ کو ایک شعر میں منسلک کر دیا گیا ہے اور بس۔ دوسرے شعر میں رعایتیں ہیں۔ یہ لفظی رعایتیں "بے بال و پر" "اڑ گئے" "اڑائی" ہیں۔ اسی طرح "سبز" "زمردیں" "سبزہ زار" "گھر بھر دے" "نیت نہ بھرے گی"۔ تمام ہی رعایت پیشِ نظر ہے۔ اگر قارئین کو دعوت دی جاتی ہے تو اسی لفظی ضیافت کی۔ اس ضیافت میں بھی کھانا باسی اور بے مزا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر دو شعرا کسی لفظی ضیافت میں مدعو ہوئے ہیں تو وہاں سے کچھ ٹکڑے پارچے چرا کر لے آتے ہیں اور انہی ٹکڑوں یا پارچوں سے دوسروں کی ضیافت کرتے ہیں۔ پہلا مزا تو ممکن ہی نہیں اکثر اس کا شائبہ موجود ہوتا ہے اور بس۔ بہرکیف آخری شعر میں کچھ شوخی ہے اور "شوخیاں" اور "نگاہِ شوخ" ایک طرف "بے قراریاں" اور "دلِ بے قرار" دوسری جانب اس توازن سے کچھ لطف حاصل ہوتا ہے لیکن یہ بھی محض الفاظ سے وابستہ ہے۔

۲۔ جلیل

شریکِ بزمِ جاناں کب کوئی دیوانہ ہوتا ہے ‏— جو ہوتا ہے تو شمعِ حسن کا پروانہ ہوتا ہے
سمجھ والے سمجھ سکتے نہیں رازِ محبت کو ‏— وہی کچھ باخبر رہتا ہے جو دیوانہ ہوتا ہے
جفا ہو یا لگاوٹ ہو ادا ہو یا رکاوٹ ہو ‏— طرحداروں کا ہر انداز معشوقانہ ہوتا ہے
شبِ وعدہ یہاں آخر ہوئی جاتی ہے دم بھر میں ‏— وہاں زلفِ پریشاں میں ابھی تک شانہ ہوتا ہے

آخری دو شعروں میں خیالات نہایت ہی عامیانہ ہیں۔ اسی قسم کے خیالات عام طور سے نظم کیے جاتے ہیں اور ان کی ستائش ہوتی ہے اور سامعین سر دھنتے ہیں اور بار بار پڑھتے ہیں ؎

شبِ وعدہ یہاں آخر ہوئی جاتی ہے دم بھر میں ‏— وہاں زلفِ پریشاں میں ابھی تک شانہ ہوتا ہے

یہ وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ خیال پیش پا افتادہ ہے۔ اصلیت سے جدا ہے اور بندشِ الفاظ میں چستی کے سوا اور کوئی حسن بھی نہیں۔ طرزِ ادا انفرادی نہیں۔ ہر شاعر اس قسم کے اشعار بآسانی نظم کر سکتا ہے۔ جہاں شاعر کے ذہن میں "شانہ" کا قافیہ آتا ہے وہاں "زلفِ پریشاں" کا خیال بھی لازمی ہے۔ پھر ردیف کی رعایت سے "زلفِ پریشاں میں شانہ ہوتا ہے" کا مضمون مرتب ہوتا ہے ایک مصرع اور پھر مصرع "وہاں زلفِ پریشاں میں ابھی تک شانہ ہوتا ہے" نظم ہو گیا۔ پھر "وہاں" "ابھی تک" کی رعایت مدِ نظر رکھتے ہوئے دوسرے مصرع کی تخلیق میں کوئی دشواری پیش نہیں آ سکتی۔ اسی قافیہ پیمائی کو شاعری تصور کیا جاتا ہے۔ پہلے تین شعروں میں بھی خیالات نئے نہیں لیکن وہ مبتذل بھی نہیں۔ خیالات کی بلندی کی وجہ سے الفاظ اور لہجے میں بھی بلندی نمایاں ہو گئی ہے ——— اشعار میں شوکت اور متانت آ گئی ہے ؎

سمجھ والے سمجھ سکتے نہیں رازِ محبت کو
وہی کچھ باخبر ہوتا ہے جو دیوانہ ہوتا ہے

رعایتِ لفظی یہاں بھی ہے۔ "سمجھ" "سمجھ والے" "باخبر" "دیوانہ" لیکن قارئین کی توجہ دامِ الفاظ میں پھنس کر رہ نہیں جاتی۔ یہ اس خیال سے بھی باخبر ہوتی ہے جس کا اس شعر میں اظہار کیا گیا ہے۔ خیال کی اہمیت الفاظ پر غالب ہے۔ غور طلب امر یہ بھی ہے کہ ابھی تک ایک غزل میں شعراء ہر قسم اور ہر مرتبہ کے اشعار داخل کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ غزل میں مربوط و مسلسل اشعار نہ سہی کم از کم یہ تو ممکن تھا کہ کم و بیش ایک ہی پایہ کے اشعار ایک غزل میں داخل کیے جاتے۔

۳۔ نوح ناروی

یہ بسمل ہو نہیں سکتا وہ بسمل ہو نہیں سکتا ——— کوئی قاتل بنے بننے سے قاتل ہو نہیں سکتا
جو پہنچیں گے تو ہم پہنچیں گے مر کر کوچۂ جاناں تک ——— کہ جیتے جی کوئی جنت میں داخل ہو نہیں سکتا
یہ کہہ کہہ کر کیا مجبور اسے آنکھیں لڑانے پر ——— نظر ہے جس کی شرمیلی وہ قاتل ہو نہیں سکتا
سرِ مقتل وہ دیں گے کیا ابروئے خمدار کو جنبش ——— کوئی اس بال کے خنجر سے بسمل ہو نہیں سکتا

یہ فقرے ہیں یہ چالیں ہیں یہ باتیں ہیں یہ گھاتیں ہیں
مرے دشمن کو تم سے عشق کامل ہو نہیں سکتا

استعجاب ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں مہذب و تعلیم یافتہ طبقے میں اسے شاعری سمجھا جاتا ہے ؎

سرِ مقتل وہ دیں گے کیا ابروئے خمدار کو جنبش
کوئی اس بال کے خنجر سے بسمل ہو نہیں سکتا

ایسے اشعار سے کسی تربیت یافتہ دماغ کو بے لطفی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لطیف احساسات کو ایک صدمہ پہنچتا ہے۔ طبیعت سراسر منغض ہو جاتی ہے۔ لیکن اردو شاعری کا ایک بڑا حصہ ابھی تک اسی قسم کے اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسرے اشعار میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔ داغ کے رنگ کا اتباع کیا گیا ہے اور بس۔ دوسرے شعر میں "کوچۂ جاناں" کو شاعر نے جنت قرار دیا ہے۔ یہی اس شعر کی جان ہے۔ اگر "کوچۂ جاناں" کو ایک لمحے کے لیے "جنت" نہ تصور کیا جائے تو شعر بے معنی اور مبہم ہو جاتا ہے۔

مطلع اور آخری شعر میں داغ کی روانی اور برجستگی کی نقالی ہے اور تیسرے شعر میں داغ کی شوخی کا اتباع کیا گیا ہے۔ لیکن یہ روانی و برجستگی، یہ شوخی، یہ روزمرہ اور محاورے کی چاشنی داغ میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ پھر اس کی نقالی تحصیلِ حاصل ہے۔ جو اس قسم کی چیزوں کو پسند کرتے ہیں وہ داغ کے کلام میں ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ پھر وہ داغ کے متبعین کے اشعار کی طرف متوجہ ہی کیوں ہوں خصوصاً جب کہ داغ میں اور بھی اوصاف موجود ہیں جو ان میں موجود نہیں۔ داغ کے اشعار کامیاب اشعار ہیں، تازگی اور شگفتگی ملتی ہے جس کے مقابلے میں یہ اشعار پژمردہ و خشک پھول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس شادابی کے علاوہ داغ کے اشعار میں اصلیت بھی ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور ذاتی واقعات کے نقش و نگار کھینچتے ہیں ——— لیکن ان کے متبعین دوسروں کے خیالات و جذبات کی نقالی کرتے ہیں اس لیے اصلیت کہیں نہیں ملتی۔

۴۔ احسن مارہروی

نصیب سیرِ چمن دورِ باغباں میں نہیں — قفس میں رہتے ہیں گویا ہم آشیاں میں نہیں

کھنچی ہوئی چلی آتی ہے کس لیے دنیا — کوئی کشش جو ترے سنگِ آستاں میں نہیں

یہ مانتے ہوں کہ پامال کن ہے وہ بھی مگر — تمہاری چال کے انداز آسماں میں نہیں

بڑا ہے خضر سے بھی عمر میں اور اس کے سوا — کرامت اور کوئی پیرِ آسماں میں نہیں

یہ میرے ضعفِ دلی کی قوی ہے ایک دلیل
کہ طاقت اس کے بیاں کی مری زباں میں نہیں

کیا خشک سامانی ہے۔ تاثیر کا کہیں نام و نشان نہیں، اصلیت معدوم، تخیل کا معیار اس شعر سے ظاہر ہے ؎

بڑا ہے خضر سے بھی عمر میں اور اس کے سوا
کرامت اور کوئی پیرِ آسماں میں نہیں!

خیالات ہی مصنوعی اور پیش پا افتادہ نہیں۔ ان کی ترجمانی میں بھی جدت و کاوش سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اگر کچھ ہے تو بس یہ کہ الفاظ کی نشست میں کوئی جھول نہیں۔ بندشیں پختہ ہیں جس سے مشاقی کا پتہ چلتا ہے لیکن شعریت مفقود ہے۔ اس پرانے بے لطف، بے رنگ طریقۂ شاعری سے عاجز آ کر بعض تعلیم یافتہ طبقوں نے اس سے کنارہ کشی کی ہے۔ نئے رنگ کے متبعین زیادہ [illegible] و سنجیدہ ہیں اور نئے خیالات یا نئی طرزِ ادا کے حامل ہیں۔ غزل کو حسن و عشق کی قید سے آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انواع و اقسام کے تصورات و محسوسات و واقعات کو داخلِ غزل کرتے ہیں اور الفاظ میں علمیت، بلندی، شوکت، متانت کا خیال رکھتے ہیں یعنی وہی اصول اختیار کرتے ہیں جن پر سودا، غالب، مومن کی شاعری کی بنا تھی۔ انھیں خود اعتراف ہے کہ اس قسم کی غزلوں میں بھی زیادہ گنجائش نہیں۔ لیکن پھر بھی غزل سے کنارہ کش نہیں ہوتے۔ جوش اس طبقے کے خیالات کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔

دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے — اسلوبِ سخن نیا نکالا ہم نے

ذرات کو چھوڑ کر حریفوں کے لیے — خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے

تعلّی برطرف یہ شعرا رسم کی قید سے آزاد رہنا چاہتے ہیں اور ہر شاعر ایک انفرادی اسلوب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اسی لیے ان کی غزلوں میں کم از کم ظاہری تکرار بے لطفی نہیں پیدا کرتی۔ ان کے حوصلے بلند ہیں۔ یہ ذرات کو چھوڑ کر خورشید کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں لیکن ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ان کی ناکامیابی کی وجہ بھی عموماً وہی ہے جو پرانے رنگ کی غزلوں میں بے لطفی پیدا کرتی ہے یعنی اصلیت کا نقدان۔ اس طبقے کے شعرا جدت طرازی اور نازک خیالی یا معنی آفرینی میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ صداقت و اصلیت کا خیال بھی نہیں رہتا۔ لفظی حسن تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن تاثیر باقی نہیں رہتی ؎

تیری نمود ارتقا جلوہ گہِ حیات کا   تیرا ورود معجزہ عالمِ ممکنات کا
کھینچ دیں اصل و فرع میں صاف حدودِ امتیاز   ذہن و نظر کو دے دیا علم صفات و ذات کا
تیرگیِ جمود سے زندگیاں ہوئیں طلوع   عقدہ کیا جو تو نے حل فلسفۂ حیات کا
کشمکشِ مآل سے روح کو کر دیا رہا   آخری رہنما ہے تو مرحلۂ نجات کا
رہنے دے محو بے خودی خاطرِ پرخروش کو   رازِ کہن نہ فاش ہو قیدِ تعینات کا

الفاظ بلند آہنگ و رفیع الفاظ کی کثرت ہے۔ "ارتقا" "جلوہ گاہِ حیات" "فلسفۂ حیات" "کشمکشِ مآل" "مرحلۂ نجات" "خاطرِ پرخروش" "قیدِ تعینات" "تیرگیِ جمود" زبان علمی ہے۔ جہلا اور عوام کی زبان سے ممیز بھی ہے۔ لفظی حیثیت سے ان اشعار کو رفعت اور امتیاز بھی حاصل ہے لیکن یہاں شاعری رفعتوں کی حامل نہیں۔ لفظی شوکت معنوی شوکت کے بدست ہے۔ خیالات عامیانہ و پیش پا افتادہ نہیں لیکن پھر بھی یہ اشعار نہیں اس لیے کہ خیالات محسوسات کے سانچے میں نہیں ڈھالے گئے ہیں۔ خیالات کی اہمیت و صداقت، الفاظ اور بندشوں کی رفعت و ندرت میں اگر اصلیت نہ ہو اگر جذبات معدوم ہوں تو شعریت کے لیے کافی نہیں۔ اکثر اس طبقے کے شعرا زور کو جوش کا مترادف سمجھتے ہیں۔ جو خیالات ان کے دماغ میں آتے ہیں انھیں پرکھتے نہیں محض زور و شور لفظی رعب و تمکنت کے ساتھ بیان کرتے ہیں اس لیے غزلیں اکثر مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

جب دل نے مجھ کو شعلہ بداماں بنا دیا   میں نے ہر ایک خار کو بستاں بنا دیا
زلفوں کی ہر گرہ کو عطا کی متاعِ دل   ابرو کی ہر شکن کو رگِ جاں بنا دیا
جلووں کو دیں نظارۂ دو عالم کی وسعتیں   شوخی کو کائنات بداماں بنا دیا
عشووں کی چنچلی کو عطا کی شگفتگی   شبنم کی بوند کو دُرِ غلطاں بنا دیا
کج کر کلاہِ فخر کہ تیرے شباب کو   میں نے خدائے عالمِ امکاں بنا دیا

جب یہ شعرا لفظی شوکت و ندرت کی قید سے آزاد ہو کر غزلیں لکھتے ہیں تو کچھ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ سادہ پیرایہ میں اور مختصر بحروں میں اکثر دلچسپ اشعار موزوں کر لیتے ہیں۔ غالب و مومن کا رنگ اور اثر تو ہاتھ نہیں آتا لیکن یہ اشعار سراسر بے مزا نہیں ہوتے اور کانوں پر گراں نہیں گزرتے ؎

نہیں بنتی دلِ تنہا نشیں سے   کسی کو بھیج دے یا رب کہیں سے
کوئی دیکھے مری وحشت سرائی   انھیں کو مانگتا ہوں میں انھیں سے

کسی نے حال کچھ اس طرح پوچھا دعا نکلی دلِ اندوہ گیں سے
یہ مایوسی کا تیرِ آخری ہے! بچے رہنا نگاہِ واپسیں سے

عنایت ہو جو سوئی دے بخیہ گر تو
مرا دامن کسی کی آستیں سے

"تنہا نشیں"، "وحشت سوالی"، "اندوہ گیں" علمیت و ادبیت کی چاشنی حاوی ہے لیکن یہاں خیالات کی اہمیت الفاظ کی اہمیت سے کم نہیں۔ شاعر محض نئی بندشوں کے اختراع یا علمی الفاظ کی جستجو میں سرگرداں نہیں۔ معانی پر نظر ہے اور انھیں صفائی اور پختگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خیالات جدید نہ سہی ان کی ترجمانی دلکش پیرایہ میں کی گئی ہے ؎

کوئی دیکھے مری وحشت سوالی
انھیں کو مانگتا ہوں میں انھیں سے

وحشت سوالی کا کتنا اچھا ثبوت دوسرے مصرع میں پیش کیا گیا ہے۔ پچھلے شعر میں بھی ایک اچھوتا پن ہے "نگاہِ واپسیں" کو مایوسی کا "تیرِ آخری" قرار دینا پھر بچے رہنا کا ٹکڑا نہایت پُرلطف ہے۔ یہ ہے نیا رنگِ تغزل لیکن اس رنگ میں کامیاب غزلیں کم ملتی ہیں۔

(اُردو شاعری پر ایک نظر)

سید اعجاز حسین ایم۔ اے

دورِ حاضر کی غزلوں کا رجحان بھی قابلِ دید ہے۔ اس دور سے پہلے جو خرابیاں غزل میں آگئی تھیں نہ صرف وہ دور ہوئیں بلکہ بعض لحاظ سے وہ خصوصیات بھی نمایاں ہوئیں جو شاید کسی ایک دور میں اُردو نہیں پیدا کر سکی تھی۔ ایک ایک خصوصیت کو با تفصیل بیان کرنا تو طوالت کا باعث ہوگا۔ مختصراً موجودہ دور کی غزل گوئی میں حسبِ ذیل خصوصیات قابلِ ذکر و توجہ ہیں۔

دورِ حاضر میں غزل نے بھی نئے انداز سے نغمہ سرائی کی۔ تاثیر، ترنم، داخلی پہلو، ہمواری، یک رنگی، جذباتی اور ذہنی کیفیت کے اظہار میں خاص توجہ کی گئی۔ تصنع اور لفظی بھرمار اور بے کار باتوں کے بجائے شعراء نے سادگی، سچائی، روانی، بندش کی چستی اور موسیقیت کو جگہ دی ہے۔ لطیف و پرمعنی کنایات موجودہ اُردو غزل کی امتیازی خصوصیات سے ہیں۔ عام طور پر غزلوں میں فلسفۂ حیات اور حقیقت حسنی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ جو واقعات و امور یا وہ انداز میں مخصوص و محدود نظر آتے تھے ان کو دور بین نگاہوں نے غیر متناہی اور بے پایاں دیکھ کر شعراء کے کلام میں حیرت کا عنصر بہت بڑھا دیا ہے۔

تصوف نے اصلی اور سچی پیرایۂ بیان سے قدم بڑھا کر اکثر مقامات پر زیادہ رنگین اور شاعرانہ شکل اختیار کر لی ہے۔ مسائلِ تصوف کا بیان سیکڑوں نئے عنوانات سے شعرا کرنے لگے ہیں۔ اپنی شخصیت اور انفرادی لب و لہجہ کو قائم رکھنے کی کوشش بھی دورِ حاضر کی ایک مخصوص چیز ہے۔ متعدد غزلیں عشقِ حقیقی اور مجازی دونوں عنوانوں سے الگ ہو کر محض مسئلۂ حیات کے موضوع پر ہیں گی۔

ایک اور بڑی خصوصیت جو موجودہ اردو غزل میں نظر آتی ہے، وہ اس کی حقیقت و واقعہ نگاری ہے۔ مبالغہ سے گریز کر کے ابتذال کے گندے نالے سے بچتے ہوئے ہمارے شعرا نے جذبات و تخیل کی پاکیزہ دنیا کو آباد کرنا سب سے پہلا کام سمجھا۔ عموماً وہ ان ہی خیالات کو نظم کرنا چاہتے ہیں جن میں حقیقت و کیفیت ہو۔ نیز شوخی و بے کیف مبالغہ سے بڑی حد تک دورِ جدید نے محفوظ رکھا۔ فرسودہ اور مبتذل مضامین، تصنع اور محض رسمی باتیں مفقود ہو چلی ہیں۔ جو الفاظ و تراکیب کثرتِ استعمال سے پامال ہو چکی تھیں۔ ان سے گریز اور نئی ترکیبوں اور نئے انداز سے کلام کو سنوارنے کی جدوجہد جاری ہے۔

زبان سے زیادہ خیالات کی بلندی و پرکاری پر زور ہے۔ اس وجہ سے آج کل کبھی کبھی نامانوس ترکیبیں تو ضرور نظر آتی ہیں لیکن خیالات کی بلندی اور مضامین کی نوعیت پہلے سے اب بہت زیادہ قابلِ قدر ہے۔ نفسیاتی تحلیل و سبب' اور اس کے بار لطافت سے غزل کی دنیا آراستہ کی جا رہی ہے۔ حسنِ تعلیل کی مثالیں زیادہ فائدے کی اور قابلِ قبول آنے لگی ہیں۔ اس میدان میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ فلسفۂ حیات و رموزِ ہستی کا بیان زیادہ ہو چلا ہے۔ کبھی کبھی اپنی خامیوں کا بحیثیتِ انسان بیان کر دینا غزل گو شاعر نے بھی عاشق کیلئے مستحسن سمجھا ہے۔ حسرت موہانی کا شعر ہے ؎

نہیں آتی جو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

وارداتِ قلب کے فطری پہلو کو شاعر نے اس لیے ضروری سمجھا کہ معیاری عشق کی تلقین میں حقیقت پس پشت ہو جاتی ہے اور ایسے جذبات کا غلبہ ہوتا ہے جو واقعیت سے الگ ہوتے ہیں۔ عہدِ ماضی میں شعرا مثالیت پسندی سے متاثر ہو کر انسان کی فطری کمزوریوں کا بھی شمار معائب میں کرنے لگے تھے۔ ہر عاشق کو مجنوں و فرہاد کے افسانوی عشق کی کسوٹی پر کسنا چاہتے تھے لیکن عہدِ جدید میں نفسیاتی اور حقیقی رنگ غالب رہتا ہے۔

میر و سودا کے زمانے میں داخلی پہلو غزل کی جان سمجھا جاتا تھا مگر دورِ متوسط میں ایک ایسا بھی زمانہ گذرا ہے کہ جس میں خارجی پہلو کو زیادہ جگہ مل گئی تھی۔ غزل اب ظاہری خد و خال کو اوّل تو سطحی چیز سمجھ کر اپنے یہاں جگہ ہی نہیں دیتی اور اگر دیتی بھی ہے تو محض تعریف کر کے چپ نہیں ہو جاتی بلکہ ان کے دیکھنے سے جو کیفیات دل پر گزرتی ہیں ان کو مزے لے کر بیان کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

ایک دوسری خصوصیت بھی آج کل کی غزل میں خاص طور پر نظر آتی ہے۔ اب سے پہلے بہت کم شعرا کا کلام ایسا ملے گا جو شروع سے آخر تک ہموار ہو۔ آج کل کے ممتاز شعرا اس کا زیادہ خیال رکھنے لگے ہیں۔ ہم تو یہ کہنے کو تیار نہیں کہ موجودہ غزلوں میں ناہمواری بالکل نہیں ہے مگر اس سے کافی تسکین ہو جاتی ہے کہ ایک بڑی حد تک لوگوں کا کلام اس عیب سے پاک ہے۔

یہ سب تو ہوا مگر قدما کے کلام کی سادگی، بھولا پن، معصومیت اور خالص تغزل کے تیر اثر کو نگاہیں موجودہ غزلوں میں ڈھونڈتی ہیں لیکن مایوس ہو کر واپس آتی ہیں۔ تکلف اور خوشگوار آورد کی جھلک بڑھتی جا رہی ہے۔ سہلِ ممتنع کی مثالیں بہت کم ہوتی جا رہی ہیں۔ فارسی اور عربی کی نئی ترکیبوں کی تلاش و استعمال میں لوگوں سے کبھی کبھی لغزش ہو جاتی ہے اور قدم ڈگمگا کر راہِ راست سے الگ پڑ جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں غزل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ حُسن و عشق کے تصادم کو ذرا دور سے دیکھا جا رہا ہے۔ سینما میں یا افسانوں میں یا درس گاہوں میں یا سیر ہے گاہے اور یہ دیکھنا بھی تفریحی پہلو پر مبنی ہوتا ہے۔ بہت کم سپردگی و ربودگی کی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ بجز چند شعرا کے زیادہ تر لوگوں کی غزلوں میں جو عاشقانہ اشعار ہوتے ہیں ان میں بھی انہماک و گم شدگی بہت کم ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کو بہت قریب سے نہیں دیکھا گیا۔ عشق میں مٹ جانے کی صلاحیت بہت کم غزل گو شعرا میں نظر آتی ہے یا تو رسمی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں یا ان کا عشق سرسری مشاہدہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ذاتی تجربات اور ان میں عمق کی کمی درد و شدت کو اشعار میں زیادہ نہیں اُبھرنے دیتی۔

ان باتوں کا جواب اس راز میں مضمر ہے کہ غزل اور عشق کا نظریہ موجودہ دور میں وہ نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا۔ اب غزل میں تنقیدِ حیات اور دیگر مضامین کو کافی جگہ دینے کا خیال رہتا ہے۔ محض حُسن و عشق کی داستان تک محدود کرنا ضروری نہیں سمجھا جاتا اور عشق کو مثالی درجے پر رکھ کر نصب العین قرار دینا بھی ضروری نہیں خیال کیا جاتا ہے۔ محبت کا روحانی پہلو جنسی خواہشات میں تبدیل ہو چلا ہے۔ یہ سطحی نظر ایسا ہے کہ انہماک و سپردگی کو خود کم کر دیتا ہے۔ بقول فراقؔ ؎

بدلتی جا رہی ہیں بزمِ ناز کی روایتیں

نظموں کے دائرے کو وسیع ہوتے دیکھ کر موجودہ غزل گوئی نے بھی بعض بعض خواص جذب کرنے کی کوشش کی جس کا اثر کچھ اچھا نہیں پڑ رہا ہے۔ اشعار میں مضامین لانے کی فکر نے کسی قدر تشنگی پیدا کر دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مضامین کو پوری طرح واضح کرنے میں ایک ایسا تسلسل پیدا ہو گیا کہ یہ غزلیں نہ نظم رہتی ہیں اور نہ غزل ہی کے صحیح مفہوم کو پورا کرتی ہیں۔

بلندیٔ تخیل کی فکر کہیے یا معاشی زندگی کی ابتری سے انتشار کا نتیجہ سمجھئے کہ موجودہ غزلوں میں ایسا مجموعہ بھی ہے جس میں غیر عاشقانہ اشعار کی بھرمار ہے۔ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نظم یا رُباعی یا قطعہ میں سے نکال لیے گئے ہیں اور اپنی ساخت کی وجہ سے چند عاشقانہ اشعار کی آمیزش سے ان کے مجموعہ کو بھی غزل کہا جا رہا ہے۔

موجودہ غزل میں ایسے مضامین کافی آنے لگے ہیں جن میں سائنس کے ان پہلوؤں پر زیادہ توجہ کی گئی ہے جو تخلیقِ عالم یا جنیات کی طرف اشارہ کرتے رہتے ہیں جو ہمارے نیم شعوری احساسات کی لہروں کے حرکات و سکنات کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔ نفسیاتی تحلیل اور اس کے اثرات کا نتیجہ اُردو غزلوں میں کچھ کم جگہ نہیں پا رہا ہے۔ نظموں کی طرح یہاں بھی اجرامِ فلکی اور خوشگوار یا ناخوشگوار مناظرِ قدرت کو بڑی خوبی کے ساتھ حقیقی و جذباتی رنگ دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ جملہ خصوصیات ہمارے نزدیک غزل کی دنیا میں معنوی حیثیت سے ایک خاص اضافہ ہیں جن کا وجود غزل کی تجدید و بقا کا ضامن ہو سکتا ہے۔

(نئے ادبی رجحانات)

آل احمد سرور

ولیؔ کے وقت سے لے کر غالبؔ اور ان کے ہم عصر شعراء تک تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتے ہیں۔ اس عرصہ میں غزل نے تکمیلِ فن کے تمام مراحل طے کیے اور وہ ہماری شاعری کی سب سے اہم اور سب سے مقبول صنف بن گئی۔ کہا جاتا ہے کہ آزادؔ اور حالیؔ

نے سب سے پہلے غزل کے خلاف بغاوت کی بلکہ دراصل آزاد اور حالی غزل سے باغی نہ تھے۔ اس غزل کے خلاف تھے جو رسمی، محدود اور مصنوعی ہو گئی تھی۔ رسمی اس معنی میں کہ استادی شاگردی کی روایت صنعتی معیار سے آگے بڑھ کر شاعر کی رائے کو بھی مقید کرتی تھی محدود اس معنی میں کہ معاملہ، روزمرہ، صنائع و بدائع، تصوف و فلسفہ کی آمیزش وغیرہ وغیرہ غزل کے لیے لازمی چیزیں بن گئی تھیں اور مصنوعی اس حیثیت سے کہ ناسخ اور ان کے دہلوی مقلد شاہ نصیر نے غزل کو بھی دماغی ورزش یا کمالِ فن کا ایک ذریعہ سمجھ لیا تھا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ شروع سے غزل رسمی، مصنوعی اور محدود تھی۔ غزل میں شروع ہی سے بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق بھی ہے اور مشاہدۂ نفس بھی بلکہ متاخرین کے دور میں صنعتی معیار زیادہ اہم ہو گیا تھا اور قدیم روایتی قدریں ذرا دھندلی ہو گئی تھیں اس لیے مشاہدۂ گردوپیش جو غزل میں برابر ملتا ہے، اس زمانے میں اتنا نمایاں نہ رہا تھا۔ اردو کے غزل گو شاعر کے متعلق یہ خیال بہت عام ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بے نیاز، اپنے خیالات کی دنیا الگ بسائے رہتا تھا۔ دراصل اس کے خیالات کی دنیا اتنی الگ تھلگ نہ تھی وہ ان تمام چیزوں سے پوری طرح اثر لیتا تھا جو سیاسی، معاشرتی یا اس زمانے کی ادبی زندگی پر اپنا سایہ ڈالتی تھیں۔ وہ اس دنیا کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ضرور تھا مگر اپنی شاعری میں ان زنجیروں کو اس طرح جھٹکے دیتا تھا کہ قید میں آزادی بھی نصیب ہو جاتی تھی۔ اس کے یہاں انتشار اور پراگندگی ضرور تھی مگر نہ اتنی کہ کوئی خاص مرکزی خیال یا تصور سرے سے ناپید ہو۔ حسن و عشق اس کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے مگر ان کے سوا کچھ اور چیزوں کا بھی وہ قائل تھا۔ "چیزے دیگر" کے لیے وہ غزل سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا تھا اور بادہ و ساغر اور قفس و آشیاں کے پردے میں صرف تصوف اور فلسفہ ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ بیان کر جاتا تھا۔ اردو شاعری میں یہ رمزیت (SYMBOLISM) اس قدر عام تھی کہ اس سے ہر بڑے چھوٹے شاعر نے فائدہ اٹھایا۔ ہماری غلطی تھی کہ ہم نے اپنے شعراء کے یہاں سوائے محاورہ، روزمرہ، معاملہ بندی، شاعرانہ خمریات، پند و نصائح، صنعتِ مراعاۃ النظیر کے اور کچھ تلاش نہ کیا۔ حالی اور آزاد کے بعد وہ غلطی اور بھی زیادہ ہو گئی جو ہمارے شعراء محسوس تو کرتے تھے مگر عشق پردہ نشیں میں بہلانا چاہتے تھے مغرب کے اثر سے شاعر کے نصب العین میں آزادی ہوئی۔ مغربی ادب پر نگاہیں جمنے لگیں، سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے یہاں تک کہ حکومت کی بساط بھی بدل گئی اور اب نظموں میں وہ باتیں صاف صاف بیان ہونے لگیں جن کے لیے غزل میں پردے تلاش کیے جاتے تھے۔ جدید غزل قدیم غزل سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ اس کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ صرف زبان اور فن کے لحاظ سے اس میں قدیم غزل کے مقابلے میں تھوڑی سی بے راہ روی آگئی ہے اور اچھے اچھے شاعر خیال کے پیچھے لفظ کی صحت کو قربان کر دیتے ہیں یا کسی شاعرانہ جواز کے پردے میں پناہ لیتے ہیں مگر شاعر کی زندگی پہلے سے بہت بدل گئی ہے۔ اس میں اجتماعی نقطۂ نظر آ گیا ہے۔ وہ بیک وقت محبوب کی کم نگاہی اور سماج کی زیادتی دونوں کو محسوس کرتا ہے۔ دنیا صرف مغرب ہی میں چھوٹی نہیں ہوئی بلکہ مشرق میں بھی چھوٹی ہو گئی ہے۔ سیاسی حالات نے زیادہ تلخی اور شدت حاصل کر لی ہے۔ برسوں کی غلامی کا بوجھ بعض اوقات اتنا گراں معلوم ہوتا ہے کہ ساقی کی مست نگاہی بھی اسے بھلا نہیں سکتی۔ اس وجہ سے اس دور کی غزل میں ایک بیرونی طور پر جوش و سرگرمی کی اور ایک اندرونی ناکامی و مایوسی کی پائی جاتی ہے۔ غزل اور نظم کے درمیان خلیج بھی کم ہو گئی ہے مگر پھر بھی اشارے اور کنایے غزل میں اور صاف صاف باتیں نظم میں بیان ہونے لگی ہیں۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوا ہے۔

غزل کے میدان میں جو تجربے اس زمانے میں کیے گئے ہیں ان کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تجربے غزل کے لیے بڑے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایک بڑی کوشش تو وہ ہے جو حالی کے وقت سے شروع ہوئی اور آج تک جاری ہے غزل کی

زبان کو آسان، عام فہم اور بول چال سے قریب لانے کے لیے بہت سے اشخاص نے کوشش کی ہے۔ اس سادگی میں اور میر و درد کے زمانے کی سادگی میں باوجود تھوڑی سی قدرِ مشترک کے فرق بھی ہے چنانچہ آزاد، آرزو، اثر، حفیظ، افسر وغیرہ کے یہاں جو رجحان ہے وہ خود رو نہیں، ایک بہت بڑی ادبی تحریک کا نتیجہ ہے اور اس سے شاید ہی کوئی شاعر محفوظ رہ سکا۔ غزل میں مسلسل مضمون نظم کرنے کا خیال نیا نہیں مگر شاید کسی شاعر نے اتنی پابندی اور استقلال سے اسے نبھانے کی کوشش کی ہو جتنی جوش نے کی ہے۔ مسلسل مضمون قدما کے یہاں بہت ملتے ہیں اور میر و غالب کی بہت سی غزلیں اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں مگر جوش کا تتبع عام طور پر نہیں کیا گیا اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلسل غزل، غزل نہیں رہتی، نظم بن جاتی ہے اور جوش کے ہاں رجز خوانی زیادہ ہے جو غزل کے لیے اتنی موزوں نہیں۔ اس کے علاوہ غزل کے مضامین کو وسیع کر کے اس میں ایک طرف حیاتی اور دوسری طرف آفاقی رنگ پیدا کرنا بھی لوگوں نے سیکھا ہے اگرچہ یہ روش ابھی عام نہیں ہوئی۔ غالب کی تقلید نے لکھنؤ والوں کو کفن اور نعش سے نجات دلائی اور عام طور پر فرسودہ روش سے پرہیز سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہمارے شاعر فرسودہ زبان برتنے کے بجائے خود زبان ایجاد کرتے ہیں یعنی جو الفاظ وہ استعمال کرتے ہیں ان میں ان کا جذبہ زیادہ شریک ہوتا ہے وہ اتنے عام نہیں کہ اپنی انفرادیت کھو چکے ہوں۔ اس دور کا تفلسف بھی غالب کی تقلید کا نتیجہ ہے۔ ایک عرصہ تک یہ خشک فلسفہ نظم کرنے اور علمیت بگھارنے کے مترادف رہا مگر اب اس کی وجہ سے غزل میں محض جذبہ کے بجائے فکر کا جزو بھی آ گیا ہے جو قدیم رنگ پر چلنے والے ہیں۔ وہ بھی اپنی غزلوں میں نیا نکھار اور نئی شگفتگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں غزلوں کا سرمایہ کسی طرح دوسرے دوروں سے کم اہم نہیں ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے۔

(نئے اور پرانے چراغ)

احتشام حسین

اردو غزل گوئی نیم وحشی صنفِ سخن ہو یا محض روایت پرستی مگر کبھی کبھی اس تاریکی میں ایسے شعلے بھی لرز اٹھتے ہیں کہ دل کی فضا کچھ دیر کے لیے بے قرار ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے وجدان کی تعمیر میں قدیم روایات کا بہت شاندار حصہ ہے۔ روایتی شاعری میں مقدار اور تعداد کا اضافہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ نئی خصوصیتیں مشکل سے پیدا ہوتی ہیں۔ صرف مضبوط اور جاندار انفرادیت رکھنے والے اس دائرے کو توڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اپنے حدود ہی کے اندر رہ کر اپنے سینے کی آگ اور اپنے دل کا گداز اپنی شاعری میں بھر دیتے ہیں پھر چونکہ ان کے پڑھنے والے اپنے معاشی اور معاشرتی روابط کی وجہ سے خود اس ماحول سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں اس لیے اثر ان کی خصوصیت بن جاتا ہے۔ ہم اور آپ غزل کی شاعری سے متنفر ہوں، عاجز ہوں، اس کے مٹا دینے کے درپے ہوں، ایامِ جاہلیت کی یادگار سمجھ کر اس دورِ تہذیب کو اس سے پاک کر دینا چاہتے ہوں، گنگنانا نہ چاہتے ہوں، سن کر اثر لینے سے دور بھاگتے ہوں مگر ہمارے ارادوں کا قلعہ توڑ کر کوئی میر، کوئی غالب، کوئی آتش، کوئی حسرت، کوئی جگر، کوئی فانی، کوئی فراق ہمارے وجود کے اندر جھانکتا ہے اور وہ نغمہ چھیڑتا ہے جسے ہماری روح قبول کرنے پر تیار ہو جاتی ہے، زندگی کی کوئی گہری حقیقت، غم و درد اور محبت کو کوئی پریشان کرنے والا خیال، ان سے بھاگ کر کوئی کہاں جائے گا! ان کی آواز پیچھا کرتی ہے اور اشعار دہرانے پڑتے

ہیں کیونکہ صرف عقل ہمیں ان سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرے تو کرے ہمارا دل اب بھی انھیں پناہ دیتا ہے اور غالباً دیتا رہے گا۔
پھر غور کیجیے تو غزل صرف دل کی شاعری ہے بھی نہیں اسے عقل سے گہرا تعلق ہے اور یہی امتزاج اچھا غزل گو پیدا کرتا ہے۔ اس نئے نقطۂ نظر سے چاہے تغزل اور (LYRICISM) کا مفہوم مجروح ہوتا ہو یا بدلتا ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ اچھا غزل گو عقل کے مسائل سے بہت زیادہ دور نہیں رہتا۔

(تنقیدی جائزے)

عبادت بریلوی[1]

غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں ارتقائی صلاحیتیں تو موجود ہیں لیکن ان ارتقائی صلاحیتوں کا احساس ذرا مشکل ہوتا ہے دوسری اصناف میں تو یہ کیفیت خود نمایاں ہو جاتی ہے کیونکہ ان کا عام انداز خارجیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ توضیح و تفصیل ان کے مزاج کا جزو ہوتی ہے بات کو براہِ راست کہنا ان کا شعار ہوتا ہے لیکن غزل کا انداز اس سے ذرا مختلف ہے۔ غزل میں زندگی کے ہر خارجی پہلو کا اظہار داخلیت کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ بات اس میں اگرچہ عمومی اور آفاقی انداز میں کی جاتی ہے لیکن توضیح و تفصیل کی بجائے اس میں اشاروں اور کنایوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ان اشاروں اور کنایوں کی تعمیر و تشکیل مختلف عناصر سے ہوتی ہے۔ یہی عناصر غزل کے اہم اجزا ہیں اور انھی کو غزل کی روایات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ غزل اپنی ان روایات کو بہت عزیز رکھتی ہے اور ان کو چھوڑنے کا خیال بھی اسے گراں گزرتا ہے۔ اس کی ارتقائی کیفیت پر انھی روایات کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس کی پردہ دری ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو غزل کے مزاج سے کچھ واقفیت رکھتا ہے۔

زندگی کی ہر تبدیلی اور تبدیلی کے زیرِ اثر ارتقائی کیفیت غزل میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ خارجی طور پر زندگی میں جو تغیر ہوتا رہتا ہے اس کے اثرات غزل میں پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی تبدیلیوں کا عکس اس میں صاف نظر آتا ہے اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ وہ اس بدلتی ہوئی زندگی کی عکاسی کرتے ہوئے خود اپنے آپ کو بھی بدل دیتی ہے۔ یہ تغیر غزل میں خارجی طور پر کم نمایاں ہوتا ہے لیکن ہر دور وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس کی دنیا بدلتی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غزل اپنی ظاہری ہیئت کو بہت کم بدلتی ہے لیکن اس میں پیش کیے ہوئے خیالات و نظریات باوجود اظہار و بیان کی یک رنگی کے اپنے اندر رنگا رنگی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ہر دور میں اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس لیے زندگی کی ارتقائی کیفیت اس میں جگہ جگہ اپنے آپ کو نمایاں کرتی ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو غزل میں اتنے متنوع موضوعات نظر نہ آتے اس میں خیالات کی اتنی رنگا رنگی نہ ہوتی۔ اس میں سموئے ہوئے افکار میں اس درجہ بو قلمونی نہ ہوتی۔ غزل کی بڑائی اسی تنوع اور رنگا رنگی میں ہے۔ اسی کے سہارے اس میں وسعت اور ہمہ گیری کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں۔ غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے لیکن صرف اس عشق کی ترجمانی ہی میں اس کی بڑائی

---

[1] انھوں نے ایک کتاب بھی "غزل اور مطالعۂ غزل" کے نام سے لکھی ہے۔

نہیں ہے۔ اس کی بڑائی تو اس میں ہے کہ اس نے عشق کی متنوع اور مختلف کیفیات کی ترجمانی کی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے عشقیہ تصورات کو اپنے دامن میں سمویا ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں عشق کے جو تصورات رہے ہیں ان سب کی تفصیل غزل میں موجود ہے نہ صرف یہ بلکہ ایک ہی دور کے مختلف تصوراتِ عشق کی زندگی سے بھرپور تصویریں جس طرح غزل میں ملتی ہیں کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتیں۔ پھر زمانے کے ہاتھوں جس طرح ان کیفیات میں تغیر ہوا ہے۔ غزل نے اس کی عکاسی بھی کی ہے اور غزل نے صرف اپنے آپ کو اسی حد تک محدود نہیں کیا ہے۔ وہ اس حصار سے باہر بھی نکلی ہے جب زندگی نے ماورائی اور مابعد الطبیعاتی موضوعات کو اہمیت دی ہے تو اس نے بھی ان کو اپنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غزل میں تصوف کے مسائل کی ترجمانی ایک مستقل رجحان کی صورت میں نظر نہ آتی۔ تصوف اور اس کے مسائل کو غزل نے بڑی خوبی سے اپنایا اور تصوف نے اس کو وسعت اور ہمہ گیری عطا کی، زندگی کے نئے سے نئے مسائل کے لئے غزل کے دروازے کھولے اور پھر ہر بات غزل کا موضوع بننے لگی۔ تصوف کے توسط ہی سے حیات و کائنات کے بے شمار مسائل کی ترجمانی کا رجحان اس میں عام ہوا اور اس طرح اس میں اپنے دامن کو وسیع کرنے کی روایت قائم ہوئی۔ غزل میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کی ترجمانی جو اس کی تاریخ کے مختلف ادوار میں ملتی ہے اس میں اس صورتِ حال کے اثرات بڑے گہرے ہیں۔

ولی اور میر سے لے کر حسرت اور فراق تک اردو غزل اسی ارتقائی کیفیت کی داستان نظر آتی ہے اس میں ہماری تاریخ کا مدوجزر بھی موجود ہے۔ سماجی حالات کی بدلتی ہوئی کیفیت بھی موجود ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے تصورات کی حقیقت بھی موجود ہے لیکن ان سب پر "بادہ و ساغر" اور "دشنہ و خنجر" کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

"ماہِ نو" فروری ۱۹۵۳ء

وقار عظیم

کیا غزل میں اس بات کے امکانات ہیں کہ وہ ہر آن آگے بڑھتے ہوئے زمانہ کا ساتھ دے سکے اور کیا اس کے مزاج میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ اپنے آپ کو بدلتے ہوئے ماحول اور حالات کے سانچے میں ڈھال کر ان سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کر سکے؟

اس سوال کا ایک بالکل غیر منطقی جواب تو یہ ہے کہ اردو غزل کی دو سوا دو سو برس کی زندگی خود ایک ایسی شہادت ہے جس سے غزل کی ارتقائی صلاحیتوں کا یقین راسخ پیدا ہوتا ہے۔ ولی سے لے کر حسرت اور جگر بلکہ حفیظ ہوشیارپوری اور فیض تک زمانہ کے ان گنت اونچ نیچ اور انقلاب کے ساتھ غزل کو جذب و سلوک کی نہ جانے کتنی منزلیں طے کرنی پڑیں لیکن ہر منزل میں غزل نے اپنی انفرادیت اور امتیازی شان برقرار رکھی اور گرد و پیش کی سیاسی، سماجی اور ذہنی فضا کو اپنے اندر سمو کر برابر آگے بڑھتے ہوئے زمانہ کے ساتھ آگے بڑھتی رہی لیکن اس طرح کہ اپنی آن بان میں سرمو فرق پیدا نہیں ہونے دیا۔ زمانہ کچھ سے کچھ بنا لیکن غزل غزل ہی رہی۔

زمانہ کے ان انقلابات کے علاوہ ادبی زندگی میں بھی انقلاب آئے اور کبھی کبھی تو ان انقلابات کا مقصد ہی یہ تھا کہ غزل کے

راج کو ختم کر کے کسی اور کو اس کا تخت و تاج سونپ دیا جائے۔ غزل کو زندگی کی ہر اچھی قدر کا دشمن گردانا گیا اور ملک، وطن، قوم اور انسانیت ہر ایک کی دہائی دے کر غزل کے خلاف سخت سے سخت محاذ قائم کیے گئے۔ یہاں تک کہ غزل کے خلاف نعرہ لگانا ادبی اجتہاد اور انقلاب پسندی کی شان بن گیا لیکن غزل پر ان نعرہ بازیوں نے مطلق اثر نہ کیا۔ وہ ہر ایسے محاذ کو ریت کی دیوار سمجھ کر اس پر اور اس کے دیوانوں پر مسکراتی رہی۔ اس کی اس مسکراہٹ میں استہزا بھی تھا اور خود اعتمادی بھی اور اس کا یہ استہزا اور یہ خود اعتمادی ہمارے اپنے زمانے میں اگر اتنی حق بجانب ثابت ہوئی ہے کہ ادبی زندگی میں شاید ہی کوئی اور بات اتنی سچ ثابت ہوئی ہو۔ ہماری زندگی نے پچھلے پانچ چھ برس میں ایک ایسا انقلاب دیکھا ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن اس پر آشوب دور سے گذر کر بھی غزل نے اپنی انفرادیت کو برقرار اور قائم رکھا ہے —— غزل کی دنیا اب بھی اچھے غزل گویوں سے خالی نہیں ہوئی۔ اب بھی اس کے آسمان پر مسلسل و قفوں کے ساتھ نئے نئے ستارے روشن ہو کر فضا کو منور بنانے کے کام میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ غزل اپنی وضعداری کی روایت کے تسلسل کے باوجود نئے زمانہ کی ضرورتوں اور نئے مذاق اور مزاج کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آ رہی ہے۔ اس میں زندگی کے دوام کی علامتیں زیادہ مستحکم ہو رہی ہیں۔

تاریخ کی یہ شہادت ایک طرف ہے ایسی شہادت جسے میں نے غیر منطقی شہادت کہا تھا لیکن عدم منطقیت کے پیچھے ایک بہت بڑی منطق بھی ہے۔ وہ منطق غزل کی ان خصوصیتوں سے وابستہ ہے جو بہر حال زمان و مکان کی قید و بند سے آزاد رہ کر اس کا جزو لازم ہیں۔ غزل میں فن اور ہیئت کے اعتبار سے بھی اور موضوع کے نقطۂ نظر سے بھی کچھ ایسی باتیں ہیں جو اسے ہر زمانہ کی چیز بناتی ہیں اور جن کی بنا پر اس میں ایسی لچک پیدا ہوتی ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات، ہر طرح کے ماحول اور ہر طرح کی فضا کو اپنے لیے سازگار بنا لیتی ہے اور اس کی اثر انگیزی کسی ایک خاص طرح کا مزاج اور رجحان رکھنے والوں کے لیے مخصوص یا کسی خاص طبقہ یا گروہ تک محدود نہیں ہوتی۔

فن کے اعتبار سے سب سے پہلی چیز غزل میں بیان کا ایجاز ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے غزل کے علاوہ نثر اور نظم کی ہر صنف محروم ہے۔ غزل کے ایک شعر میں زندگی کی بڑی سے بڑی حقیقت اور دقیق سے دقیق نزاکت کو انتہائی حسن لطافت اور اثر کے ساتھ بیان کر دینے کی یہ قدرت اسے مقبولیت کا وہ شرف بخشتی ہے جو کسی اور صنف کو کسی زمانہ میں میسّر نہیں آیا۔

ایجاز کی اس قابلِ رشک صفت کے علاوہ ایمائیت اور رمزیت دوسری خصوصیت ہے جسے غزل کی روایت نے اپنا جزو خاص بنایا ہے۔ غزل اس وقت تک غزل ہی نہیں بنتی جب تک وہ اس رمزیت اور ایمائیت کو اپنا نہ بنا لے۔ اس کا یہ رمزی اور ایمائی حسن اسے تصور آفرینی اور تاثر انگیزی کی دوسری قابلِ رشک خصوصیت بخشتا ہے اور شاعر اپنی بات کہنے کے لیے جو اشارے کنایے، تشبیہیں، استعارے اور محسن بیان کے دوسرے حیلے کام میں لاتا ہے۔ ان میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ ہر دل کو ان میں اپنی دھڑکن سنائی دیتی اور اپنی کسک محسوس ہوتی ہے۔ صوفی، فلسفی، رند، عاشق، مصلح اور سیاست داں سب ایک ہی اشارے میں اپنے اپنے دل کی بات پا لیتے ہیں۔ وہی شاعر جو فطرت کا ہمراز و پرستار بن کر یہ کہتا ہے کہ ؎

اتنا مانوس ہوں فطرت سے کلی جب چٹکی
جھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا
جوش

یا سے

فطرت پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں — جگر

جب عاشق، فلسفی، سیاست دان اور مفکر کا ترجمان بنتا ہے تو گل اور پھول کے اشاروں میں ان کے دل کی بات اس طرح ادا کرتا ہے ؎

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا — میر

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے — اکبر

غزل اپنے اس ایمائی انداز میں جو غزل کی فطرت ہے، زندگی میں بہت سے خارجی اور سارے داخلی پہلوؤں اور کیفیتوں کی ترجمانی اور عکاسی کرتی ہے۔ جذبہ و احساس کی نزاکت، ذہن اور نفس کی ہر خلش اور الجھن، سیاسی معاشرتی زندگی کی ہر وہ کیفیت جو انسان کے دل میں گداز اور تڑپ پیدا کرتی، جگر کو درد آشنا بناتی اور آنکھوں سے اشکِ خونیں کا خراج وصول کرتی ہے، غزل کا موضوع ہے ــــ اس کا ایک ایک شعر زندگی کی ساری وسعتوں کا حامل بھی ہے اور اس بات پر پوری طرح قادر بھی کہ ان ساری وسعتوں کو ہر سننے والے کے دل کی گہرائیوں میں جذب کر دے۔

غزل کی یہی خصوصیتیں ہیں جو اسے ہر دیوانہ اور فرزانہ کے دل کی ترجمانی اور رازداری کا منصب عطا کرتی ہیں۔ ہر درد کو اپنا درد بنانا، غزل کی سرشت اور ہر ایک کا رمز شناس بن کر رموز کا احترام اس کی فطرت ہے۔ صرف غزل کے شعر سن اور پڑھ کر ہی آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں اس کے دل کی بات کہی گئی ہے اور صرف غزل ہی کے شعر پڑھ اور سن کر اسے یہ معلوم اور محسوس ہوتا ہے کہ اس کے زخموں میں ٹھنڈک پڑ رہی ہے اور کوئی نامعلوم قوت اس کے دل اور جگر کے چاکوں کو رفو کر رہی ہے۔

اور یہی سب کچھ ہے جس نے غزل کو یہ "ارتقائی صلاحیت" بخشی ہے کہ وہ زندگی کے ہر دور میں، اس کی ہر رفتار کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتی ہے، نہ پیچھے ہٹتی ہے نہ تھکتی ہے۔ اب تک اس نے ہمیں جو کچھ دکھایا ہے۔ اس کی بنا پر یہ حکم لگانا کچھ عجیب نہیں کہ اس کی یہی سرشت اسے ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

(ماہ نو)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

غزل میں دو عناصر ایسے ہیں جنھوں نے اب تک غزل کا ساتھ دیا ہے اور جو بڑی حد تک غزل کو بحیثیت ایک صنفِ شاعری زندہ رکھنے کے ذمہ دار ہیں۔ ایک شدید قسم کی داخلیت اور دوسرے اس داخلیت سے براہِ راست متعلق ایک خاص قسم کی اشاریت جسے اب غزل کی رمزیت کا نام دیا جاتا ہے۔ حالی کے عہد سے اردو غزل کے خلاف تنقید کا ایک طوفان اٹھا اور اگرچہ حالی کا مقصد صرف غزل کی اصلاح تھی لیکن شاعر اور نقاد یہ سمجھے کہ حالی نے دلِ زندہ کی کہانی جس دن ختم کی سب کے دلوں کی دھڑکنیں اسی دن بند ہو گئیں، عشق اور محبت کے سوتے سوکھ گئے، حسن اور جوانی ابدی نیند سے ہم کنار ہو گئے اور اس طرح غزل کا دور ختم ہو گیا۔ شاعر کا کام بیواؤں کی شادی کرانا، یتیم خانوں کے لیے چندہ جمع کرنا، کسی کانفرنس کے آغاز یا انجام پر اناؤنسر کا فرض ادا کرنا رہ گیا ہے۔ یہ سب نہایت مبارک افعال ہیں لیکن ان پر شاعری کی تہمت کیوں رکھیے؟ بہرحال حالی سے اقبال تک غزل پر ایک آزمائش کا دور گزر گیا لیکن اس میں بھی غزل کا شعلہ بالکل بجھا نظر نہیں آتا، لکھنؤ میں آخر آخر تک عزیز، آرزو اور صفی سے لے کر باقی برِعظیم میں حسرت، اصغر، فانی اور جگر نے غزل کو اپنے خون سے سینچا اور سنوارا۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا داخلیت اور رمزیت کو میں جانِ تغزل سمجھتا ہوں اور غزل کی تاریخ بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ اردو غزل کے عہدِ زریں یعنی میر و مرزا کے دور کا جائزہ لیجیے۔ اس عہد کے خاص سیاسی، ذہنی اور معاشرتی حالات پیشِ نظر رکھیے۔ معاشرہ میں ایک بے چینی، ایک کرب، ایک اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے۔ سیاسی انقلاب، درباری سازشوں اور معاشی بدحالی نے ایک بحران پیدا کر دیا تھا۔ اس میں بے اطمینانی سب سے نمایاں عنصر ہے۔ امرا کے دربار آئے دن بنتے بگڑتے رہتے تھے۔ دلی کے تخت پر نام نہاد بادشاہ کٹھ پتلیوں کی طرح چڑھتے، اترتے، تجار اور پیشہ ور مفلسی اور ناداری کا شکار تھے تو پھر شاعروں کو کون پوچھتا، ان کی قدردانی رئیسوں کی مجلسوں اور مشاعروں کی محفلوں تک محدود تھی۔ یہ نظام درہم برہم ہوا تو یہ بھی بے سروسامان ہو گئے۔ قدرتی طور پر یہ ایک شدید قسم کے داخلی ردِ عمل کا شکار ہو رہے ہوں گے اور یہ شدت غزل کے ان بے شمار مضامین سے ناپی جا سکتی ہے جو میر کی کلیات میں موجود ہیں۔ تباہی و بربادی، غارت گری، قیامت، ہنگامۂ قیامت، خون، آگ، برق و باراں، طوفان، موج، گرداب کے سارے مضامین اسی داخلی کرب و بے چینی کی تفصیل بیان کرتے ہیں جو شاعروں کی رگ و پے میں سما رہی تھی۔

اور اس کے بعد غزل کا ایک اور دور ہمارے سامنے آتا ہے۔ ناسخ اور آتش کے زمانے کی لکھنوی غزل جو اپنے انداز اور آہنگ میں میر کی غزلوں سے بالکل مختلف ہے۔ ان غزلوں کو بعض ناقدین نے قصیدۂ طور کہا ہے۔ بعض کو شبہ ہے کہ انھیں غزل کہنا بھی چاہیے یا نہیں کیونکہ ان میں محبوب کی وصف نگاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا۔ بہرحال ناسخ، آتش اور ان کے بے شمار شاگردوں نے اصلاحِ زبان کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان کا پورا احترام کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں کہ شاعری اگر شدتِ جذبات کے اظہار کا وسیلہ ہے تو ان حضرات کی شاعری کسی قسم کے جذبے سے یکسر محروم ہے۔ اگر اس زوال کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو ذہن فوراً اس پُر تکلف معاشرہ کی طرف منتقل ہوتا ہے جو لکھنویت کا دوسرا نام ہے اور جو غزل کے علاوہ بھی رفتار، گفتار، دستار اور کردار میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ یہاں تکلف، احتیاط، رکھ رکھاؤ بلکہ تصنع جذبات کی شدت پر قابو پا لیتے ہیں اور جذبات اس شدت سے بھی

تو انہی راستوں اور وسیلوں کو تلاش کرتے ہیں جو اس خاص معاشرے نے ان کے لیے مقرر یا مستحسن قرار دیے ہیں۔ پھر یہ دور بھی ختم ہوتا ہے۔ مومن و غالب، امیر و داغ کی غزلیں دیکھیے۔ غزل اپنے اصلی رجحان کی طرف رجعت کرتی ہے۔ میر کی استادی کا اعتراف کیا جاتا ہے، دہلوی شاعروں کا تو ذکر ہی کیا۔ میر کی روایت دلی کی روایت تھی۔ لکھنؤ میں عزیز اور ثاقب میر کی عظمت کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ غزل پھر اپنے اصلی رنگ پر آ گئی۔ حسرت، اصغر، فانی اور جگر اس نشاۃ ثانیہ میں غزل کے استاد اور امام ہوئے لیکن اس نشاۃ الثانیہ کا شباب ۱۹۴۷ء سے پہلے نظر نہیں آتا۔ اس سال جو سیاسی انقلاب ہوا اس نے معاشرہ کو بھی ایک نیا دستور اور ایک نیا انداز فکر بخشا، پاکستان و ہندوستان کو بڑی امیدوں اور بڑی جد و جہد سے آزادی نصیب ہوئی — وہ آزادی جس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، بہت سی آرزوئیں تھیں جن کی شادابی اس آزادی پر منحصر تھی لیکن بہت سی توقعات پوری نہیں ہوئیں، بہت سی امیدیں ہنوز تشنۂ تکمیل ہیں۔ پھر فرقہ وارانہ فسادات اور بڑے پیمانے پر آبادی کا نقل مکان ایسے سانحات ہیں جن سے شدید جذباتی ردِ عمل پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ عورتوں کی عصمت دری، بچوں کا ہولناک قتل، بوڑھوں کی بے کسی اور بے بسی کی موت، بھرے گھروں کا اجڑنا اور لہلہاتے کھیتوں کا چھوٹنا ایسے سانحات ہیں جو آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے اور ابھی اس طوفان کو گذرے اتنی مدت گذری ہے کہ سطح آب پر اس کے نقوش نظر آتے ہیں۔ وہ شدت اور ہیجان جو جذبات میں پیدا ہوا ہنوز باقی ہے اور اسی نے غزل کو ایک نئی توانائی بخشی ہے۔

غزل کا دوسرا پہلو اس کی رمزیت ہے۔ اس کا ایک سبب جملہ فنون لطیفہ کی لطافت پسندی یا استعارہ پسندی ہے۔ ہلکے ہلکے نقوش، دور سے آنے والی مدہم اور مبہم صدائیں ہمیشہ زیادہ کشش رکھتی ہیں۔ شاعری میں یہ پردہ جانِ لطافت ہے اور جذبات جب انتہائی شدید اور ذاتی قسم کے ہوں تو اس پردہ داری کی اور بھی ضرورت پیش آتی ہے ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں سوائے میاں بیوی کے ایک مرد اور ایک عورت کا عشق سماج کی نظر میں نہایت قبیح فعل ہو لیکن جہاں دھڑکنے والے دل اور سحر کار حسن موجود ہو عشق و عاشقی کا اظہار پردے ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس پردہ داری کی مجبوری اتنی بڑھی ہے کہ بعض عاشقوں نے جو عورتوں سے عشق کرتے تھے بجز امردوں کو اپنا محبوب بنایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض غزل گو شعراء نے امرد پرستی بھی کی ہو لیکن اس کا بنیادی سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ جنسی تشکین کے صحت مند ذرائع مسدود ہونے کے باعث جنسی جذبے نے یہ بے راہ روی اختیار کی ہو۔

اس مسئلے سے ہٹ کر غزل کی اشاریت اور رمزیت دیکھیے۔ میر کا زمانہ سیاسی، سماجی اور ذہنی انتشار کا تھا لیکن دار و گیر کا بھی تھا۔ شخصی آزادی کا تصور یا تحریر و تقریر کی آزادی کے حقوق کے نعرے اس وقت تک بلند نہیں ہوئے تھے، پاسبان کا ڈر اور محتسب کا کھٹکا ہر وقت لگا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی غزل میں جگہ جگہ کچھ گھٹن سی محسوس ہوتی ہے اور بار بار قید، قفس، صید، صیاد، دام، زنجیر، حلقۂ زنجیر، زندان یوسف اور اسی قسم کے مضامین آتے ہیں۔

اسی زمانے میں دلی پامال ہوئی اور نادری غارت گری نے دلی کا رہا سہا سہاگ لٹا دیا، اس چمن کی ویرانی پر ہزاروں عنادل نے نوحہ کیا ہے۔ اس نوحے میں چمن، خزاں، صرصر اور اسی قسم کے بہت سے اشارے پائے جاتے ہیں۔ پھر دہلی کی تباہی کے بعد ارباب علم و فضل لکھنؤ اور دوسرے مقامات کا رخ کرتے ہیں۔ وطن چھوٹتا ہے نیا وطن قفس معلوم ہوتا ہے۔ بھانت بھانت کے پکھیرو گرد و پیش جمع ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں۔ سننے والا سنتا ہے اور اس کا دم گھٹتا ہے لیکن مجبور ہے کچھ نہیں کر سکتا اور

کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہاں بھی یہ رمزیت ہی اس کا سہارا بنتی ہے۔

اور آج ہم پھر اسی قسم کے حالات اور واقعات سے گزر رہے ہیں۔ سیاسی انقلاب کے بعد حالات اور واقعات ابھی معمول پر نہیں آئے۔ فضا میں ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا۔ یقین اور گمان میں کشمکش ہے، پرانی قدروں اور نئے تقاضوں میں تصادم ہے۔ نئے نئے عناصر کی ترکیب سے ایک نیا تصور تشکیل پا رہا ہے۔ بعض لوگ بہت مایوس ہیں اور بعض ابھی تک بہتری کی امید میں زندہ ہیں۔ اس تمام صورتِ حالات نے جو جذباتی ردِّ عمل کیا ہے وہ پھر غزل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ آج جب میں ایسی غزلیں پڑھتا ہوں جو تیرے سامنے ہو کر لکھی گئی ہیں تو میں پہلے سے زیادہ غزل کی ہمہ گیری، اس کی وسعت اور ابدیت محسوس کرتا ہوں۔

"ماہِ نو" جنوری ۱۹۵۲ء

سیّد باقر حسین

پرانی اور فرسودہ غزل کا دور مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ اب گھسی پٹی معاملہ بندی اور سستی جذباتیت کو کوئی نہیں پوچھتا۔ ایسی غزل میں کسی ارتقاء کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

فرسودہ غزل گوئی کے بعد نظموں کا دور آیا۔ ہزاروں نظمیں کہی گئیں اور خوب خوب کہی گئیں۔ نظموں کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے کسے خیال آ سکتا تھا کہ غزل دوبارہ زندہ ہو گی لیکن ہم آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ غزل ایک حسن و رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہو رہی ہے۔

بات در اصل یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی طرح شعر و ادب میں بھی عمل اور ردِّ عمل کا اصول کارفرما ہے۔ لوگ جب ایک چیز سے سیر ہو جاتے ہیں تو دوسری چیز کے متلاشی ہوتے ہیں۔ نظموں کا دور پرانی غزل گوئی کے خلاف ردِّ عمل تھا اور اب جدید غزل نظموں کے سیلاب کے خلاف ردِّ عمل ہے۔ بہت لوگ ہیں جو غزل اور نظم کی خوبیوں کو پرکھنے کے بعد کوئی متوازن رائے قائم کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غزل اور نظم محض صوری حیثیت سے مختلف نہیں ہیں بلکہ ان کے موضوع، ان کے کیف و کم اور ان کی اثر آفرینی میں اختلاف موجود ہے۔ اپنے اپنے مقام پر دونوں ضروری ہیں۔ بعض خیالات کے اظہار کے لیے نظم کا سانچہ ٹھیک ہے اور بعض کے لیے غزل کا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دونوں کی جدا جدا نوعیتوں کو ملحوظ رکھیں۔ اگر ہمارا یہ رویہ ہو تو ہم نہ غزل سے سیر ہوں گے اور نہ نظم سے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ غزل کی مقبولیت کا جدید دور کہاں تک باقی رہنے والا ہے اور کیا اس صنفِ کلام میں مزید ترقی کی گنجائش ہے یا نہیں؟ میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم غزل کی خصوصیتوں کا بغور جائزہ لیں تو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ غزل کہاں تک بقا اور ارتقا کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میرے نزدیک غزل کی خصوصیتیں چار ہیں:۔

۱۔ تغزل

۲۔ صوت و آہنگ

۳۔ ایمائیت اور رمزیت

۴۔ اختصار اور جامعیت

تغزل کی صحیح تعریف تو میں جانتا نہیں البتہ میرے نزدیک غزل کی مخصوص زبان اور لب و لہجہ کو تغزل کہتے ہیں الفاظ اور ترکیبوں کا صحیح، خوبصورت، سبک اور مانوس ہونا تغزل میں شامل ہے۔ غزل کی یہ خصوصیت جذباتی شاعری کی جان ہے اور غزل تو ہے ہی جذباتی شاعری۔ یہ نہیں کہ غزل میں ذہنی آسودگی کا سامان نہیں ہوتا یا نہیں ہو سکتا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ غزل کا مضمون خواہ کچھ ہو اس کی اپیل دماغ کی بجائے دل سے ہوتی ہے۔ عام انسانی نفس میں جذبات کا تناسب ذہن کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اس لیے جب تک انسان اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کسی ذریعہ کا محتاج رہے گا اس وقت تک اسے تغزل کی ضرورت رہے گی۔ دوسرے لفظوں میں جہاں جذبات ہوں گے وہاں تغزل بھی ہو گا۔ خواہ وہ ہماری غزل کی صورت میں ہو یا انگریزی کی سانیٹ کی شکل میں، اس لحاظ سے تغزل غزل کے ارتقا کا ضامن ہے۔

غزل کے صوت و آہنگ کا دارومدار اس کے وزن، بحر، قافیہ، ردیف اور مترنم الفاظ کے استعمال پر ہوتا ہے۔ یہ چیزیں کم و بیش ہر صنفِ سخن میں ہوتی ہیں۔ لیکن غزل اور دیگر اصنافِ سخن کے صوت و آہنگ میں فرق یہ ہے کہ غزل میں مترنم الفاظ کے استعمال کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے، برخلاف بیانیہ نظموں کے کہ جن میں رزم و بزم کی مختلف صورتیں زیادہ متنوع الفاظ کے استعمال کی متقاضی ہوتی ہیں۔ غزل کی اس خصوصیت سے بھی اس کی ارتقائی صلاحیتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ صوت و آہنگ کے مناسب استعمال سے جذبات کے تاروں کا خفیف سے خفیف ارتعاش بھی غزل کے اشعار میں "ریکارڈ" کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے جذبات کا تنوع اور ان کا کیف و کم ایسے ساز کا محتاج ہے جس کے پردوں میں ہر نغمے کی تخلیق ہو سکے۔ ایسا ساز غزل کے سوا کسی اور صنفِ کلام میں نہیں مل سکتا، جب تک جذبات کی نزاکت کا احترام ہے اس وقت تک غزل کی ضرورت بھی باقی رہے گی۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ جذبات کی سادگی کم ہوتی جا رہی ہے اور ان میں پیچیدگی اور گہرائی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ غزل کے صوت و آہنگ کی خصوصیت ان تغیرات کا ساتھ بخوبی دے سکتی ہے لہٰذا اس کے ارتقا کی ایک صورت یوں بھی نظر آتی ہے۔

غزل کی سب سے اہم خصوصیت اس کی ایمائیت اور رمزیت ہے۔ یہ خصوصیت چند مخصوص علامات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ علامات وہی ہیں جو سطح بیں لوگوں کے نزدیک غزل کی فرسودگی کا باعث ہیں یعنی گل و بلبل، قفس و آشیانہ وغیرہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان علامتوں کے لفظی معنی سے لینا انتہا درجے کی بدمذاقی ہے۔ جدید غزل میں ان علامتوں کو نئے نئے معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ علامت کو اگر محض علامت سمجھا جائے تو غزل کے وہ اشعار جن میں ایمائیت اور رمزیت ہے بے اندازہ پرمعنی ہو جائیں۔ ایسے اشعار کو حسن کی مناسبت سے بے شمار نئے معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہر بامحل استعمال پر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا یہ شعر خاص اسی موقع کے لیے کہا گیا تھا۔ غزل کے اشعار کی یہ خصوصیت انھیں موجودہ سیاسی اور سماجی مسائل کی ترجمانی کے لیے نہایت موزوں اور کارآمد بنا دیتی ہے۔ ذیل کے شعر میں ہے نوبہار اور ہوائے بہار کا ذکر کیجیے، دیکھیے کہ علامات کے استعمال نے اسے سیاسی شعور کا کس قدر کامیاب نمونہ بنا دیا ہے ـــ

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے
ہوائے لالہ و گل سے چراغِ دیدہ و دل

غزل کے ارتقا کے لیے اس کی محض یہ خصوصیت کافی ہے۔ غزل کی چوتھی خصوصیت اس کے اشعار کا اختصار اور

جامعیت ہے۔ غزل کے اشعار میں تفصیل و تشریح کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کہانی کا نتیجہ ہوتا ہے کہانی نہیں ہوتی۔ تجربے کا نچوڑ ہوتا ہے خود تجربہ نہیں ہوتا۔ تاریخ کا ماحصل ہوتا ہے تاریخ نہیں ہوتی۔ آہ ہوتی ہے داستانِ غم نہیں ہوتی۔ غزل کے شعر میں قوموں کے عروج و زوال کی داستان صرف ایک مصرعے میں بتائی جاتی ہے ع شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

انگریزی میں اگرچہ غزل نہیں ہوتی لیکن بعض اشعار میں تغزل ضرور ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE WHICH TELL OF SADDEST THOUGHT

یعنی ~
ہمارے وہی نغمے ہیں سب سے شیریں ہے جن میں بیاں سوزشِ اہلِ دل کا

غزل کی یہ خصوصیت بھی اس امر کی شاہد ہے کہ اس میں ارتقا کی بے شمار صلاحیتیں موجود ہیں۔

انسانی تجربوں اور تصورات کے بیان میں آفاقیت، تجرید اور ضرب المثلی کیفیت پیدا کرنا صرف غزل کی ٹکنیک میں ممکن ہے میرے خیال میں ایسے ٹکنیک کی ضرورت ہمیشہ رہے گی بلکہ موجودہ زمانے کی عدیم الفرصتی اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ ٹکنیک دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں بھی اختیار کر لی جائے۔ اگر ہماری غزلوں کے کامیاب تجربے غیر زبانوں میں ہونے لگیں تو عجب نہیں کہ دوسری زبانوں میں بھی غزل گوئی ہونے لگے۔

(ماہِ نو فروری ۱۹۵۳ء)

فیض احمد فیض

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

یوں تو اس شعر میں کئی لفظی رعایتیں موجود ہیں جنھیں روایتی غزل سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن شعر کی خوبی کا انحصار ان لفظی رعایتوں پر بہت کم ہے۔ اس کا انحصار اس دھندلی سی جذباتی فضا پر ہے جو الفاظ کے اصوات و معانی مل کر پیدا کرتے ہیں۔ اسی فضا میں تصورات کے کئی ٹکڑے پھڑپھڑاتے ہوئے ادھر سے اُدھر نکل جاتے ہیں اور ہاتھ نہیں آتے۔ کئی خاکے کئی نقشے کئی رنگ دھیرے دھیرے نظر کے سامنے ابھرتے ہیں اور مکمل ہونے سے پہلے محو ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف الفاظ کی گٹھیلی ترشی اور تیکھا پن اور دوسری طرف معانی کی وسیع اشاریت۔ یوں تو یہ امتزاج ہر اچھے کلام میں لازمی ہے لیکن غزل کا اختصار اور جامعیت اس کی خاص طور سے متقاضی ہے۔ ہر چند سعدی سے حسرت موہانی تک ہر بڑے غزل گو کا اپنا اپنا رنگ، اپنے اپنے مضامین اپنا اپنا طریقِ اظہار ہے لیکن اس بوقلمونی کے باوجود جزوِ اعظم یہ عمومی غنائیت ان سب کے کلام کا خاصہ ہے اور اسی غنائیت کو ہم نے غزل کے مزاج سے مخصوص کر لیا ہے۔

(سرِ آغاز "خمِ کاکل")

سردار جعفری

"بعض ترقی پسندوں نے غزل کے غیر جمہوری، تاریک اندیشی، فراری، گھٹے گھٹے اور صوفیانہ مضامین کی مخالفت کے بجائے غزل کی صنف ہی کو غیر جمہوری اور بے کار قرار دے دیا۔ اس رجحان کی امامت شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے کی جو

خود حالی کی طرح بڑی اچھی غزلیں لکھ چکے تھے اور غزل کی بہترین روایات کو اپنی شاعری میں سمو چکے تھے۔ حضرت جگر مراد آبادی نے جب
۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء میں اپنی ایک غزل میں ترقی پسندوں کے خلوص اور نیت پر حملہ کیا اور انھیں قوم و وطن کا بت پرست قرار دیا اور
اس کے بعد مرزا یگانہ چنگیزی نے غزل کے سوا کسی اور صنفِ سخن کو شاعری ماننے ہی سے انکار کر دیا اور ترقی پسند ادیبوں اور ادب
کے لیے انتہائی غیر ادبی زبان استعمال کی تو غزل کی مخالفت کے رجحان نے اور زور پکڑ لیا لیکن اس سلسلے میں ترقی پسندوں نے مجموعی
طور سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسی طرح غزل کی مخالفت بھی ترقی پسند تحریک کا پروگرام نہیں تھی۔ غزل موضوعِ بحث رہی اور نیا
ادب اور دوسرے ترقی پسند رسائل کے صفحات پر غزل کی مخالفت اور موافقت میں مضامین شائع ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل
پر بحث بھی ہو رہی تھی اور ترقی پسند غزل کہی بھی جا رہی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ اس زمانے میں بہترین غزلیں صرف جگر اور حسرت نے
نہیں بلکہ ترقی پسند شاعروں نے بھی کہی ہیں جن میں فراق گورکھپوری، مجاز، فیض، جذبی، مجروح بہت سے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی
یاد رکھنے کی بات ہے کہ غزل کی مخالفت سب سے پہلے حالی نے شروع کی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ حالی کا نظریہ کہاں تک صحیح یا غلط
تھا، ترقی پسند ادب کے معترضین حالی کے لیے تاویلیں تلاش کر لیتے ہیں اور ترقی پسند ادیبوں پر مہمل الزامات لگاتے ہیں......
ترقی پسند تحریک نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزل پر بھی اثر ڈالا ہے۔ اب انفرادی جذبات اور مجرد تصورات کی جگہ اجتماعی جذبات اور
سماجی احساسات آ رہے ہیں۔ سیاسی مسائل بھی غزل کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں۔ ایک طرف تو روایتی تشبیہوں اور استعاروں
کا نیا اور شگفتہ استعمال ہے اور دوسری طرف نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں کی آمیزش ہے جو روزمرہ زندگی سے حاصل کی گئی۔ اس کوشش
میں فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، جاں نثار اختر، جذبی، حفیظ ہوشیارپوری اور مجروح سلطانپوری ہی نہیں، جگر مراد آبادی بھی شریک ہیں۔"

(ترقی پسند ادب)

(۲)

شمس الدین ولی

"از کمال شہرت احتیاجِ تعریف ندارد۔" (نکات الشعرا)

"عجب فکرِ رسائے داشت و دیوانِ عجیب رنگینے طرح نمودہ۔" (گلشنِ گفتار)

"کمانِ معجز زورِ سخن را بہ نیروے فکرت کشیدہ و ناوکِ اندیشہ اش بہ ہدفِ معنی رسیدہ۔" (تذکرۂ گردیزی)

"تعریفش از احاطۂ تحریر و تقریر بیرون است بنائے ریختہ را چناں مستحکم نمود کہ الحال از بلندی طاقِ سپہر افزودہ۔" (تذکرۂ شعرائے اردو)

"در ریختہ قصیدہ بفصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادانِ آں وقت نزد او ہوشِ شعر ریختہ موزوں می نمودند۔" (مخزنِ نکات)

"شاعرِ والا اقتدار و سخن سنجِ شیریں گفتار است۔ رتبۂ سخن ریختہ در زمانش باوجِ کمال رسیدہ۔" (چمنستانِ شعرا)

"در شعرائے دکھن مشہور و ممتاز است لقدل گے است کہ دیوانش در دکھن شہرۂ ہندوستان گشتہ۔" (گلزارِ ابراہیم)

"قطع نظر از زبانِ دکنی شعرش بمرتبۂ اعلیٰ شاعری و مخفش بدرجۂ علیائے سخنوری است۔" (مجموعۂ نغز)

"ان کی انشاپردازی اور شاعری کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ گیا ہے کہ آج تک زمانہ نے کئی پلٹے کھائے ہیں مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔" (آبِ حیات)

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ولی اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے اور اس کے کلام کو قبولِ عام حاصل ہو جانا اس کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔" (گلِ رعنا)

میر سراج الدین سراج دکنی

"......سخنش او خالی از مزا نیست۔" (نکات الشعرا)

"......طبع روشنش شمع بزمِ سخن۔" (تذکرۂ گردیزی)

"......روشن طبع معلوم می شود۔" (تذکرۂ شعرائے اردو)

"......آنچہ از سلیقۂ شعرش معلوم می شود بسیار پُر گو حرف می زند۔" (مخزنِ نکات)

"......اما از سخنش بوئے عشق و محبت استشمام می نماید۔" (مجموعۂ نغز)

"بالجملہ غزلے کہ شعرے از آں ایراد کردہ شد آوازۂ شہرت تمام دارد۔" (گلشنِ بے خار)

"ولی کے بعد دکن میں اس پائے کا کوئی شاعر نہیں ہوا۔"

(گلِ رعنا)

میاں نجم الدین شاہ مبارک آبرو

"...... شاعرِ نادرہ گوے ریختہ می گویند کہ طبعِ شوخ داشت غرض مستغنی و وقتِ خود بود......" (نکات الشعرا)

"...... اشعارش در تمام ممالکِ محروسہ مشہور و معروف خصوصاً در دار الخلافہ شاہجہان آباد مستثنائے وقت است۔"

(گلشنِ گفتار)

"...... خفا کہ معنی تلاشی را بر طاقِ بلند گذاشتند و بہ استفتاحِ مملکتِ سخن رایتِ شاہی افراختہ......"

(تذکرۂ گردیزی)

"شاعرِ خوش گو در وقتِ خود بود۔"

(تذکرہ شعرائے اردو)

"......... بالجملہ شعر ریختہ بوضعِ خود بسیار مربوط می گفت......" (مخزنِ نکات)

"...... ترکیب میں بیشتر اشعار الفاظ سے ایہام کے سکے ہیں یعنی اکثر وہ الفاظ شعر میں لاتے ہیں کہ جن کے دو معنی ہیں اگرچہ با معنی یا لایعنی......" (گلشنِ ہند)

"...... شعر را بطوریکہ در آں زمانہ رواج داشت بسیار بخوبی گفتہ......" (تذکرۂ ہندی)

"...... در طرزِ گفتار حسبِ رواجِ آں وقت بیشتر بہ ایہام گوئی صرفِ ہمت می نمود......" (مجموعۂ نغز)

"...... از زبان آورانِ نامی طبقۂ پیشین است بصنعتِ ایہام مائل بود......" (گلشنِ بے خار)

"...... بیشتر صنعتِ ایہام میں شعر کہتے تھے۔"

(سخن شعرا)

"یہ اپنے زمانہ میں مسلم الثبوت شاعر زبانِ ریختہ کے اور صاحبِ ایجاد نظمِ اردو کے شمار ہوتے تھے۔"

(آبِ حیات)

"طبیعت رسا اور فکر معنی یاب تھی۔ اس زمانے کے دستور کے موافق تشبیہ اور ایہام میں کلام الجھا ہوا ہے مگر محاورہ کی چاشنی نے اس کو بامزا کر دیا ہے۔" (گلِ رعنا)

ظہور الدین شاہ حاتم

"...... مرد بیست جاہل و شخص منقطع وضع دیر آشنا خوانندار و دریافتہ نمی شود کہ ایں رنگ سخن بسبب شاعری است کہ ہمچو من دیگرے نیست یا وضع او ہمیں است۔ خوب است مارا بانہا چہ کار۔ شعر بسیار دارد...... با من ہم آشنائے بیگانہ است۔" (نکات الشعرا)

"...... مرد صاحبِ ہمت و طبیعت عالی دارد و بخل در دادن شعر ہرگز نہ کردہ و در ایں امر کہ فی الحقیقت سخن درست بشاہد درست گوئی از حاتم بردہ صرفہ ندارد......"

(گلشنِ گفتار)

"...... طبع ہمیر فیضش لفظ و قلب سخن را نقاد۔"

(تذکرۂ گردیزی)

"...... کلیاتش ضخیم است و ابیات دیوانش قریب چہار ہزار بیت از نظر گذشتہ شعر خوب جستہ جستہ می برآید۔"

(مخزنِ نکات)

"...... صاحبِ کمال و پسندیدہ افعال عالی خطرت و بلند ہمت معاصر میاں آبرو۔ دو دیوان ترتیب دادہ یکے بزبانِ قدیم بطورِ ایہام و دوم بہ زبانِ حال اما تیہ شہرۂ اشعارش بسیار است۔ اکثر غزل ہائے او سا نغمہ سرایانِ ہندی می خوانند۔"

(تذکرہ شعرائے اردو)